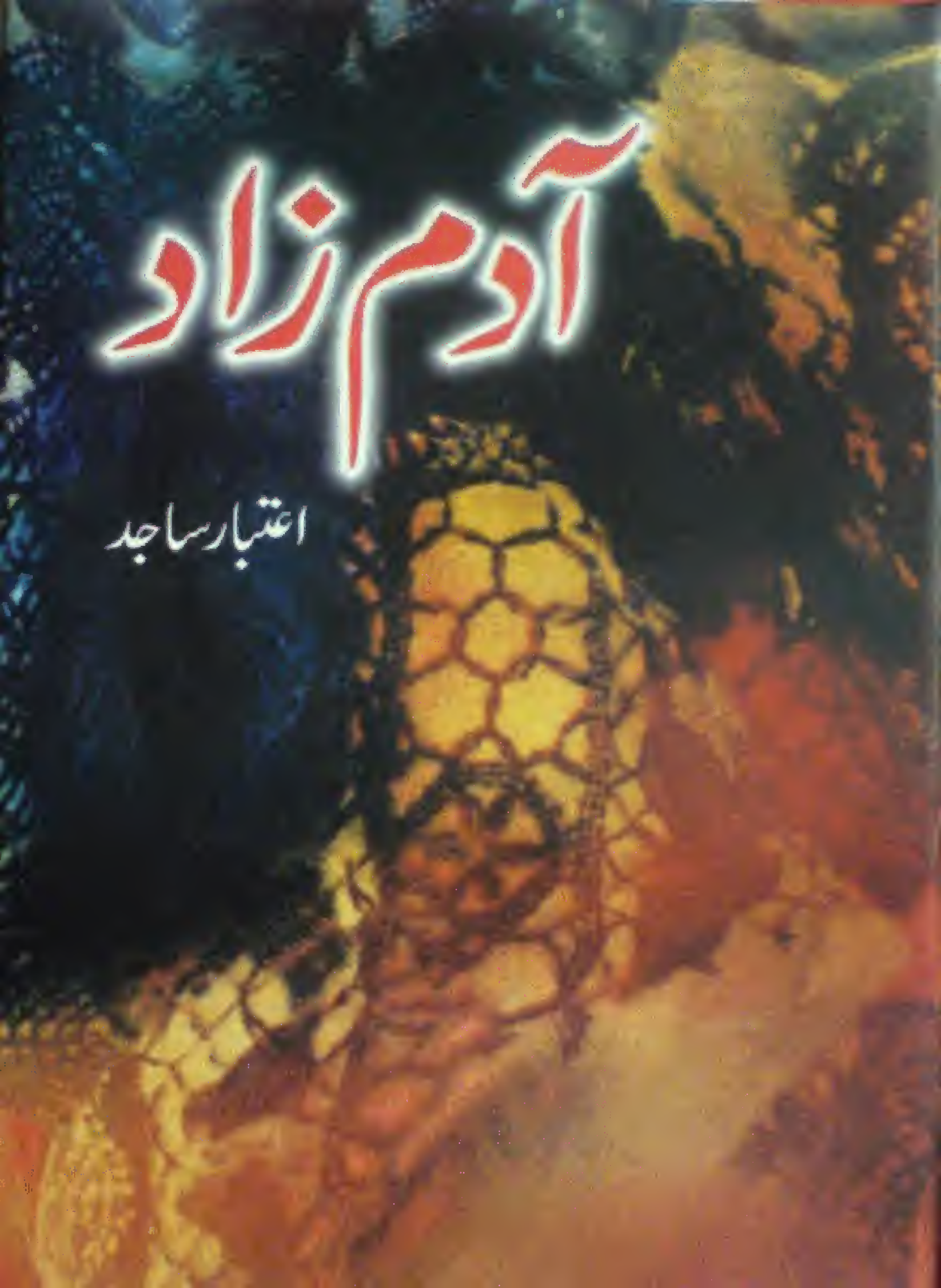

آدم زاد
اعتبار ساجد

ایک خوبصورت معاشرتی ناول

آدم زاد

(ناول)

اعتبار ساجد

دُعا پبلی کیشنز

DUA PUBLICATIONS

ہیڈ آفس: 25 سی لوئر مال لاہور۔ فون: 042-7325418

شو روم: الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 042-7233585

"اے رب! میرے علم میں اضافہ فرما"

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

DUA PUBLICATIONS

ناشر: وصی شاہ

اہتمام: زاہد شیخ

All Rights are Reserved

اس ناول کے تمام کردار، نام اور مقامات و واقعات فرضی ہیں۔ کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔ نیز اس ناول کو ٹیلی ویژن یا فلم کیلئے استعمال کرنے سے پہلے مصنف اور پبلشرز کی تحریری اجازت ضروری ہے۔ بصورت دیگر فوری قانونی چارہ جوئی کی جائے گی!

حقوقِ اشاعت محفوظ

اشاعت — 2006ء

ڈیزائن — عاطف اقبال

کمپوزنگ ...... ایمان کمپوزنگ سنٹر

مطبع — اشتیاق مشتاق پرنٹرز لاہور

قیمت ...... -/160 روپے

دُعا پبلی کیشنز

ہیڈ آفس: 25 کی انارکلی لاہور۔ فون: 042-7325418

شو روم: الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 042-7233585

خوبصورت اور معیاری کتب چھپوانے کیلئے رابطہ کریں — زاہد شیخ : 0300-9476417

کچھ اس ناول کے بارے میں

یہ ایک غلام زادی کی زیست میں آنے والے مدّ و جزر اور طغیانیوں کی داستان ہے مگر ایسی کہ اگر آپ نے ایک مرتبہ اس ناول کو پڑھنا شروع کر دیا تو آخری صفحے تک اسے ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہے گا۔ کہانی اور پلاٹ پر مصنف کی گرفت کا اندازہ آپ کو لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی صورتِ حال سے ہوگا۔ ماحول، کردار، ان کی نفسیات، مناظر اور ان کی جزئیات، ہر باریک سے باریک پہلو پر مُصنف کی سحر انگیز گرفت آپ کو حیرت و استعجاب میں مبتلاء کر دے گی۔

ناول کا بنیادی کردار جس استحصالی معاشرے کی پیداوار ہے وہ کسی خاص علاقے یا جگہ سے مخصوص نہیں۔ ظلم شہروں میں بھی ہوتے ہیں اور دیہاتوں میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں علاقہ یا فلاں گاؤں یا فلاں شہر ہی ظلم و جبر، جرائم اور دشمن داریوں کا گڑھ ہے۔ انگریزوں نے اپنے عہدِ حکومت میں برِصغیر پاک و ہند میں جہاں جہاں انتظامی سہولیات اور مصلحتوں کے پیشِ نظر زمینیں اور جائیدادیں اپنے وفاداروں میں بانٹیں، وہیں اپنے کرّ و فر کو قائم رکھنے کے لئے کچھ ایسی مراعات یافتہ قوتیں بھی پیدا کیں جو اقتدار کو مستحکم اور پائیدار رکھنے کے لئے شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بن سکیں۔ اس خطّے کی بدنصیبی یہی رہی کہ 1857ء سے اس کی آزاد روحیں غلام جسموں میں مقید کی گئیں اس کے نتیجے میں مراعات یافتہ زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کی فصلیں اگتی گئیں۔ انگریز خود تو چلا گیا مگر اپنے اثرات چھوڑ گیا۔ شہروں میں انڈر ورلڈ جرائم کی دنیا اس لئے پرورش پاتی ہے کہ وہاں بالائی سطح پر پولیس، سیکورٹی، عدالتیں اور فورسز اسے کھلی کھیلنے کا موقع فراہم نہیں کرتیں اس لئے شر کی قوتیں انتظام یا تحفظ کے نام پر زیرِ زمین چلی جاتی ہیں۔

مُصنف نے شہری اور دیہی زندگی کی انہی دنیاؤں کے حقائق اپنے اس ناول میں پیش کئے ہیں اور اس کا کمالِ فن یہ ہے کہ اس نے جزئیات کو بھی ممکنہ حد تک نہایت خوبصورت اور چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اس ناول کا ہیرو نبی بخش جنگی ایک حقیقی نہیں، علامتی کردار ہے جس نے ایک وڈیرہ شاہی نظام میں خانہ زاد غلام کی حیثیت سے آنکھ کھولی۔ وہ کارل مارکس نہیں تھا کہ جدلیاتی، طبقاتی اور ریاضیاتی اصولوں کی ناپ تول کے ذریعے ''داس کیپٹیال'' لکھتا۔ ایک عام، الہڑ، اَن پڑھ سا غلام زادہ اپنے ماحول کی بعض باتوں پر کڑھ سکتا تھا، سلگ سکتا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ بولنے کے لئے اس کے پاس بولنے کا جواز اور حوالہ جات کی فہرست نہیں تھی۔ یہ موقع اسے ایک فوری اور ڈرامائی اتفاق نے فراہم کیا۔ صدیق عامر کی ملاقات سے کہانی کے سارے پارٹ اور پُرزے جڑ کر باہمی اشتراک سے حرکت اور عمل کی ایسی فضا بناتے ہیں جو آخر تک کہانی، کرداروں، ان کے قدموں، بازوؤں اور مناظر کو متحرک رکھتی ہے۔ یہی اس ناول کی خوبی اور لکھنے والے کی انتھک محنت کا کمال ہے۔ رائیٹر نے ظاہر ہے، چند دنوں میں یہ ناول نہیں لکھا ہوگا۔ اسے لکھنے سے پہلے کئی بار سوچا ہوگا۔ سفر کئے ہوں گے، مواد جمع کیا ہوگا، نوٹس تحریر کئے ہوں گے، زندگی کے مختلف شعبوں سے

تعلق رکھنے والے افراد سے ملا ہوگا، ان کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات کا مطالعہ کیا ہوگا تب جا کر یہ ناول لکھنا شروع کیا ہوگا۔ جانے کتنے دن، راتیں، ہفتے، مہینے اور سال اس کام میں صرف کیے ہوں گے۔ خیر، یہ لکھنے والے کا مسئلہ ہے۔ پڑھنے اور رائے دینے والے تو آپ ہیں۔ بس اتنی گذارش ہے کہ اس ناول کو آرام و سکون سے، رک رک کر، دھیرے دھیرے، سمجھ سمجھ، پیار اور اطمینان سے پڑھیں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ہم آپ کے لئے کیا لائے ہیں۔ مُصنف نے تو اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اور یہ مصنف بھی کوئی آپ کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ ''مجھے کوئی شام ادھار دو'' جیسے شہرہ آفاق شعری مجموعے کے علاوہ متعدد خوبصورت شعری مجموعوں کے خالق، کوئٹہ ٹیلی ویژن کے معروف ڈرامہ نگار، بے شمار خوبصورت ڈرامے لکھے، افسانے لکھے، کالم لکھے، مزاحیہ مضامین لکھے۔ اب تک قلم کا سفر پوری روانی اور پوری تابانی سے جاری و ساری ہے اور خدا کرے ہمیشہ جاری رہے۔ ہماری دعائیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہی ہیں اور انشاءاللہ ہمیشہ رہیں گی۔

ہم ہیں آپ کی نیک تمناؤں اور قیمتی آراء کے منتظر.....

زاہد شیخ

☆ ☆ ☆

اُس روز صبح سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں باغ کے اوطاق کے پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی ایک جھلنگا سی کھاٹ پر لوہے کی موٹھ والی لاٹھی سرہانے رکھے لیٹا تھا۔ جہاں میری کھاٹ تھی اس کے اوپر ایک پرانا سا کھپریل کا سائبان تھا جسے کھجور کے تنوں کے ذریعے سہارا دیا گیا تھا۔ بخشو اور عید و شام ہی سے اوطاق کے اندر ناؤ نوش میں مصروف تھے، تھوڑی دیر بعد رامو بھی دو لڑکیوں کو لے کر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے، لڑکیوں کو ہاتھ کے اشارے سے اندر بھیج کر وہ سیدھا میری طرف آیا۔

''تُو کیوں بیٹھا ہے اِدھر؟'' وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

''ڈیوٹی ہے میری---'' میں نے لیٹے لیٹے بے پرواہی سے جواب دیا۔

''سب ٹھیک ہے---'' وہ چٹکی بجا کر بولا۔ ''ہم آ گئے ہیں، تیری ڈیوٹی ختم---اب تُو چلا جا---''

مَیں خاموشی سے اٹھ کر لاٹھی سنبھالتا ہُوا سیڑھیاں اتر گیا--- ناؤ نوش کی ایسی محفلیں اکثر یہاں سجتی تھیں اور کبھی کبھی حاکم نیاز و بھی اس میں شریک ہوتا تھا، عموماً اس کے آنے سے پہلے مجھے چلتا کر دیا جاتا تھا لیکن اس روز چند قدم چلنے کے بعد مجھے رکنا پڑا--- منشی نیاز محمد ایک بھاری تن و توش کے آدمی کے ساتھ باغ میں داخل ہو رہا تھا۔ اس شخص کو میں اچھی طرح جانتا تھا' یہ قادر بخش تھا۔ یہ سپر ہائی وے پر بسوں' ٹرکوں اور گاڑیوں کو روک کر دیدہ دلیری سے ڈکیتی کرتا تھا اور اسے حویلی کی پشت پناہی حاصل تھی--- میں ایک درخت کی اُوٹ میں ہو گیا۔ دونوں بارش سے بچتے بچاتے رکتے ٹھہرتے آ رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔

''میں تو حیران ہوں---'' نیاز محمد کہہ رہا تھا۔ ''اتنا بڑا کام تُو نے آٹھ آدمیوں کے ساتھ مل کر کیسے کر لیا؟''

''کام کوئی مشکل نہیں ہوتا حاکم نیاز و---!'' قادر کی بھاری آواز گونجی۔ ''بس منصوبہ بندی ٹھیک ہونی چاہیے--- ایک گھڑی آدمی کی کلائی پر بندھی ہوتی ہے، ایک اس کے دماغ میں ہوتی ہے، ایک اس کے دل میں ہوتی ہے۔ ان تینوں گھڑیوں کا ٹائم ایک ساتھ مل جائے تو بڑے سے بڑا کام آسان ہو جاتا ہے۔ پھر یہ تو کام ہی کچھ نہیں تھا---''

''خوب---!'' حاکم نیاز و چہکا۔ ''اسی لیے تیرے واسطے انگریزی بوتلیں شام ہی سے وڈیرے سائیں نے اوطاق میں پہنچا دی ہیں۔ میں نے ایک اور چیز کے لیے بھی رامو سے کہہ دیا تھا، وہ بھی لے کر آ گیا ہو گا---''

''بڑی دھمکیاں دے رہا تھا کمینہ---'' قادر بولا۔ ''کہتا تھا کہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو، پورے ملک میں شور مچ جائے گا۔ رینجرز اور پولیس کے دستے قبر تک تمہارا پیچھا کریں گے---''

جواب میں نیاز و کریہہ انداز میں ہنسا--- اب وہ میرے قریب سے گزر رہے تھے، یکا یک قادر رک کر بولا۔ ''اس کی نگرانی پر کس کو لگایا ہے؟''

''کریم بخش کو---'' نیاز و نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں--- تجھے تو پتہ ہے کہ کتوں والے تہہ خانہ سے باہر نکلنے کا خطرہ کوئی مقامی باشندہ بھی نہیں لے سکتا، وہ تو پھر بھی شہری ہے۔ اس نے تو کبھی گوٹھ محمد صادق کا نام بھی نہیں سنا ہو گا---''

وہ دونوں باتیں کرتے، قہقہے لگاتے آگے چلے گئے مگر مجھے گہری الجھن میں مبتلا کر گئے — یہ تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ تہہ خانہ میں کسی خاص مہمان کو پہنچایا گیا ہے مگر اب تک میرے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا تھا جب کسی شہری کو حویلی کے اس قید خانے میں پہنچایا گیا ہو — میں حاکم نیازو کو باغ میں داخل ہوتے دیکھ کر محض آنکھ کی شرم رکھنے کے لئے درخت کی اوٹ میں چھپ گیا تھا کیونکہ اوطاق میں سجنے والی محفلوں کے بارے میں، بہت کچھ جاننے کے باوجود ایک خاموش سمجھوتے کے تحت ہم ایک دوسرے کے معاملات سے دانستہ چشم پوشی کرتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ درخت کی اوٹ میں چھپنے سے ایک ایسا طوفان میری زندگی میں آئے گا جو سر سے پاؤں تک مجھے تبدیل کر کے رکھ دے گا — میں حویلی میں لوٹ تو آیا مگر اپنے ساتھ تجسس کا وہ ناگ بھی لے آیا جو کسی لمحے چین نہیں لیتا، ہمیشہ پھنکارتا اور لہراتا رہتا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حویلی کے تہہ خانے میں آخر وہ کون ہے جسے شہر سے لا کر یہاں قید کیا گیا ہے، اسے یہاں قید کرنے میں کیا منطق اور مصلحت ہے؟ — قادر بخش مسافروں کو لوٹتا تھا، انہیں اغوا نہیں کرتا تھا۔ یہ پہلا واقعہ تھا جو میرے علم میں آیا تھا۔ اس پُراسرار حویلی کے اسرار آہستہ آہستہ مجھ پر منکشف ہو رہے تھے۔ اب میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا اور کوشش کے باوجود میں اپنا تجسس اور اضطراب چھپا نہ سکا تو بابا سے میں نے پوچھ ہی لیا۔

''کیا کسی شہری آدمی کو یہاں لایا گیا ہے بابا؟''

میرا باپ پہلے تو میرا سوال سن کر چونکا۔ پھر اس نے سپاٹ چہرہ بنا کر مجھے گھورا، لاتعلقی سے کہنے لگا۔

''کوئی شہری ہو یا گوٹھ والا ہو، مالکوں کے کام مالک جانیں۔ تجھے یا مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ ہم ان کے معاملوں میں دلچسپی لیتے پھریں؟ — چل، کام کر اپنا —''

O

مگر یہ الجھن تجسس کی شدید لہر بن کر میرے رگ و پے میں دوڑتی رہی، میں موقع تاڑتا رہا کہ کسی طرح کتوں والے تہہ خانے تک پہنچوں اور دیکھوں تو سہی کہ وہاں کون ہے اور اسے کس جرم کی پاداش میں قید کیا گیا ہے؟ — اندر سے میرا من یہ بھی کہتا تھا کہ حویلی کے معاملات میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے، جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے تجھے کیا واسطہ؟ — لیکن تجسس کا ناگ دل میں بیٹھ جائے تو آدمی کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ مجھے کتوں والے تہہ خانے تک پہنچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا، ادھر جانے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ ڈیوٹی منشی لگا تا تھا اور دو تین روز سے کتوں کو نہلانے اور نہلانے کا کام کریم بخش کر رہا تھا۔ وہ کاندھے پر تھری ناٹ تھری کی رائفل لٹکائے تہہ خانے کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ ایک دو مرتبہ حویلی کے کام کاج کے سلسلے میں میری اس سے تلخ کلامی ہو چکی تھی اور ہم دونوں کی آپس میں بول چال بھی بس سلام علیک تک رہ گئی تھی، ایسی صورت میں تہہ خانے کی طرف جانا اسے شک میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس کام کے لیے رات کا وقت مناسب تھا کیونکہ حویلی میں کام کاج کرنے والے تمام نوکروں کے کوارٹر حویلی کی جس عقبی دیوار کے باہر بنے ہوئے تھے وہ اپنی خستگی اور بارشوں کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور ہم سب ادھر سے آتے جاتے تھے۔ اسی راستے سے کچھ فاصلے پر ایک منہدم پرانا کنواں تھا اور کنویں کے قریب ہی چبوترے کے نیچے تہہ خانے کی چوڑی سیڑھیاں تھیں۔ کتے چونکہ مجھ سے مانوس تھے اس لیے ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا البتہ کریم بخش ضرور ذرا سی آہٹ پر فائر کر سکتا تھا لہٰذا

اس کی طرف سے چوکس رہنے کی ضرورت تھی — اس دن بارش نے میرا کام آسان بنا دیا، تیز بارش کی وجہ سے کریم بخش کنویں کے قریب بنے ہوئے اس شیڈ کی طرف جا کر بیٹھ گیا تھا جو ڈاگ ہاؤس کے اوپر بنا ہوا تھا۔ دو تین خونخوار کتے تہہ خانے کے چبوترے پر بیٹھے تھے، غالباً انہیں لمبی زنجیروں سے باندھ کر وہاں بٹھایا گیا تھا تاکہ قیدی کے فرار ہونے کی صورت میں وہ لمبی زنجیروں سے فائدہ اٹھا کر، اونچی جست لگا کر اسے قابو کر سکیں۔ باہر سے کسی کے اندر جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اول تو گوٹھ میں کوئی شخص داخل ہونے کے بعد روپوش نہیں رہ سکتا تھا، دوئم حویلی کا حفاظتی انتظام ایسا تھا کہ اس میں داخل ہونا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس حویلی میں صرف وہی شخص رات کو چل پھر سکتا تھا جو اس کی ایک ایک اینٹ اور چپے چپے سے واقف ہو اور ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ اس حویلی کے حدود اربعہ سے اور کون واقف ہو سکتا تھا؟ — رات کے کھانے کے بعد دوستوں کے پاس جا کر گپ شپ لگانے کا بہانہ بنا کر میں کوارٹر سے نکل آیا۔ تہہ خانے کے چبوترے تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی، کتے مجھے دیکھ کر آہستہ سے غرائے ضرور لیکن بھونکے نہیں کیونکہ میں نے مخصوص انداز میں مدھم سیٹی بجا کر انہیں پچکار لیا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر میں نے باری باری ان کے سروں اور جسموں پر ہاتھ پھیرا اور تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ دس بارہ سیڑھیاں اترنے کے بعد آہنی سلاخوں والا ایک مضبوط پھاٹک تھا جس کے کنڈے میں بھاری تالا جھول رہا تھا۔ اندر بہت مدھم روشنی تھی، غالباً دائیں طرف طاق میں دیا جل رہا تھا جس کی روشنی پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے بہت مدھم ہو چکی تھی۔ یہ تہہ خانہ ایک بڑے سے اونچے ہال کی طرح تھا جس کی دیواروں میں جگہ جگہ لوہے کے آنکڑے لگے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھاس پھوس کے ڈھیر تھے، یہ قیدیوں کے بستر تھے مگر اس وقت صرف ایک قیدی اس تاریک تنہائی میں مقید تھا جو میری نظروں سے اوجھل تھا اور کوشش کے باوجود وہ مجھے دکھائی نہ دے سکا۔ اگر لوہے کا یہ دروازہ کھلا ہوتا تو دائیں طرف کی دیوار عبور کر کے پورے ہال کا منظر نظر آ سکتا تھا مگر یہ دیوار اس طرح سامنے آ گئی تھی کہ منظر پوری طرح واضح نہیں ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے کھڑا سلاخوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا رہا پھر قیدی کو متوجہ کرنے کے لیے مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں آہستہ سے کھانسا۔ یکایک دور کسی گوشے میں زنجیریں کھنکیں، جواباً جیسے کسی نے کھانس کر میری موجودگی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس قیدِ تنہائی میں کوئی تو آیا لیکن جب لوہے کے پھاٹک کا تالا نہ کھلا تو قیدی حیران ہُوا۔

"کون ہو بھائی؟"

اس کی سہمی سہمی آواز قید خانے کے در و دیوار سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتی ہوئی مجھ تک پہنچی — افسوس! میں بول نہیں سکتا تھا، اس طرح میری آواز باہر جا سکتی تھی اور اگر میں بولتا بھی تو کیا بولتا کہ مجھے تو تجسس یہاں تک لایا تھا — میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو اور یہاں تک کیسے پہنچے لیکن پوچھ نہیں سکتا تھا۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتانا پڑتا کہ میں کون ہوں، کس لیے یہاں آیا ہوں اور یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہا ہوں؟ — عجب تذبذب اور گومگو کی کیفیت تھی، زبان ہوتے ہوئے بھی بے زبانی کا عالم تھا لیکن خاموش کھڑے رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بلانے سے آواز باہر تو جا سکتی تھی لیکن یہ خطرہ مول لینا ضروری تھا تاکہ قیدی کے بارے میں میرا تجسس مٹ سکے۔

"دیکھو —" میں نے تیز سرگوشی سے کہا۔ "آہستہ بولنا، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں —"

"دشمن نہیں ہو —؟" وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑا۔ "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ بھی تمہاری کوئی چال ہو گی —"

''آہستہ ---''میں نے جھنجھلا کر سلاخوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔''آہستہ بولو، خدا کے لیے ---!''

چند لمحوں کے لیے خاموشی طاری ہو گئی، غالباً وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے جیسے خود کلامی کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں کہ تم لوگوں نے اس گندے تہہ خانے میں لا کر مجھے ڈال دیا، میں لاوارث نہیں ہوں کہ کوئی میرے پیچھے نہیں آئے گا، میں کمزور نہیں ہوں کہ سسک سسک کر دم توڑ دوں گا --- تم لوگوں نے مجھے بہت مارا پیٹا ہے، بہت دھمکیاں دی ہیں۔ میرے ساتھ بد ترین سلوک کیا ہے لیکن میں تمہارا مطالبہ کسی صورت میں تسلیم نہیں کر سکتا چاہے مجھے جان سے مار دو --- تم مجھے مار دو گے تو پھر موت تمہارا بھی مقدر بن جائے گی، یاد رکھنا میری بات --- میں کوئی فلمی ڈائیلاگ نہیں بول رہا ہوں۔ میں نے لندن کے اسی کالج میں تعلیم حاصل کی ہے جہاں سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر جلال دین بھاگا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ نالائق اور بدتمیز آدمی اتنی بڑی درسگاہ تک کیسے پہنچ گیا لیکن پیسہ اور اثر و رسوخ پوری دنیا میں کام دکھاتا ہے چاہے وہ لندن ہو یا پاکستان ہو ---''

''دیکھو ---''میں نے اس کی طویل اور ناقابلِ فہم باتوں سے اکتا کر کہا۔''آہستہ بولو اور اتنی باتیں مت کرو۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے، کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو؟ --- بس!''

وہ تیز لہجے میں بولا''--- میں آیا نہیں، دھوکے سے لایا گیا ہوں۔ مجھے یرغمال بنایا گیا ہے اور میرے والد سے تاوان کی رقم پانچ کروڑ روپے مانگی جا رہی ہے --- مگر تم کون ہو، یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں جو کوئی بھی ہوں، تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں صرف یہ جاننے کے لیے آیا ہوں کہ تم کون ہو ---''

''میرا نام صدیق عامر ہے ---''اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''ادریس گروپ آف انڈسٹریز کے مالک سیٹھ ادریس احمد کا بیٹا ---''

یہ نام سن کر میں کچھ چونکا --- سیٹھ کا نام دو ایک بار اس حویلی میں، مَیں نے جلال دین کے منہ سے سنا تھا۔ غالباً صدیق عامر کا نام بھی درمیان میں آیا تھا مگر سیاق و سباق مجھے یاد نہیں تھا اور ویسے بھی غلاموں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مالکان کے معاملات کی ٹوہ لیتے پھریں۔

''سنو ---!''صدیق عامر نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔''اگر تم مجھے یرغمال بنانے والی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے تو خدا کے لیے میری بات سن لو۔ تمہیں فوری طور پر پانچ لاکھ روپے نقد مل جائیں گے، کسی طرح مجھے یہاں سے نکال دو یا میرا پیغام میرے والد تک پہنچا دو ---''

''پانچ لاکھ ---''میرے ذہن میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ اتنی بڑی رقم تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی، اتنی خطیر رقم کے ہندسے تو کبھی اپنی زبان سے بھی ادا نہیں کیے تھے۔

''اگر پانچ لاکھ کم ہیں ---''صدیق عامر میری خاموشی کو میرا انکار سمجھتے ہو بولا۔''تو اس رقم میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے مگر مجھے یہاں سے نکلواؤ خدا کے لیے ---!''

میں چکرا کے رہ گیا --- صدیق عامر کو یہاں سے فرار کرانے میں مدد دینے کا مطلب تھا، دونوں کی موت! --- اور اگر ہم کسی طرح حویلی

سے نکل بھی جاتے تو گوٹھ کے لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچ نہیں سکتے تھے۔ نیشنل ہائی وے اس گوٹھ سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، وہاں تک پہنچنے کے لیے عام سواریاں مثلاً اونٹ، گھوڑے اور کھٹارہ بسیں تھیں جو اونچے اونچے ناہموار راستوں اور ٹیلوں کے درمیان بنی ہوئی کچی پکی سڑکوں سے گزرتی تھیں اور پھر جنگلی جھاڑیوں کے لامتناہی سلسلے تھے۔ راستے میں مختلف گوٹھ تھے جن کا ایک دوسرے سے قبائلی یا سماجی تعلق تھا۔ یہ سانپ اور سیڑھی کا کھیل تھا جہاں پانسہ غلط پڑنے سے سیڑھی کے اوپر پہنچا ہوا آدمی سیدھا سانپ کے منہ میں جا سکتا تھا لہٰذا میں نے صاف کہہ دیا۔

''تمہیں یہاں سے نکالنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔۔۔''

صدیق عامر روہانسو ہو کر بولا۔ ''کوشش۔۔۔ کوشش تو کرو۔۔۔''

''کوئی کوشش نہیں ہو سکتی۔۔۔''

میں نے مڑ کر اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی اور لمبی زنجیروں سے بندھے ہوئے کتے بارش سے بچنے کے لیے سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور مضطرب ہو کر دھیرے دھیرے غرا رہے تھے۔۔۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے صدیق عامر مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ سلاخوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا اس لیے سر اندر داخل کر کے دور تک دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ ایک بالمشافہ ملاقات تھی مگر غائبانہ تھی۔۔۔ صدیق عامر کی زنجیریں زور زور سے کھنکھنائیں، غالباً وہ دیوار کی اوٹ سے نمایاں ہونے کی کوشش میں زور لگا رہا تھا مگر زنجیریں چھوٹی تھیں، وہ سامنے نہیں آ سکا البتہ زنجیر میں بندھا ہوا اُس کا طویل سایہ ترچھی دیوار پر تھوڑا تھوڑا سا نمایاں ضرور ہوا۔

''سنو۔۔۔ میری بات سنو!'' صدیق عامر مضطرب لہجے میں بولا۔ ''اگر تم لکھ پڑھ سکتے ہو تو بتاؤ۔۔۔''

''نہیں۔۔۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا اور تاسف انگیز لہجے میں کہا۔ ''میں نہ لکھ سکتا ہوں، نہ پڑھ سکتا ہوں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نام وام چھوڑو۔۔۔'' میں نے احتیاط سے کام لیا۔ ''کام بتاؤ۔۔۔''

''تم کبھی شہر گئے ہو؟''

''دو تین بار۔۔۔''

''کراچی دیکھا ہے؟''

''ایک بار۔۔۔''

''کراچی جا سکتے ہو؟''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہم غلام لوگ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتے۔ مالک کام بتائیں تو پھر ہر جگہ جا سکتے ہیں۔۔۔''

''پہلی بات۔۔۔'' وہ زور دے کر بولا۔ ''پہلی بات یاد رکھو اور مسخ کی طرح اپنے دماغ میں ٹھونک لو کہ تمام انسانوں کا معبود اور مالک اللہ ہے، دنیا میں کوئی شخص کسی کا مالک اور غلام نہیں۔ ملکیت کا حق باری تعالیٰ کو ہے اور محض دولت کے بل پر کوئی شخص کسی کا آقا یا مالک نہیں بن سکتا۔۔۔

البتہ آدمی ملازم ہوسکتا ہے لیکن ملازمت میں ہاتھ اور دماغ پابند ہوتا ہے۔ دل اور ضمیر کو نہ کوئی شخص خرید سکتا ہے، نہ بیچنے کی چیز ہے۔ انسان آزاد پیدا ہُوا ہے اور آزادی اس کا پیدائشی حق ہے۔ غربت، افلاس یا مجبوری کے نام پر وہ اپنی جسمانی اور دماغی محنت بیچتا ہے مگر اس کی روح ہر قسم کی ملازمت کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے لہٰذا آئندہ تم اپنے آپ کو غلام مت کہنا اور مت سمجھنا۔ تم آزاد ہو اور آزادی تمہارا بنیادی، پیدائشی آئینی، اخلاقی اور مذہبی حق ہے۔۔۔ سمجھ گئے میری بات؟"

صدیق عامر کی باتیں اگرچہ اس وقت کے حالات اور ماحول اور میری تربیت کے تناظر میں عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم تھیں مگر اچھی لگ رہی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ سمجھ گیا۔۔۔" میں نے کہا۔

اس نے پوچھا۔ "اب مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ اور کون سا علاقہ ہے؟"

میں تذبذب میں پڑ گیا کہ بتاؤں یا نہ۔۔۔ بالآخر میں نے بتا دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نیشنل ہائی وے سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور ہوں۔۔۔ یہ کوئی زیادہ فاصلہ نہیں، ہائی وے سے کراچی جانے والی گاڑیاں آسانی سے تمہیں مل سکتی ہیں۔۔۔"

"تو پھر۔۔۔؟" میں نے حیرت، تجسس اور تذبذب کے عالم میں پوچھا۔

"تم سیدھے میرے والد کے پاس پہنچو، انہیں تمام روداد سناؤ اور جتنی رقم چاہئے، معاوضے کے طور پر ان سے مانگ لو لیکن ان سے یہ ضرور کہنا کہ آپریشن کے لیے ہائی روڈ یہاں پہنچنے کا رسک لینا ٹھیک نہیں۔۔۔ میرے والد تمہیں پانچ سے سات لاکھ نقد دے دیں گے، زیادہ لالچ مت کرنا۔۔۔ اور میری انگوٹھی لے جاؤ۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے انگلی سے اپنی قیمتی انگوٹھی اتار کر سلاخوں کی طرف اچھال دی۔ یہ انگوٹھی سلاخوں کے پاس تو نہیں گری لیکن فاصلہ اتنا ضرور تھا کہ میں نے قریب پڑی ایک شاخ کے ذریعے بازو سلاخوں میں ڈال کر اسے نزدیک کر لیا اور جھک کر اٹھا لیا۔ یہ واقعی بہت بیش قیمت انگوٹھی تھی۔۔۔

صدیق عامر نے مزید کہا۔ "تم نشانی کے طور پر یہ انگوٹھی میرے والد کو دکھا دینا، اگر نہ دکھا سکو اور سفر خرچ کے لیے تمہیں اسے بیچنا پڑے تو بیچ دینا مگر ایک لاکھ پچاس ہزار سے کم میں مت بیچنا، اس کی اس سے زیادہ قیمت ہے لیکن میں تم پر اندھا اعتماد کر کے یہ انگوٹھی تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم، نہ تم نے کچھ کھل کر بتایا لیکن اس کے باوجود میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم ایک اچھے انسان ہو، ضرور میری ہدایت پر عمل کرو گے اور میری رہائی کا سبب بنو گے۔۔۔ میں نے تمہارے بارے میں غلط اندازہ تو نہیں لگایا؟"

میں خاموش کھڑا ہو کر اپنی ٹھوڑی کھجاتا رہا۔ پھر قدرے بلند آواز میں کہا۔

"آج رات کو میں اس معاملے پر غور کروں گا۔ اگر یہ کام کر سکا تو کراچی نکل جاؤں گا ورنہ موقع پا کر یہاں آؤں گا اور تمہاری انگوٹھی واپس کر دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔۔۔"

صدیق عامر نے سائٹ ایریا کا پتا دو تین مرتبہ دہرایا جسے میں نے ذہن نشین کر لیا— واپسی میں جب میں تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو کتے اپنی تھوتھنیاں اگلے پنجوں پر رکھے آرام کر رہے تھے، بارش تھم چکی تھی اور کریم بخش کا دور دور تک پتہ نہیں تھا، شاید وہ برآمدے میں بچھی ہوئی کسی کھاٹ پر جا کر سو گیا تھا، میں دبے پاؤں سرونٹ کوارٹر میں آ گیا۔ یہاں کسی سرونٹ کوارٹر میں کنڈی لگانے کا رواج نہیں تھا لہٰذا خاموشی سے اپنے بستر تک پہنچنے میں مجھ دیر نہیں لگی۔ بابا سو چکا تھا اور ماں ہولے ہولے کھانس رہی تھی، رسمی طور پر اس نے مجھے دیر سے آنے پر بُرا بھلا کہا اور پھر کروٹ بدل کر سو گئی مگر نیند میری آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ ایک ایسا کام نادانستگی میں میرے گلے پڑ گیا تھا جس کے دو انجام تھے، میری موت یا دولت کا ڈھیر— اتنی دولت جس سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ماں باپ کو گوٹھ محمد صادق کی غلامی سے نجات دلا سکتا تھا اور کراچی میں کوئی چھوٹا موٹا گھر لے کر اپنا کوئی کاروبار شروع کر سکتا تھا— حویلی کے غلام اپنی ہر نقل و حرکت کے لیے مالکان اور بیگمات کے حکم کے پابند تھے۔ کراچی جانا تو درکنار، انہیں کسی قریبی گوٹھ تک جانے کے لیے بھی پیشگی اجازت درکار تھی اور جب تک کام اہم نہ ہو، اس کام سے حویلی کے مکینوں کا کوئی تعلق نہ ہو اس وقت تک باہر نہیں جایا جا سکتا تھا البتہ گوٹھ میں ہر جگہ جانے کی اجازت تھی لیکن کام کے اوقات میں یہ اجازت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ بابا کو اس معاملے میں اعتماد میں نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ حویلی کا جدی پشتی نمک خوار تھا اور مالکان سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت، سب کچھ ایک روایتی غلامانہ ذہنیت رکھنے والے ملازم کا تھا جس کی سرشت میں مالک کے لیے مر مٹنے کے سوا اور کوئی صفت نہیں تھی۔ اگر اسے میرے عزائم کی سن گن بھی مل جاتی تو وہ خود وڈیرا جلال دین کو جا کر حرف بہ حرف تمام حالات سے باخبر کر دیتا— رہ گئی ماں! اس بوڑھی بیمار عورت کے اندر اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ وہ ایسی بات سن بھی سکتی لہٰذا جو کچھ کرنا تھا، مجھی کو کرنا تھا اور آزمائش کا یہی پہلا مرحلہ میرے لیے جان کا سب سے بڑا عذاب تھا۔ میری رگوں میں دوڑنے والے خون میں حویلی کا نمک تھا، میرے پسینے میں اس حویلی کا نمک تھا اور میرے دماغ میں اس حویلی اور اس کے مکینوں کی دہشت تھی لیکن دل بے خوف اور نڈر تھا اور اسی کمبخت دل نے تجسس کے ناگ کی پرورش کر کے مجھے مصیبت میں ڈال دیا تھا— وہ پوری رات میں نے کروٹیں بدلتے بدلتے اور سوچتے سوچتے گزار دی۔ فجر کی اذان کے وقت میں بستر سے اٹھ کر بیٹھا— بابا جاگ چکا تھا اور چارپائی پہ پاؤں لٹکائے حقہ پی رہا تھا۔

''میں ذرا گوٹھ قاسم علی جا رہا ہوں—'' میں نے چادر اپنے کاندھوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''گوٹھ قاسم میں تیرا کیا کام ہے؟'' بابا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''فضل داد سے رقم لینی ہے''۔

میں نے بنا بنایا بہانہ پیش کر دیا— فضل داد کے ذمے میری کچھ رقم عرصے سے واجب الادا تھی اور وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ گوٹھ محمد صادق سے گوٹھ قاسم پندرہ بیس کلومیٹر نیشنل ہائی وے کی طرف شمال میں تھا، اس طرح پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ اس ایک بہانے کی آڑ میں طے ہو سکتا تھا۔

''اور منشی نے اگر کوئی کام کہا یا تیرا پوچھا تو—؟'' بابا ناگواری سے بولا۔

''گول مول کر دینا۔۔۔''

میں نے کہا اور سلام کر کے تیزی سے باہر نکل گیا کہ کہیں ماں نہ جاگ جائے اور مجھے روکنے کے لیے واویلا نہ کرنے لگے۔۔۔ فجر کی اذان کے وقت ایک کھٹارہ بس گوٹھ کے مویشیوں اور لوگوں کو لے کر نیشنل ہائی وے تک جاتی تھی اور راستے میں جگہ جگہ رک کر سواریاں اتارتی چڑھاتی رہتی تھی۔ اتفاق سے یہ بس مجھے راستے ہی میں مل گئی، اس وقت یہ ایک خستہ پل سے گزر کر ٹیلے کی طرف جانے والی سڑک کی طرف مڑ رہی تھی کہ میں نے ہاتھ دے کر روک لیا اور اچھل کر بس میں سوار ہو گیا۔ گوٹھ قاسم علی پہنچ کر میں اتر گیا اور سیدھا فضل داد کے پاس پہنچا اور اس سے اپنی رقم کا تقاضہ کیا۔۔۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے ٹال مٹول سے کام لینے کی بجائے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور میری مطلوبہ رقم سے تقریباً نصف رقم میرے ہاتھ پر رکھ دی، معذرت کرنے لگا کہ اس وقت اتنا ہی سرمایہ اس کے پاس تھا اور باقی رقم خود گوٹھ پہنچ کر دو تین روز میں ادا کر دے گا۔۔۔ ہائی وے تک جانے والی بس نکل چکی تھی اور تین چار گھنٹوں سے پہلے اب کوئی اور بس یہاں سے نہیں گزرتی تھی البتہ ساربان مناسب معاوضے پر لوگوں کو قریبی گوٹھ، ڈسپنسری یا ہائی وے تک چھوڑ دیتے تھے مگر سب کے سب ساربان اور ان کے اونٹ گوٹھ کے چھوٹے سے بازار کے چوک پر موجود تھے، وہاں جا کر معاملہ طے کرنے میں کئی دشواریاں تھیں۔ گوٹھ قاسم علی سے تقریباً بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر گوٹھ پیراں شاہ تھا، وہاں میرا ایک ساربان دوست عبدل رہتا تھا جو بانسری بہت اچھی بجاتا تھا لہٰذا وہاں اس سے ملنے اور پھر آگے جانے کا ٹھوس ذریعہ میری سمجھ میں آ گیا۔ فضل داد کو میں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ میں نکلا تو رقم لینے کے لیے تھا مگر عبدل سے ایک ضروری کام ہے لہٰذا میں گوٹھ پیراں شاہ سے ہو کر واپس اپنے گوٹھ جاؤں گا۔ اسی نے ایک ساربان سے معاوضہ طے کر کے مجھے اونٹ پر بٹھا کر رخصت کیا۔ اس ساربان کی آنکھیں بہت چمکدار اور بے چین سی تھیں۔ ہم گوٹھ کے بازار سے نکلے ہی تھے کہ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور میری طرف مڑ کر بولا۔

''تمہیں ایک چیز سناتا ہوں''۔

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ میں اونٹ کی مہار پکڑی، دوسرا ہاتھ کان پر رکھ کر گانا شروع کیا۔ یہ شاہ لطیف بھٹائی کے ایمان افروز دوہڑے تھے، ذہن اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والے، دل میں اتر کر انسان کو بیدار کر دینے والے۔۔۔ اس میں تصوف کی گہرائی اور دل کا سوز تھا۔ میرے دل کی دنیا بدلنے لگی۔ مالک سے غداری پر ندامت اور لالچ پر شرم محسوس ہونے لگی، جی چاہا کہ اونٹ سے اتر جاؤں اور موقع پا کر انگوٹھی صدیق عامر کو لوٹا کر معذرت کر لوں کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔۔۔ ہائی وے سے گوٹھ کی طرف جانے والی بس سامنے سے آ رہی تھی۔ میں واپسی کا ارادہ باندھ رہا تھا، دل کو پختہ کر رہا تھا، طمع اور لالچ پر خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا لیکن لگتا تھا جیسے نادیدہ زنجیروں نے مجھے یوں باندھ رکھا ہے کہ اترنا بھی چاہوں تو نہیں اتر سکتا، لوٹنا بھی چاہوں تو نہیں لوٹ سکتا۔۔۔ بس سامنے آئی۔ اس کا چہرا بڑا ہوا، پھیلا، پھر وہ دائیں طرف مڑ گئی۔ کھڑکیوں سے اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کے چہرے باری باری نظروں کے سامنے گزرے پھر گرد و غبار میں اوجھل ہو گئے۔ بس ہارن بجاتی، کھڑکھڑاتی، ڈولتی ڈگمگاتی اونٹ کے قریب سے گزر گئی۔۔۔ ساربان نے میرے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیات کو پڑھ لیا، کہنے لگا۔

''صرف گوٹھ پیراں شاہ جانا ہے یا آگے کا سفر ہے؟''

اس نے اتنے تیکھے اور چبھتے ہوئے انداز میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سوال کیا تھا کہ میں جھوٹ نہ بول سکا، ہپناٹائز ہو کر رہ گیا۔

''جانا تو مجھے — ہائی وے، بڑی سڑک تک ہے۔'' میں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''لے چلوں گا —'' وہ میری بدلتی ہوئی رنگت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا اونٹ زوردار اونٹ ہے لیکن کتنے پیسے دو گے؟''

گوٹھ قاسم علی سے ہائی وے تک کا جو کمکنہ کرایہ تھا، وہ میں نے اسے بتا دیا مگر اس نے نخوت سے گردن جھٹک دی اور بولا۔

''ناں سائیں، ناں — کیا بات کرتے ہو — ایک پورا لال نوٹ اس کام میں لگے گا —''

تقریباً ڈھائی تین سو روپے میری جیب میں تھے مگر میں اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، خاصی ردوکد کے بعد میں مصنوعی خفگی ظاہر کرتے ہوئے سو روپے پر آمادہ ہوا۔ اس بیچارے کو کیا معلوم کہ جاتے ہوئے جو سواری معمولی لباس پہنے، میلی چادر اوڑھے سو روپے کے صرف ایک نوٹ کی ادائیگی پر ناک بھوں چڑھا رہی ہے وہ واپسی میں پانچ سات لاکھ کی آسامی ہوگی — ابھی ہم ہائی وے سے بیس پچیس کلومیٹر دور تھے کہ دھواں دھار بارش شروع ہوگئی۔ ہمارے علاقے میں اول تو اتنی شدید بارش ہوتی نہیں تھی، ہوتی تھی تو کئی کئی دن تک لگاتار ہوتی تھی اور تمام کچی سڑکیں اور آمدورفت کے لیے بنائے ہوئے راستے ملیامیٹ کر کے رکھ دیتی تھی۔ ہم نے ایک چھپر ہوٹل میں پناہ لی۔ وہاں اور بھی مسافروں نے پناہ لے رکھی تھی۔ کئی اونٹ اور ساربان بھی جمع تھے اور بارش دھیمی ہونے کا انتظار کر رہے تھے، وہیں ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ سہ پہر تک بارش ہوتی رہی اور جب ختم ہوئی تو جگہ جگہ اتنے تالاب اور گڑھے بن گئے کہ اونٹوں کے لیے چلنا محال ہوگیا۔ مجبوراً ساربان کے ساتھ مجھے بھی رات بھر کے لیے اس چھپر ہوٹل میں رکنا پڑا۔ یہ ایک طویل برآمدہ تھا جس میں جابجا چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں اور ساربان علی بخش کونے کی دو چارپائیوں پر قابض ہوگئے۔ چھپر ہوٹل کے مالک نے بستروں کا انتظام کیا اور میں نے شب بسری اور کھانے کا معاوضہ اسے اپنی جیب سے ادا کر دیا — اونٹ کی سواری آدمی کو بہت تھکا دیتی ہے، تھکن سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لہٰذا جلدی ہی مجھے نیند آ گئی۔

O

یکایک صبح سویرے شور سن کر میری آنکھ کھل گی۔ چھپر ہوٹل میں افراتفری مچی ہوئی تھی، معلوم ہوا کہ علاقے کا مشہور ڈاکو اور اس کے گھڑسوار ساتھی سپر ہائی وے پر لوٹ مار کے لیے جا رہے ہیں اور چائے پینے کے لیے چھپر ہوٹل میں رکیں گے۔ یہ خبر ایک صبا رفتار اونٹنی سوار پچھلے گوٹھ سے لایا تھا —

ان علاقوں میں کئی ڈاکو سرگرم تھے اور عموماً گوٹھوں میں ڈکیتی کی بجائے شہروں میں یا ہائی وے کے سنسان حصوں میں لوٹ مار کر کے اپنے اپنے علاقوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔ عموماً گروہ بند ڈاکو ایک سردار کی قیادت میں نکلتے تھے اور کسی عورت، بچے یا بوڑھے پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ لوٹ مار کے دوران اگر کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو بے دریغ گولی مار دیتے تھے۔ وہ وقت کا بے حد خیال رکھتے تھے اور ایک ایک منٹ کے لیے اپنی مصروفیات پہلے سے طے اور متعین کر لیتے تھے۔ جو اونٹنی سوار ڈاکوؤں کی آمد کی خبر لایا تھا وہ اطمینان سے ایک چارپائی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ علی بخش ساربان نے اس سے بارش اور راستے کا حال معلوم کیا، پتہ چلا کہ بارش کا زیادہ تر پانی خشک زمین پی گئی ہے اور باقی ماندہ پانی ندی

نالوں میں جا کر مل گیا ہے لہٰذا آمد و رفت کے راستے کھل گئے ہیں۔۔۔ علی بخش نے مجھے آنکھ سے نکل چلنے کا اشارہ کیا۔ چھپر ہوٹل کے سامنے ایک سائبان میں سارے اونٹ بندھے تھے۔ علی بخش نے اپنے اونٹ کی پازیبیں اور گھنٹیاں پہچان کر اس کی رسی کھولی، پالان اور کاٹھی درست کی۔ ابھی ہم اونٹ پر سوار ہوئے تھے کہ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ان گولیوں کا مطلب یہ تھا کہ جو جہاں ہے وہیں ٹھہر جائے، ڈاکو آ رہے تھے۔۔۔ بارش کے بعد صبح کا ملگجا افق ہنوز صاف اور واضح نہیں ہُوا تھا۔ آسمان پر جہاں جہاں سے بادل چھٹ گئے تھے وہاں بھی آسمان گدلا تھا اور سورج کے دور تک آثار نہیں تھے۔ ڈاکو چھپر ہوٹل تک پہنچ گئے۔ ایک ڈاکو نے برق رفتاری سے چھلانگ ماری، نیچے کودتے ہی اس نے تین ہوائی فائر کیے، لوگوں کے دل دہل گئے۔ تمام ڈاکو گھوڑوں سے اتر آئے۔ ان کے چہروں پر گہری سیاہ نقابیں اور جسموں پر گہرے رنگوں کے لباس تھے، کاندھوں پر پڑی ہوئی چادریں انہوں نے بغلوں میں ڈال کر اس طرح لٹکا لی تھیں کہ ان کے سرے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ وہ تعداد میں سات تھے۔ چھپر ہوٹل کا مالک دونوں ہاتھ جوڑے ملازم کے ذریعے چائے کی بڑی کیتلی، پیالیاں اور ابلے ہوئے انڈے لیے سامنے آ گیا۔

''نہال بابا، سلام سلائیں۔۔۔!''

اس نے جوڑے ہوئے ہاتھوں کو پیشانی سے لگاتے ہوئے جھک کر کہا۔ ایک چھریرے جسم کے قد آور نقاب پوش نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر تھپکی دی۔

''خوش تھیوے سائیں۔۔۔''

ان کے لیے الگ سے دو چارپائیوں پر اجلی چادریں بچھا کر گاؤ تکیے رکھ دیے گئے تھے مگر وہ بیٹھے نہیں، کھڑے کھڑے چائے پیتے، انڈے کھاتے اور تیز نظروں سے گردن گھمائے بغیر اِرد گرد دیکھتے رہے۔ ایک ڈاکو علی بخش ساربان کا واقف نکل آیا، اس نے تیز نظروں سے ہمیں دیکھا پھر قریب آ کر علی بخش کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بھلے ہو بخشے۔۔۔؟''

علی بخش اس کی آواز پہچان کر گلے لگ گیا لیکن ڈاکو نے اس کے ساتھ سینے سے سینہ ملایا نہیں، بس معانقے کی طرح قریب ہُوا اور تقریباً ایک بالشت کے فاصلے سے دور ہٹ گیا۔

''یہ کون ہے بخشے۔۔۔؟'' اس نے لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ سواری ہے۔۔۔'' علی بخش نے بتایا۔ ''گوٹھ قاسم علی سے لایا ہوں، ہائی وے تک جائے گا۔۔۔''

''اس کا ہائی وے پر کیا کام ہے؟'' ڈاکو نے تیز لہجے میں پوچھا۔ پھر براہِ راست میری طرف متوجہ ہو گیا۔ سر سے پاؤں تک اس کی ایکس ریز جیسی آنکھوں نے مجھے ٹٹولا پھر اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ ''ہائی وے پر تیرا کیا کام ہے؟''

مَیں نے ساربان کو بھی نہیں بتایا تھا کہ مجھے کراچی جانا ہے لیکن یہاں جھوٹ نہیں بولا جا سکتا تھا، بات بنانے کے لیے میں نے کہا۔

''سائیں، مجھے کراچی کی کوئی گاڑی پکڑنی ہے۔ وہاں میرا چاچا بہت بیمار ہے، آخری سانس لے رہا ہے''۔

ڈاکو نے پھر مجھے غور سے مجھے دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت یہاں جتنے لوگ ہیں، ان میں سے ہمارے علاوہ کوئی ہائی وے کی طرف نہیں جائے گا--- جانا بہت ضروری ہے تو گوٹھ سجاول کی طرف سے جاؤ۔''

مَیں نے پریشان نظروں سے علی بخش کی طرف دیکھا--- گوٹھ سجاول کی طرف سے جانے کا مطلب تھا کہ مسافت میں مزید بیس پچیس کلومیٹر کا فاصلہ بڑھ جائے گا۔

''ٹھیک ہے، سائیں---!'' علی بخش نے فوراً سر ہلا دیا۔ ''ہم گوٹھ سجاول کی طرف سے نکل جائیں گے، تم فکر نہ کرو---''

''یہ بات سب کو بتاؤ---'' ڈاکو نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس وقت کوئی لاری والا سڑک سے ہائی وے کی طرف نہیں جائے گا۔ جسے جانا ہے، گوٹھ سجاول کی طرف سے جائے''۔

علی بخش نے بلند آواز میں اس کی بات دہرا دی جسے سن کر اکثر کے منہ لٹک گئے لیکن کسی نے زبان نہیں کھولی--- ڈاکو جس طرح آناً فاناً نمودار ہوئے تھے، اسی تیزی کے ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر فائرنگ کرتے ہوئے چلے گئے، بمشکل وہ چھپر ہوٹل میں سات آٹھ منٹ ٹھہرے ہوں گے۔ ان کا آنا اور جانا ایسا ہی تھا جیسے فلم کا ایک منظر آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوٹ مار کے لیے انہوں نے صبح سویرے کا وقت کیوں منتخب کیا جبکہ ہائی وے پر خاصی چہل پہل ہو جاتی ہے؟--- گوٹھ سجاول کی طرف سے خاردار جھاڑیاں عبور کرتے ہوئے جب ہم سپر ہائی وے کی طرف بڑھ رہے تھے تو علی بخش نے بتایا۔

''صبح کا وقت یہ اس لیے منتخب کرتے ہیں کہ رات کو بہت کم مسافر گاڑیاں راستے میں ملتی ہیں، عموماً ٹرک قافلوں کی صورت میں چلتے ہیں، صبح کو ٹرک کم اور گاڑیاں زیادہ ہوتی ہیں اس لیے رات کے مقابلے میں صبح کو زیادہ مال ہاتھ لگ جاتا ہے۔ پھر یہ ایسا ٹائم ہوتا ہے کہ پولیس پٹرولنگ کی بہت کم گاڑیاں نظر آتی ہیں---''

ڈاکوؤں اور ان کے طریقۂ واردات کے بارے میں اس کی معلومات بہت وسیع تھیں، ایسا لگتا تھا گویا وہ بھی کسی وقت ان لوگوں میں شامل رہ چکا ہے اور میں نے ہنستے ہنستے پوچھ لیا۔

''ایک ڈاکو تمہارا دوست بھی تھا، غالباً تم بھی کبھی---''

وہ آہستہ سے مسکرایا، اونٹ کی مہار کو جھٹکا دیتے ہوئے بولا--- ''ہاں، پہلے تھا مگر اب نہیں ہوں۔ یہ کام چھوڑ دیا--- برا کام تھا، جان ہر وقت سولی پر لٹکی رہتی تھی--- شاہ لطیف m کے کلام نے میرے دل کی دنیا بدل دی''۔

میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ''شاہ کا کلام اُن کے دل کی دنیا کیوں نہیں بدلتا---''

''یہ توفیق کی بات ہے---'' وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''جسے ہدایت مل جائے وہ پا لیتا ہے، جسے توفیق نہیں ہوتی وہ کسی بات پر کان نہیں دھرتا--- اچھا، اب ہم گوٹھ سجاول کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ لمبا فاصلہ ہو گیا ہے، کرایہ اب زیادہ دینا---''

''کتنے---؟''

''چلو، تم پچاس اور دے دینا—'' علی بخش نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ''خرچہ پانی تمہارا ہے۔ میں تمہیں ہائی وے تک چھوڑ کر آؤں گا، راستے میں شاید ہی کوئی سواری ملے اس لیے کہہ رہا ہوں ورنہ مجھے لالچ کوئی نہیں ہے—''

یہ کہہ کر اس نے پھر کان پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں دوہڑے گانے شروع کیے، بعد میں اس نے تصحیح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ دوہڑے نہیں، کافیاں تھیں۔ بابا فرید اور شاہ لطیف اپنی کافیوں کے لیے مشہور تھے۔ یہ اللہ والے لوگ خدا ہی کے نہیں، انسانوں کے بھی پیارے تھے۔ اپنی زندگی میں بھی اور اپنے وصال کے بعد بھی— ان جیسے بزرگوں نے ہند اور سندھ میں فروغ اسلام کے لیے بہت کاوشیں کی تھیں، انہی کی پاکیزہ کوششوں کی وجہ سے سندھ میں ہندومت کا زور ٹوٹا اور اسلام کا اجالا پھیلا۔

ناشتے میں ہم نے ایک ایک اُبلا ہوا انڈا اور چائے کی ایک ایک پیالی پی تھی۔ اب گوٹھ سجاول بھی قریب آ رہا تھا اور بھوک بھی شدید لگ رہی تھی۔ گوٹھ سجاول سے سپر ہائی وے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا لہٰذا گوٹھ کے بازار میں ہم کھانے کے لیے رک گئے۔ کھانا کھا کر جب روانہ ہوئے تو غنودگی سی آنے لگی، علی بخش بھی اونگھنے لگا مگر وہ ماہر ساربان تھا، کیا مجال کہ راستے سے بھٹک جائے۔ یہ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت ڈھائی گھنٹے میں طے ہوئی کیونکہ بارش نے تمام ممکنہ راستے توڑ پھوڑ دیے تھے، ہم نیشنل ہائی وے کے جس حصے میں جا کر نکلے وہ نسبتاً سنسان اور ویران تھا، سڑک بمشکل اتنی چوڑی تھی کہ دو ٹرک ساتھ ساتھ چل سکیں۔ یہاں پہنچ کر علی بخش نے اونٹ بٹھا کر مجھے اتار دیا۔ میں نے کرایہ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ وہ کہنے لگا۔

''تم سڑک کی ویرانی سے پریشان مت ہونا۔ یہ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف کراچی ہے۔ تم دوسری طرف سے جو بھی گاڑی یا ٹرک گزرے، ہاتھ دے کر اور کرایہ طے کر کے بیٹھ جانا، سیدھے کراچی پہنچ جاؤ گے— اچھا، خدا حافظ!''

یہ کہہ کر اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور منہ سے ''ٹٹ، ٹٹ'' کی آواز نکالتا ہوا اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد یک لخت مجھے تنہائی اور بے بسی کا احساس ہوا۔ ایک تیز رفتار بس میرے قریب سے اس طرح گزری کہ اگر میں فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اس کے پہیوں کی لپیٹ میں آ جاتا۔ پھر ایک ٹرک گزرا، ایک لمبی سی کار فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئی۔ آخر ایک بڑی سی بس قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے دو سواریاں اتریں میں لپک کر قریب گیا۔

''کراچی جانا ہے—''

''ایئر کنڈیشن بس ہے میری سرکار—!'' کنڈیکٹر جو دروازے میں کھڑا تھا، ہاتھ پھیلا کر مجھے روکتے ہوئے بولا۔ ''کرایہ عام بس سے ڈبل ہے، بعد میں اڑی نہ کرنا—''

میں اچھل کر بس میں سوار ہو گیا۔ کنڈیکٹر نے ایک آرام دہ خالی سیٹ تک میری رہنمائی کی پھر اتنا کرایہ مانگا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑنے لگے۔ جو کچھ جمع پونجی تھی، میں نے اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''یہ تو بہت ہی کم ہے—'' وہ خستہ بوسیدہ میلے میلے نوٹ گنتے ہوئے بولا۔ ''— بہت ہی کم میری سرکار اتنے میں آپ کراچی نہیں جا سکتے۔''

میں نے چادر سے اپنا پسینہ پونچھا--- شاید دس بارہ روپے اب میرے پاس بچے تھے اور کراچی میرے لیے اجنبی دنیا تھی۔ وہاں نہ کوئی رشتہ دار تھا، نہ دوست، نہ ہمدم، نہ ہمدرد--- ان دس بارہ باقی ماندہ روپوں میں مجھے سیٹھ اور بس تک پہنچنا تھا۔ میری لجاجت آمیز صورت دیکھ کر کنڈیکٹر کو کچھ رحم آ گیا، منہ ہی منہ میں کنگال اور مفلس مسافروں کو برا بھلا کہتا ہوا وہ ڈرائیور کی سیٹ کی طرف چلا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ لوگ نہ سوچتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں اور بس منہ اٹھا کر ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں کو ہاتھ دے دیتے ہیں۔ پھر جب کرایہ مانگو تو ان کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہ ٹوٹی پھوٹی کھٹارہ گاڑیوں میں سفر کرنے والے کیا جانیں کہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑیاں کیا ہوتی ہیں؟--- میں نے تھوڑی دیر بعد اپنی قمیض کے نیچے کپڑے کی صدری کی جیب ٹٹول کر انگوٹھی کی سختی اور چند نوٹوں کی نرمی محسوس کی اور اطمینان سے آنکھیں موند کر گردن نرم سیٹ کے پیچھے ٹیک دی۔

O

بس کراچی کے ایک بارونق بازار میں پہنچ کر رک گئی، سواریاں اترنے لگیں۔ ایسا آرام دہ سفر زندگی میں پہلی مرتبہ کیا تھا اس لیے مجھے راستے میں خوب نیند آئی، ساری تھکن دور ہو گئی--- بس سے نکلا تو ایک نئی ہنگامہ خیز، پُر رونق، گونجتی، فرائے بھرتی، قہقہے لگاتی اور شور مچاتی دنیا میرے سامنے تھی۔ یہ کراچی میرے بچپن کے اس کراچی سے بالکل مختلف تھا جہاں میں ایک بار بابا کے ساتھ وڈیرا سائیں کی شہر والی کوٹھی میں ان کے کسی کام سے آیا تھا۔ اب نہ مجھے وہ راستے یاد تھے، نہ گلیاں، نہ سڑکیں اور نہ ان کے نام، نہ نشانیاں، نہ علامتیں، سب کچھ بدل چکا تھا۔ سائٹ ایریا کا جو پتہ مجھے صدیق عامر نے ذہین نشین کرایا تھا وہ ایک راہ گیر سے میں نے کاغذ پر لکھوا کر اس سے معلوم کر لیا تھا کہ کون سی بس مجھے وہاں تک پہنچائے گی۔ راہ گیر بھلا مانس پڑھا لکھا آدمی تھا، اس نے پان کی پیک ایک طرف تھوکتے ہوئے منہ پونچھ کر پہلے تو میرے بتائے ہوئے پتے میں انگریزی الفاظ کی تصحیح کی پھر مجھے ایک بس پر سوار کروا کے کنڈیکٹر کو ہدایت کر دی کہ ان بھائی صاحب کو وہاں اتار دینا جہاں سے سائٹ کی طرف جانے والی بسیں آسانی سے مل جاتی ہیں--- مختلف پُر رونق علاقوں سے گزر کر بس جب ایک بڑے چوراہے پر پہنچی تو کنڈیکٹر نے سامنے کے بس اسٹاپ کی طرف اشارہ کیا،

''وہاں سے جائے گی میاں جی، تمہاری بس---''

میں نے اسے کرایہ دینا چاہا لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا۔

''وہ بھائی صاحب دے گئے ہیں میاں جی، تمہارا کرایہ--- اب اللہ کا نام لو اور سڑک پار کر کے سامنے والے سٹاپ سے بس پکڑ لو---''

مگر سڑک پار کرنا میرے لیے قیامت سے کم نہیں تھا، دائیں بائیں سے گاڑیوں کا ریلا بہتا ہوا آ رہا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی ٹریفک نہیں رکتی تھی، رکتی تھی تو گاڑیاں آپس میں اس طرح جڑ کر کھڑی ہو جاتی تھیں کہ اجنبی راہ گیر کے لیے ان کے درمیان سے راستہ نکال کر سڑک پار کرنا بے حد مشکل تھا۔ ایک چھوٹی سی بچی نے میرا بازو پکڑ کر تیزی سے مجھے سڑک پار کرائی اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''انکل! آپ تو بچوں کی طرح ڈرتے ہیں--- مجھے دیکھیں، میں دن میں کئی بار سڑک پار کرتی ہوں اور ایک بار بھی نہیں ڈرتی---''

میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر یونہی پوچھ لیا۔

''کیا نام ہے تمہارا---؟''

شاہینہ ---!'' اس نے کہا اور اچھلتی ہوئی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد سائٹ کی مطلوبہ بس آ گئی۔ کنڈیکٹر کو میں نے راہ گیر کے ہاتھ سے لکھا ہوا پتہ دکھایا تو اس نے سر ہلا کر ایک ٹکٹ کاٹ کر میری جھولی میں ڈال دیا۔ بولا۔

''چار روپے نکالو میری جان! --- تم آخری سٹاپ سے ایک سٹاپ پہلے اتر جانا، وہی تمہاری منزل ہے ---''

بس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی، لوگ کھچا کھچ بس میں بھرے ہوئے تھے اور اسی بھیڑ میں مجھے بھی بمشکل کھڑے ہونے کی جگہ ملی تھی۔ ایک بزرگ چشمہ لگائے، شیروانی پہنے، بغل میں کئی رجسٹر دابے میرے قریب کھڑے تھے، میری اور کنڈیکٹر کی گفتگو سن کر بولے۔

''میاں! فکر مت کیجئے، اسی اسٹاپ پر مجھے اترنا ہے بلکہ اسی جگہ جانا ہے۔ جہاں آپ جائیں گے۔ میرے ساتھ چلئے گا --- لیکن میاں! معاف کیجئے گا، آپ کو ادریس گروپ آف انڈسٹریز سے کیا کام پڑ گیا؟ --- وہاں تو میاں، پیشگی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا''۔

میں نے کہا۔'' ہے ایک ضروری کام ---'' بڑے میاں چشمے کے پیچھے سے مجھے گھورتے ہوئے بولے۔'' میاں! وضع قطع سے تو آپ مجھے کوئی بزنس مین لگتے نہیں --- کہاں سے آئے ہیں؟''

''بڑی دور سے ---'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کتنی دور سے میاں؟'' شیروانی والے بزرگ کو کریدی سی لگ گئی۔'' آخر پتہ تو چلے، آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، لاتعلقی سے کھڑکیوں سے باہر تیزی سے گزرنے والی سائٹ ایریا کی چمنیاں دیکھتا رہا۔ مطلوبہ سٹاپ پر پہنچ کر بس رکی تو بڑے میاں نے میرا بازو پکڑ لیا، تقریباً کھینچتے ہوئے بولے۔

''آیئے میاں! میرے ساتھ آیئے ---''

مجھے بُرا تو لگا لیکن اس جگہ تک پہنچنے کے لئے ظاہر ہے، کسی نہ کسی کی مدد ضروری تھی اور یہ مدد بن مانگے مجھے مل گئی تھی --- بعد میں معلوم ہوا کہ بڑے میاں ادریس گروپ آف انڈسٹریز کے اکاؤنٹس سیکشن میں تھے۔ ان کی مدد سے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن جب ان کے دفتر میں پہنچ کر میں نے انہیں بتایا کہ میں فوری طور پر سیٹھ ادریس سے ملنا چاہتا ہوں تو بڑے میاں کے اچھے بھلے سنجیدہ چہرے پر طنز کی لکیریں سی ابھر آئیں، لہجہ تمسخر آمیز ہو گیا۔ میرا نام وہ راستے ہی میں پوچھ چکے تھے --- بولے۔

''میاں نبی بخش جنگی صاحب! پتہ نہیں آپ جنگی ہیں یا خانہ جنگی ہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ اس حلئے میں آپ کبھی سیٹھ صاحب سے نہیں مل سکتے۔ ان کے چپڑاسیوں کی وردی بھی آپ کے اس لباس سے ہزار درجے بہتر ہو گی''۔

اب مجھے سچ مچ غصہ آ گیا۔ وڈیروں اور جاگیرداروں کی چاکری کرتے کرتے میرے اندر ایک تندخو اور منہ زور وحشی پیدا ہو گیا تھا جو کسی اور کی بات برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے کہا۔'' بڑے میاں! منہ سنبھال کے بات کرو --- میں جس کام سے آیا ہوں وہ تمہارے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا''۔

یہ کہہ کر مین پلٹا اور تیزی سے ایک بڑے سے شیشے کے دروازے والے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں دو تین میزیں سے لگی تھیں اور ان پر انٹر کام اور ٹیلی فون رکھے تھے۔ دو تین مرد اور لڑکیاں سر جھکائے کام میں مصروف تھیں۔

''مجھے فوراً سیٹھ ادریس صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''سب کام چھوڑ کر مجھے سیٹھ ادریس سے ملاؤ۔۔۔''

سب نے چونک کر سر اٹھا کر مجھے دیکھا، میری وضع قطع دیکھ کر پہلے تو انہیں ہنسی آئی پھر میرا تن وتوش اور تیور دیکھ کر جلد ہی انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایک لڑکی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو باس سے کس سلسلے میں ملنا ہے۔۔۔''

''یہ میں خود انہیں بتاؤں گا۔۔۔'' میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ ''دیر مت کرو، فوراً ملاؤ مجھے۔۔۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے''۔

اتنے میں اکاؤنٹس سیکشن والے بڑے میاں اندر آ گئے، کہنے لگے۔

''یہ صاحب بس میں میرے ساتھ تھے۔ وہاں انہوں نے صرف دفتر کا نام لیا تھا، یہاں آتے ہی پھیل گئے کہ سیٹھ صاحب سے ملوں گا۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے؟''

میں نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے بڑے میاں کو گھورا اور چیخ کر کہا۔ ''بند کرو اپنا منہ، ورنہ۔۔۔''

ایک لڑکی نے میز کے نیچے لگا ہوا حفاظتی بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اونچے قد کا ایک سیکورٹی گارڈ بندوق ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا بندوق کی نال کا رخ اس نے میری طرف کر دیا۔

''سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔۔۔'' اس نے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاتھ اوپر اٹھا لو اور الٹے پیروں پیچھے آؤ۔۔۔''

میں نے گردن گھمائی۔ سیکورٹی گارڈ چوکس تھا، بندوق کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اس نے ٹرائیگر پر انگلی رکھ دی تھی لہٰذا تعمیل کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، باہر آ کر اس نے مجھے گھومنے کا حکم دیا۔ اب میں اس کے سامنے تھا۔ دوسرا سیکورٹی گارڈ پھرتی سے ایک طرف سے نمودار ہوا اور اس نے پیچھے سے مجھے دبوچ لیا مگر وہ جسمانی طور پر کمزور تھا۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں اسے سر سے اچھال کر پہلے سیکورٹی گارڈ پر پھینک دیا۔ دونوں ٹکرا کر بری طرح گرے اور اس کشمکش میں بندوق چل گئی۔ گولی دھماکے سے شیشے کے سلائیڈنگ ڈور پر پڑی اور اس میں سوراخ کرتی، لکیروں کا جال بنتی چھت میں لگی سبز ٹیوب پر پڑی۔ شیشے کی کرچیاں چھن چھنا کے فرش پر گریں، دونوں سیکورٹی گارڈ پھرتی سے اٹھ بیٹھے۔ اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ نشانہ لے کر مجھ پر فائر کرتے، تین اور سیکورٹی گارڈ برآمدے میں نمودار ہوئے اور پھرتی سے انہوں نے مجھے جکڑ لیا۔ اس ہنگامے میں میرے ہونٹ پھٹ گئے، قمیض چیتھڑے ہو گئی اور ہونٹوں سے بہنے والا خون ٹھوڑی سے ہو کر سینے پر پھیل گیا۔ گارڈ نے مجھے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ میرے لیے سانس لینا محال تھا۔ وہ تربیت یافتہ تھے اور اس قسم کے ہنگاموں سے نمٹنا بخوبی جانتے تھے۔ جبکہ میرے لیے اس قسم کی صورتحال زندگی کا پہلا تجربہ تھی۔ پھر وہ مجھے کھینچتے ہوئے گارڈ روم میں لے آئے یہاں لا کر انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ تین چار مزید گارڈ جو وردی میں نہیں تھے لیکن مسلح تھے، میرے اردگرد حصار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔۔۔ سیٹھ صاحب کو ہنگامے کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ میری جامہ تلاشی لی جانے لگی انگوٹھی اور چند نوٹوں

کے علاوہ میرے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ گارڈ روم کے انٹرکام پر سیٹھ اور لیس کے سیکرٹری نے مسلسل رابطہ قائم کر رکھا تھا، چیف سیکورٹی گارڈ مدھم لہجے میں اسے کچھ بتا رہا تھا۔ جب اچھی طرح میری جامہ تلاشی لی جا چکی تو اس نے انٹرکام پر کچھ کہا، جواباً اسے حکم دیا گیا کہ وہ گارڈ کی حفاظت میں مجھے اندر بھیج دے۔ دو مضبوط سیکورٹی گارڈز نے دائیں بائیں مجھے بازوؤں سے پکڑا، ایک نے عقب سے مجھے بندوق سے کور کیا پھر وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر ایک طویل کاریڈور میں داخل ہوئے۔ اس کی دیواریں اور فرش ساگوان کی لکڑی کے تھے اور فرش پر بھورے رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ کئی راہداریوں سے گزر کے ہم شیشے کے دروازے والے ایک کمرے تک پہنچے۔ اس کے باہر سٹول پر ایک باوردی سیکورٹی گارڈ موجود تھا۔ ہم دروازے کے قریب پہنچے تو خود بخود دونوں پٹ کھلتے چلے گئے۔ اس کمرے کے عقب میں ایک اور کمرہ تھا جو نسبتاً چھوٹا تھا اور اس کی دیواروں میں فائلوں کے شیلف بنے ہوئے تھے، گھومنے والی ایک آرام دہ کرسی پر گنجے سر کا ایک پستہ قد بھاری جسم والا شخص بادامی سوٹ میں ملبوس سامنے کئی ٹیلی فون اور فائلیں پھیلائے بیٹھا تھا اور غالباً یہی سیٹھ اور لیس تھا۔

''سلام علیکم سیٹھ صاحب---!'' میں نے گوٹھ کے روائتی انداز ہاتھ جوڑ کر اسے سلام کیا۔ ''آپ کے آدمیوں نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اب انہیں یہاں سے ہٹائیں۔ میں آپ کے لیے ایک بہت ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔''

بادامی سوٹ والے نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا، پھر کہنے لگا۔

''تم کہاں سے آئے ہو، کیا پیغام لائے ہو، مجھے بتاؤ۔ تمہارا پیغام اسی وقت سیٹھ اور لیس تک پہنچ جائے گا۔''

''نہیں---'' میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں صرف سیٹھ اور لیس سے بات کروں گا--- خدا کے لیے مجھے اُن سے ملا دو۔ دیر مت کرو، ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ میں نے اس کی خاطر اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔''

بادامی سوٹ والا جو سیٹھ اور لیس کا پرائیوٹ سیکرٹری تھا، بدستور خالی خالی نظروں سے مجھے گھورتا رہا البتہ اس نے ریسیور اٹھا کر بہت مدھم انداز میں کسی سے کوئی بات کی پھر ریسیور اس نے کریڈل پر رکھ دیا۔

''ٹھیک ہے---'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ، میرے ساتھ---''

ہم اس کمرے سے باہر نکل کر ساتھ والے بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ یہاں ایک اور سیکورٹی گارڈ تعینات تھا جو حد درجہ پھرتیلا اور چاق و چوبند تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے بڑے سے خوبصورت لش لش چمکتے ہوئے چوبی دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی اور دروازہ کھول کر ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ سب سے پہلے پرائیویٹ سیکرٹری، پھر ایک سیکورٹی گارڈ، اس کے پیچھے میں اور میرے دائیں بائیں دونوں سیکورٹی گارڈ اندر داخل ہوئے۔ یہ خاصا طویل و عریض کمرہ تھا اور کمرہ کیا تھا، کسی شاہی محل کا دفتر تھا۔ اونچی اونچی محرابی کھڑکیوں پر لمبے لمبے ہلکے رنگوں کے پھولدار پردے لٹک رہے تھے، پورا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف تھا جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ ایک جہازی سائز کی میز کے پیچھے ایک بھاری بھرکم سانولے رنگ کا شخص بیٹھا تھا جس کے جسم پر ریشمی کُرتا اور قیمتی واسکٹ تھی، واسکٹ کی، جیب سے ایک سنہری زنجیر دائرہ سا بناتی ہوئی جھول رہی تھی--- یہی سیٹھ اور لیس تھا۔

''بیٹھ جاؤ—'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔

میں لرزتا ہوا ایک انتہائی خوبصورت کرسی پر بیٹھ گیا۔ گارڈ میرے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے، پرائیوٹ سیکرٹری میز کے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

کون ہو تم—؟'' سیٹھ نے گونجدار لہجے میں پوچھا۔

''میں— میں—'' میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن پھٹے ہوئے ہونٹ سے بہنے والے خون نے ہونٹ چپکا دیے۔ چادر سے میں نے اپنے ہونٹ پونچھے، سیکرٹری اور گارڈ کی طرف دیکھا۔ ''سیٹھ صاحب! ان کے سامنے میں بات نہیں کرسکتا—''

سیٹھ نے ایک لمحے کے لیے غور سے مجھے دیکھا، نظروں ہی نظروں میں مجھے تولا اور پھر آنکھ سے اشارہ کیا۔ تینوں گارڈ اور سیکرٹری خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

''ہاں، اب بتاؤ—'' سیٹھ نے میز پر کہنیاں ٹکا کر قدرے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''تم کون ہو اور اس طرح کیوں میرے پاس آئے ہو—؟''

''میں صدیق عامر کے پاس سے آیا ہوں سیٹھ—'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''آپ کے بیٹے صدیق عامر کے پاس سے—''

''کیا—؟'' سیٹھ جیسے اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ ''کیا کہا تم نے— میرے بیٹے کا نام لیا تم نے؟''

''ہاں، آپ کے بیٹے کا—!'' میں نے چہرے کو چادر سے پونچھتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے وہ—؟'' سیٹھ تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''کہاں ہے وہ— جلدی بتاؤ مجھے؟''

اب بازی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے فوراً جواب دینے کی بجائے اطمینان سے کہا۔

''اس بات کے پانچ لاکھ طے ہوئے تھے۔ پھر آپ کے بیٹے نے یہ سودا میری مرضی پر چھوڑ دیا لہٰذا اس میں دو لاکھ کا اضافہ اور کرلیں۔''

''لعنت بھیجو—'' سیٹھ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ''میرے نزدیک پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، مجھے اپنے بیٹے کا پتا چاہیے—''

میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے، میں کہا۔ ''پتہ بتانے کی قیمت میں نے آپ کو بتادی ہے— میں نے اس کام کے لیے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگادی ہے۔ اس طرح آسانی سے میں کیسے پتہ بتا سکتا ہوں؟''

''تم ڈاکو— بلیک میلر—!'' سیٹھ دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''تم— تم لوگ پھانسی پر لٹکا دینے کے قابل ہو، تمہیں شوٹ کر دینا چاہیے۔ تم لوگوں نے مجھے جس ذہنی اور قلبی اذیت میں مبتلا کیا ہے اس کے ایک ایک پل کا حساب تم سے لیا جائے گا، تڑپا تڑپا کے ماروں گا''۔

میں نے بگڑ کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''دیکھو، سیٹھ!— نہ میں ڈاکو ہوں، نہ چور ہوں، ایک غریب آدمی ہوں۔ میرے باپ دادے نے کبھی چوری نہیں کی، کسی کا حق نہیں چھینا، کسی کو تکلیف نہیں دی پھر تم مجھے ایسی گالی کیوں دے رہے ہو؟— میں تمہارے بیٹے کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ میرے والد تمہیں میری خبر پاکر منہ مانگا انعام دیں گے۔ میں نے اس لالچ میں اپنے مالکوں سے غداری کی ورنہ اتنی دور آنے اور اتنی تکلیف برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

سیٹھ غور سے میری باتیں سن رہا تھا، ایک ایک لفظ تول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں میرے سینے کو کھنگال رہی تھیں۔۔۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہا پھر اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑ گئے۔

''بیٹھ جاؤ۔۔۔'' وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میرے بیٹے نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ اس کی کمٹ منٹ ہے اور باپ کی حیثیت سے اسے پورا کرنا میرا فرض ہے لیکن پہلے مجھے پوری بات بتاؤ۔۔۔''

میں نے گوٹھ صادق کی پوری روداد اس کے گوش گزار کر دی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھتا اور سب کچھ سنتا رہا۔ پھر اس نے ریسیور اٹھا کر سیکرٹری سے کسی کا نمبر ملانے کا کہا اور تھوڑی دیر کے بعد کسی اہم شخصیت سے بات کرنے لگا۔ پھر اس نے دو تین جگہ اور بات کی، اس کے بعد گھنٹی بجا کر اس نے گارڈ کو اندر بلایا۔۔۔ میں نے اس کے بیٹے کی انگوٹھی پہلے ہی اس کے سپرد کر دی تھی۔

''انہیں سیکرٹری صاحب کے پاس لے جاؤ۔۔۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ ہمارے مہمان ہیں''۔

''مگر سائیں، سیٹھ صاحب۔۔۔!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے واپس جانا ہے۔۔۔ جو بات آپ سے طے ہوئی ہے۔ اسے پورا کریں اور مجھے فارغ کریں۔''

''فارغ بھی کر دیں گے''۔ سیٹھ اپنے بیٹے کی انگوٹھی واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن جب تک پولیس مکمل طور پر او کے رپورٹ نہیں دیتی، تم ہمارے مہمان رہو گے۔''

''سیٹھ صاحب۔۔۔!'' میں چیخ پڑا۔ ''میرے بوڑھے ماں باپ ہیں، میری عدم موجودگی میں ان پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ وڈیرا جلال دین میری گمشدگی کا سارا قصور ان کے سر پر ڈال دے گا۔۔۔ آپ نہیں جانتے، وہ بہت ظالم انسان ہے۔ اسے کسی پر ترس نہیں آتا۔۔۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا''۔ وہ اپنا بریف کیس سیکورٹی گارڈ کو پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے ایک ذمہ دار شخص ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے بدلے تمہیں انعام ملے گا، سزا نہیں، لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب میرا کام بن جائے گا۔۔۔ میں نے سیکرٹری کو سمجھا دیا ہے۔ تمہاری رہائش، خوراک اور جیب خرچ کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ اب تم جا کر سیکرٹری سے ملو۔۔۔ جاؤ شاباش، گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

سیکورٹی گارڈ مجھے سیکرٹری کے کمرے میں لے آیا۔ سیکرٹری، سیٹھ کو رخصت کرنے کے لیے باہر نکل آیا تھا۔ جب اس کو گاڑی میں سوار کر کے واپس آیا تو اس کا رویہ بدلا ہوا تھا، اب اس کے ہونٹوں پر ایک دوستانہ مگر عیار مسکراہٹ تھی۔

''تم ہمارے ریذیڈینشل ایریا کے ایک گیسٹ روم میں ٹھہرو گے۔'' اس نے بتایا''۔ گارڈ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھیں گے۔ گیسٹ روم سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ گارڈز کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ ایسی کسی بھی کوشش کی صورت میں فوراً تمہیں گولی مار دیں۔۔۔ تمہیں اچھا کھانا اور اچھا لباس ملے گا، جیب خرچ کے لیے ہر صبح ایک ہزار روپے ملیں گے مگر تم انہیں گیسٹ روم سے فارغ ہونے کے بعد خرچ کر سکو گے، ظاہر ہے کہ اس سے پہلے ایسا ممکن نہیں۔۔۔''

O

اس دوران دو سیکورٹی گارڈ ہمارے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے لیکن اس مرتبہ ان کا انداز نرم اور مفاہمانہ تھا، غالباً انہیں بطور خاص اس کی ہدایت کی گئی تھی۔ پھر گارڈز ایک گاڑی میں مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ یہ ایک بند گاڑی تھی لہٰذا اطراف کا علاقہ، عمارتیں اور سڑکیں مجھے نظر نہ آسکیں— گاڑی خاصی دیر چلتی رہی۔ پھر ایک کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔ ڈرائیور نے باہر سے آ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور ہم نیچے اترے۔ یہ ایک نئی تعمیر شدہ کوٹھی تھی کیونکہ ڈرم، لوہے کے گاڈر، شہتیر اور ریت بجری پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں دو گارڈ پہلے سے موجود تھے جنہوں نے میرے ساتھ آنے والے گارڈ کے علاوہ مجھ سے بھی ہاتھ ملائے البتہ ان کے چہرے سپاٹ تھے اور ان پر نرمی یا سختی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ ملگجے سے کپڑوں میں ملبوس ایک بوڑھا سا آدمی اور اس کی جوان بیٹی کوٹھی سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔

''یہ باورچی اور اس کی بیٹی نوشین ہیں—''

میرے ساتھ آنے والے اس گارڈ نے بتایا جس نے گاڑی میں سفر کے دوران اشرف کے نام سے اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ ان دونوں نے قریب آ کر مجھے غور سے دیکھا، بوڑھے نے جھکتے ہوئے مجھ سے اور گارڈ سے مصافحہ کیا اور پھر دونوں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

''سرفراز علی—!'' گارڈ اشرف نے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے مہمان کا خیال رکھنا، یہ سیٹھ صاحب کا حکم ہے—''

''جی، بہت بہتر—!'' بوڑھے نے سر کے ہلکے سے خم کے ساتھ جواب دیا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ پندرہ برس سے اس خاندان کا خادم ہوں، مجھے کچھ سمجھانے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے— آپ نے سمجھا دیا ہے تو مزید خیال رکھوں گا—''

غیر ارادی طور پر میری نظر لڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کی سانولے رنگ اور تیکھے نقوش والی ایک پُرکشش دوشیزہ تھی اور کسی بھی طرح باورچی سرفراز علی کی بیٹی نہیں لگتی تھی— گارڈ مجھے وہ کمرہ دکھانے لے گئے جہاں مجھے گیسٹ کی حیثیت سے ایک غیر معینہ مدت تک رہنا تھا۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس کے دو حصے تھے جو پارٹیشن کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ ایک حصے میں خوبصورت ڈبل بیڈ، ٹیلی ویژن، صوفے اور ایک بڑا سا ریفریجریٹر رکھا تھا اور دوسرا حصہ ڈائننگ روم کے انداز میں سجایا گیا تھا۔ ڈبل بیڈ کے نزدیک ایک خوبصورت شیلف کے نیچے وی سی آر اور اوپر کئی نئی اور پرانی فلموں کے کیسٹ رکھے ہوئے تھے، ان تمام چیزوں کے استعمال کے بارے میں کوٹھی کے دونوں گارڈ نے مجھے بتایا۔ بیڈ روم کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھا جس میں خوبصورت ٹب اور دیواروں میں چمکدار ٹائلیں لگی ہوئی تھیں، ہر شے سے امارت ٹپکتی تھی۔ ایک گارڈ نے کمرے کا عقبی دروازہ کھول کر دیکھا اور بولا۔

''یہاں سے کوئی نکلنا چاہے بھی تو آسانی سے نہیں نکل سکتا—''

اس کمرے کے عقبی دروازے کے باہر بیس فٹ اونچی دیوار احاطے کی دیوار کے طور پر چاروں طرف گھومتی گئی تھی۔ میں نے جھانک کر اردگرد کا جائزہ لینا چاہا اسی وقت اگر گارڈ مجھے پیچھے نہ کھینچ لیتا تو طویل زنجیر سے بندھا ہوا ایک خونخوار چیتا میرے پرخچے اُڑا دیتا، اسے بطور خاص باندھا گیا تھا— میں نے حویلی میں ایک سے ایک خونخوار کتے دیکھے تھے جنہیں دیکھ کر دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے لیکن کسی گھر میں حفاظت کے لیے چیتا پہلی بار دیکھا تھا۔ چیتا دروازے کے پاس بندھا ہوا تھا اور اس کی زنجیر خاصی مضبوط اور لمبی تھی۔ وہ کسی لمحے دروازے کے اندر

بھی آسکتا تھا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نوشین کمرے میں داخل ہوئی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی چیتے کی طرف بڑھی، پھر اپنی گداز ہتھیلی آگے بڑھا دی۔ چیتے نے زبان نکالی اور اس کی ہتھیلی چاٹنے لگا۔ نوشین نے اس کے گلے میں بندھی ہوئی زنجیر ٹھیک کی، سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے سیڑھیوں کی طرف دھکیل دیا۔ چیتا کسی سدھائے ہوئے کتے کی طرح چپ چاپ دور جا کر بیٹھ گیا— سرفراز علی بھی بڑی محبت بھری نظروں سے ایک طرف کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، کہنے لگا۔

''نوشین نے اسے بچپن سے پالا ہے، یہ اس کی گود میں کھیلتا رہا ہے۔ اگر اسے ایک دن نہ دیکھے تو آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے— کسی اور شخص کو یہ نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا۔ آپ یہ دروازہ بند ہی رکھا کریں، یہ ٹائیگر آپ کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے''۔

ایک گارڈ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔''— سرفراز بابا ٹھیک کہتے ہیں، آپ یہ دروازہ کبھی نہ کھولیں اور جب کھولنا ہو تو نوشین کو بلائیں۔ یہ لوگ ساتھ ہی سرونٹ کوارٹر میں رہتے ہیں۔ آپ کے ڈائننگ روم کا دروازہ جو باہر کی طرف کھلتا ہے، اس کے عین سامنے ان کا کوارٹر ہے مگر آپ کے آنے کے بعد یہ دروازہ اندر سے نہیں، باہر سے بند ہوا کرے گا''

پھر انہوں نے مجھے وہ دروازہ کھول کر دکھایا۔ اس کے عین سامنے سرفراز علی کا سرونٹ کوارٹر تھا مگر ایسا خوبصورت کہ چھوٹا سا بنگلہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی دیواریں چھ فٹ اونچی تھیں اور ان سے اندر کا سرسبز لان اور برآمدہ نظر آ رہا تھا، لان میں دو کرسیاں اور ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ سرونٹ کوارٹرز کی روایات کے بالکل برعکس اس چھوٹے سے گھر کا ایک ہلکے سبز رنگ کا چوبی گیٹ بھی تھا— دونوں سیکورٹی گارڈ کوٹھی میں ڈیوٹی پر تھے، ان کے نام امجد اور ایوب تھے۔ امجد گٹھیلے جسم کا مضبوط ادھیڑ عمر آدمی تھا جبکہ ایوب بے حد دبلا پتلا مگر انتہائی پھرتیلا نوجوان تھا البتہ چہرے دونوں کے سپاٹ اور ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھے— رات کو گارڈ امجد کے ساتھ سرفراز علی اور نوشین کھانا لے کر آئے اور ہم نے چاروں نے ڈائننگ ٹیبل پر اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پھر ریفریجریٹر سے آئس کریم نکال کر کھائی گئی۔ وہ سب میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے تھے لیکن سیٹھ ادریس نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں اپنے بارے میں کسی کو اس کے سوا اور کوئی بات نہ بتاؤں کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں دور دراز کے ایک گاؤں سے آیا ہوں اور جب تک میرا کام نہیں ہو جاتا، مجھے یہیں ٹھہرنا ہے— نوشین نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہڈ کاٹھ سے تو آپ بڑے مضبوط لگتے ہیں، شاید آپ کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک—؟''

میں انکار میں سر ہلا کر ہنس پڑا، پھر میں نے کہا۔''میں نے تو بعض ایسے شادی شدہ لوگ بھی دیکھے ہیں جو ہڈ کاٹھ کے معاملے میں مجھ سے زیادہ مضبوط ہیں— کیوں امجد چاچا؟''

گارڈ امجد کے ہونٹوں پر اپنی تعریف سن کر مسکراہٹ بکھر گئی، کہنے لگا۔''اچھے جسم کو بنانا مشکل ہے لیکن ایک دفعہ بن جائے تو شادی شدہ یا غیر شادی شدہ سے فرق نہیں پڑتا—''

کھانے کے بعد انہوں نے برتن سمیٹے اور خدا حافظ، شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گئے۔ امجد ان کے ساتھ ڈائننگ روم کے دروازے کی طرف گیا، یہ دروازہ انہوں نے باہر سے بند کر دیا۔ پھر امجد دوسرے دروازے سے نکلتے ہوئے بولا۔

''نبی بخش جنگی! ایک بات یاد رکھنا، رات کو باہر مت نکلنا۔ ہر چیز تمہارے کمرے میں موجود ہے--- ساری رات دو گارڈ بھری ہوئی رائفلوں کے ساتھ یہاں پہرہ دیتے ہیں۔اس تاکید کی خلاف ورزی کرو گے تو اپنی جان کے نقصان کے خود ذمہ دار ہو گے--- شب بخیر!''

اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی--- دن کو مجھے وی سی آر اور ٹیلی ویژن آن کرنے کا طریقہ بتا دیا گیا تھا، نیند نہیں آ رہی تھی لہٰذا دل بہلانے کے لیے میں نے ایک فلم کا کیسٹ لگا دیا۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آنے لگی۔ ایسی غنودگی طاری تھی کہ مجھے ٹی وی آف کرنے اور بتیاں بجھانے کا خیال ہی نہیں آیا اور آیا بھی تو سستی طاری ہو گئی۔ جلد ہی میرے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے--- ٹی وی پوری آواز سے چل رہا تھا، ساری بتیاں روشن تھیں کہ یکا یک رات کے کسی پہر کھٹا کھٹ سب بتیاں بجھ گئیں، ٹی وی آف ہو گیا۔ اس لمحے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ایک دودھیا بلب ابھی جل رہا تھا اور نوشین بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ کر قرینے سے ایک طرف رکھ رہی تھی۔ وال کلاک رات کے دو بجنے کا اعلان کر رہا تھا--- رات کے دو بجے اجنبی شہر، ایک اجنبی مقام پر ایک اجنبی دوشیزہ میرے آرام کا خیال رکھنے کے لیے ٹی وی آف کرنے اور بتیاں بجھانے میرے کمرے میں تنہا آئی تھی۔ اس کے گداز جسم کا ہیولہ کسی بھی ہوش مند انسان کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے کھلے کھلے بالوں اور لباس سے ایسی مسحور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی کہ کمرہ مہک اٹھا تھا۔

''اوہ--- جاگ گئے؟'' اس نے خفت آمیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سوری!''

میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اتنے نرم، آرام دہ گدیلے اور پُرسکون بیڈ پر زندگی میں پہلی بار لیٹنے کا میں نے لطف اٹھایا تھا۔

''دراصل میں ٹائیگر کو راتب دینے نکلی تھی۔'' وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آج شام کو اسے راتب دینا میں بھول گئی تھی، اچانک سوتے سوتے خیال آیا تو اُٹھ بیٹھی--- باہر آ کر دیکھا آپ کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور پوری آواز سے ٹی وی چل رہا تھا--- دراصل مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی---''

''پوچھیں---'' میں نے اسے پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے خوبصورت کمرے اور ایسی تنہائی میں ایک اتنی حسین دوشیزہ کی قربت نصیب ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر میں سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔

''آپ---'' وہ کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''سچ بتائیں کہ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، سیٹھ صاحب کو کس طرح جانتے ہیں اور یہاں کب تک ٹھہریں گے---''

جس والہانہ انداز میں اس نے مجھ سے یہ سوالات پوچھے تھے، جی تو چاہتا تھا کہ ساری روداد سنا دوں لیکن پھر پہلے ہی دن سب کچھ اگل دینا مجھے اچھا نہیں لگا لہٰذا اسے خوبصورتی سے ٹالنے کی کوشش کی۔

''میں بہت دور کے ایک گاؤں سے آیا ہوں۔ سیٹھ صاحب کے پاس مجھے کسی نے بھیجا ہے، ان کا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ جس روز وہ کام ہو جائے گا، میں چلا جاؤں گا۔''

''چلے جائیں گے---؟'' اس نے رُک رُک کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسے اچھے انسان روز روز تو نہیں آتے--- کیوں

چلے جائیں گے آپ؟''

اس کے لہجے میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ میرے اندر کی برف پگھلنے لگی، اس کے قریب بیٹھنے کو جی چاہا اور صرف چاہا ہی نہیں، سچ مچ میں ہپناٹائز ہو کر اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھا۔ اس نے اچانک اٹھ کر کمرے کا واحد بلب گل کر دیا اور سرگوشی میں بولی۔

''کمرے میں لائٹ دیکھ کر کوئی بھی گارڈ کھڑکی سے ہمیں چیک کر سکتا ہے — اب ہم اطمینان سے بیٹھیں گے اور باتیں کریں گے''۔

مگر یہ باتیں ہونٹوں سے نہیں ہوئیں کسی بھلے سمجھدار آدمی نے کہا ہے کہ ہونٹ چپ رہتے ہیں۔ مگر ہاتھ باتیں کرتے ہیں۔

کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر غیر ارادی طور پر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے خلاف توقع ہاتھ چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی — میرے گوٹھ کے تجربات اس سے بالکل مختلف تھے۔ وہاں جس کا بھی ہاتھ پکڑا، وہ ہاتھ چھڑا کر انگوٹھا دکھاتی ہوئی قلانچیں بھرتی ہوئی بھاگ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دیہاتوں میں محبت پاکیزہ تعلق کو کہتے ہیں، اس میں جسمانی ربط ایک گناہ کے مترادف ہے جبکہ شہروں میں بعض لوگ ایسا نہیں سوچتے۔ شاید ان کے نزدیک محبت تمام تر مراحل سے گزرنے کا نام ہو یا کم از کم نوشین کے معاملے میں مجھے یہی احساس ہوا۔ نوشین دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔ ''آپ کی بھولی بھالی صورت اور خوبصورت جسم دیکھ کر پہلی مرتبہ میں یہی سمجھی کہ آپ کسی فلم کے ایکٹر ہیں، لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا فلموں سے دور کا بھی تعلق نہیں تو پتہ نہیں مجھے کیوں مایوسی ہوئی — آپ کو تو فلموں میں ہونا چاہیے تھا، ہے نا؟''

وہ اپنے سوال کی تصدیق بھی مجھ سے مانگ رہی تھی۔ میں اس وقت جیسے آسمانوں پر اُڑ رہا تھا، نشے میں ڈول رہا تھا۔ میرے اندر کا وحشی مرد بیدار ہو گیا تھا — مجھے شہری زندگی کے رسم و رواج اور آداب نہیں آتے تھے۔ ایک دوشیزہ آدھی رات کو خود میرے کمرے میں چل کر آئی تھی اور خود اس نے میرے کمرے کی بتیاں بجھائی تھیں، خود میرے وجود میں آگ لگا دی تھی لہٰذا اب صبر اور برداشت کا میرے پاس کیا جواز تھا — میں والہانہ سرشاری کے عالم میں اس کی طرف جھکا۔ میرے بازوؤں نے ٹٹول کر اس کے جسم کے گرد حصار قائم کیا، میرے مضبوط بازوؤں کا حصار سخت ہو گیا — اسی لمحے باہر پے در پے دو فائر ہوئے اور وہ تڑپ کر میری آغوش سے نکل گئی۔

پھرتی کے ساتھ اس نے دروازے کی طرف زقند لگائی اور بڑی احتیاط اور تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ پھر اس کی ڈانٹتی ہوئی آواز برآمدے میں گونجی۔

''کون ہے — کون ہے، کیا معاملہ ہے — گولی کس نے چلائی ہے؟''

O

میں حیران رہ گیا — رات کے پچھلے پہر ایک خاموش کوٹھی میں دو فائر ہوئے تھے اور ایک تن تنہا دوشیزہ بڑے نڈر اور پُراعتماد لہجے میں باہر نکل کر فائرنگ کی وجہ دریافت کر رہی تھی — گارڈ امجد کی آواز آئی۔

''اوہ، بی بی! — کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اشرف رائفل چیک کر رہا تھا، اتفاقاً ٹریگر دب گیا —''

پھر اشرف کی آواز دور سے نزدیک آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے، میں رائفل چیک کر رہا تھا---''

نوشین نے تیز تحکمانہ لہجے میں کہا۔''آدھی رات کو اس طرح رائفل چیک کرنے کا کیا مطلب ہے؟ فائر کی آواز سے پولیس کا کوئی موبائل اسکواڈ ادھر متوجہ ہو سکتا ہے، بنگلے کی تلاشی لی جا سکتی ہے--- خیر، چیک پوسٹ پر جاؤ۔ صبح بات کریں گے---'' پھر اس نے میری کھڑکی کے قریب آ کر اونچی آواز میں کہا۔''نبی بخش جنگی! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ رائفل چیک ہو رہی تھی، اتفاقیہ گولی چل گئی--- آرام سے سو جاؤ، صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی''۔

پھر ان تینوں کے بولنے کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو گئیں، کوئی فقرہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا البتہ نوشین کی آواز میں تحکمانہ دبدبہ تھا اور اس کی آواز ان دونوں کی آواز پر حاوی معلوم ہو رہی تھی۔ دروازہ وہ باہر سے بند کر گئی تھی۔ میں اس کمرے کا قیدی تھا اور ویسے بھی قیدی تھا، ایک اجنبی شہر میں آدھی رات کو ہونے والے کسی بھی واقعے کے بارے میں کچھ جاننے یا کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر، آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گزرے ہوئے تمام واقعات باری باری ذہن کی اسکرین پر چمکنے اور دھندلانے لگے۔ سب سے زیادہ مجھے ماں اور بابا کی طرف سے تشویش تھی۔ میں وڈیرے کی ذہنیت سے اچھی طرح آگاہ تھا، مجھے معلوم تھا کہ میری گمشدگی زیادہ دیر تک بہانوں کے ذریعے ٹالی نہیں جا سکے گی لیکن تشدد کے باوجود وڈیرا میرے والدین سے کچھ اگلوا نہیں سکے گا کیونکہ میرے والدین اس سے زیادہ اور کچھ بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ میں ان کے پاس سے صبح ہی صبح گوٹھ قاسم علی جانے کے لیے نکلا تھا جہاں مجھے فضل داد سے رقم لینی تھی۔ وڈیرا اپنے ذرائع سے فضل داد، ساربان اور دیگر رابطوں کی کڑیاں جوڑ کر بالآخر میرے کراچی پہنچنے تک کی معلومات حاصل کر سکتا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کراچی میں کہاں اور کس کے پاس کس مقصد سے گیا ہوں؟--- رہائی کا یہ احساس ایک لمحے کے لیے میرا من شانت کر گیا۔ اب میں وڈیرے اور اس کی رسائی سے بہت دور تھا۔ اس کی غلامی کو گوٹھ صادق علی میں چھوڑ کر اب میں ایک ایسا شہر جس میں کسی کو ڈھونڈنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا--- یہ شہر مجھے بنا بھی سکتا تھا، بگاڑ بھی سکتا تھا۔ میں نے صدیق عامر کی بات مان کر اپنی زندگی کا سب سے بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ گوٹھ قاسم علی سے کراچی تک ایک ایک پل اور ایک ایک لمحہ میں نے سولی پر گزارا، ہر ساعت یہی گمان ہوتا کہ ابھی وڈیرے کے آدمی کہیں سے نمودار ہوں گے اور مجھ پر دھاوا بول کر اپنی حراست میں لے لیں گے۔ تمام سفر میں میری حالت اس خرگوش جیسی تھی جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوئے ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ گمشدگی کی اطلاع پھیلنے سے پہلے میں کراچی پہنچ گیا تھا۔ لیکن سیٹھ کے بیٹے صدیق عامر کا لہجہ اتنا ٹھوس اور سچا تھا کہ مجھے یقین کامل تھا کہ کراچی پہنچتے ہی مجھے رقم مل جائے گی۔ اس رقم کے حصول تک میں نے سوچا تھا۔ میں نے چھوٹے موٹے گھر اور کاروبار کی بابت سوچ تو لیا تھا لیکن کیسا گھر اور کیسا کاروبار؟--- اس کی بابت سوچنے کا واضح شعور بھی نہیں تھا، تجربہ بھی نہیں تھا۔ پانچ سات لاکھ روپے تو میرے خواب میں بھی نہیں آئے تھے۔ صدیق عامر کے منہ سے اتنی بڑی رقم کی پیش کش نے میرے اندر انقلاب بپا کر دیا تھا اور اس کی کشش اور قوت نے مجھے کراچی پہنچا دیا تھا لیکن کراچی پہنچ کر میرے ساتھ جو کچھ بیت رہی تھی وہ میرے لیے حد درجہ ناقابلِ فہم تھی۔ اول تو صدیق عامر نے اشارتاً بھی اس بات کا ذکر نہیں

کیا تھا کہ سیٹھ اور لیس اس کی رہائی تک مجھے یرغمال بنائے رکھے گا، اگر ذرا سا بھی مجھے اس بات کا شبہ ہوتا تو اس معاملے پر مزید غور کرتا اور بہت ممکن ہے کہ اس کام میں ہاتھ نہ ڈالتا لیکن سیٹھ کی قید جتنی پُر آسائش تھی، میرے لیے اتنی ہی حیران کن بھی تھی۔ مجھے قیدی ہی بنانا مقصود ہوتا تو وہ اپنے کسی بھی گارڈ کے کمرے میں مجھے بند کر کے مجھ پر پہرہ بٹھا سکتا تھا، مجھے اذیتیں دے کر معلوم کر سکتا تھا کہ میرے اور اس کے بیٹے کو اغوا کرنے والے کی کوئی چال تو نہیں ہے لیکن اس نے ایکس ریز نظروں سے مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر کسی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر یہ تاثر دیا تھا جیسے اس نے میری تمام باتوں کو سچ مان لیا ہے اور سچ مان کر ہی میرے لیے اتنی پُرتعیش رہائش کا بندوبست کیا ہے اور مجھے اپنا قیدی نما مہمان بنا لیا ہے لیکن کئی باتیں میرے لیے شدید الجھن کا باعث تھیں۔ مثلاً نوشین، سرفراز علی اور چیتا— گارڈ نے بتایا تھا کہ نوشین، سرفراز علی کی بیٹی ہے لیکن وہ چہرے مہرے چال ڈھال سے اس کی بیٹی نہیں لگتی تھی۔ اس کوٹھی میں جو شاید ابھی زیرِتعمیر تھی، چیتا لا کر باندھنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر یہ سیٹھ اور لیس کا پالتو تھا تو اسے سیٹھ کے بنگلے پر ہونا چاہئے تھا، یہاں رکھنے کا کیا جواز تھا؟— پھر چیتے کے ساتھ نوشین کے اتنے مانوس ہونے کی وجہ بھی میرے لیے الجھن کا باعث تھی۔ اگر وہ باورچی کی بیٹی تھی تو سیٹھ کے گارڈز کے ساتھ اس کا لہجہ تحکمانہ کیوں تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کس لیے اتنی رات گئے میرے کمرے میں آئی تھی؟— یہ اور اس جیسے بے شمار سوالات تھے جن کے گرداب میں ڈوبتے ابھرتے بالآخر مجھے نیند آ گئی۔

O

صبح جب میری آنکھ کھلی تو اچھا خاصا دن نکل آیا تھا، باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور میرے کمرے کے دوسرے حصے میں جو ڈائننگ اور ڈرائنگ روم کے انداز میں سجا ہوا تھا، میز پر ناشتے کے برتن سجے ہوئے تھے۔ میں نے تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر منہ دھویا۔ پھر تھوڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا کہ کوئی آ جائے تو ناشتہ کروں اور دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں دریافت کروں۔ جب کوئی نہیں آیا تو میں کرسی کھینچ کر ناشتے کے لیے بیٹھ گیا۔ گوٹھ میں کبھی مجھے رات کے سالن اور باسی روٹی یا لسی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا، یہاں میز پر ناشتے کے اتنے لوازمات تھے کہ مجھے وڈیرے کے ناشتے کی میز یاد آ گئی۔ وہ بھی انگریزی انداز میں میز کرسی پر بیٹھ کر ایسی ہی لذیذ چیزوں کا ناشتہ کرتا تھا۔ جب مجھے آملیٹ، ٹوسٹ، سلائس، بٹر، چیز، کارن فلیکس ہنی، جیم اور دوسری چیزوں کی بابت معلوم ہوا اور ان کے نام زبان پر رواں ہو گئے تو ان کے استعمال میں بھی لطف آنے لگا— میں ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ نوشین اندر آ گئی۔

گہرے جامنی رنگ کے کڑھے ہوئے کُرتے شلوار میں کھلے کھلے بالوں کے ساتھ اتنی نکھری نکھری لگ رہی تھی کہ میں نے ناشتے سے ہاتھ روک لیا، ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کرسی کھینچ کر میز کی دوسری طرف بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی۔ مجھے اپنی طرف ہونقوں کی طرح متوجہ پا کر وہ کھلکھلا کر ہنسی، پھر کہنے لگی۔

''اس طرح گھور کر مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟— میں رات والی نوشین ہی تو ہوں—''

میں جھینپ سا گیا، کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کہوں؟— نوشین نے اشارے سے مجھے ناشتے کی میز کی طرف متوجہ کیا، پھر پوچھنے لگی۔

''تمہاری شکل بتاتی ہے کہ رات بھر جاگتے رہے ہو اور سوچتے رہے ہو— تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ وہ کون سا کام ہے جس کی خاطر اتنی دور سے چل کر آئے ہو— مجھ سے بھی چھپاؤ گے؟''

اس ''مجھ سے بھی'' کی ادائیگی میں جو رس اور رچاؤ تھا، اس نے مجھے کیف و سرور کے ایسے عالم میں پہنچا دیا جہاں میرے منہ سے پوری بات نکل سکتی تھی لیکن اسی لمحے میں نے جھرجھری لے کر خود پر قابو پالیا، سیٹھ ادریس کی ہدایت یاد آ گئی۔ میں نے قدرے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''چھپانے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں سیٹھ صاحب کے کام سے آیا ہوں، جس روز کام ختم ہو جائے گا تو وہ مجھے رخصت کر دیں گے۔''

''وہی تو میں پوچھ رہی ہوں—'' نوشین نے کہا۔ ''آخر وہ ایسا کون سا کام ہے جسے تم اتنا چھپا رہے ہو—؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''آخر کیوں—؟'' اُس نے اصرار کیا۔ ''بات کیا ہے کچھ پتہ تو چلے—''

''یہ بات آپ سیٹھ سے ہی پوچھیں—'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''سیٹھ صاحب کے کام سیٹھ صاحب ہی بتا سکتے ہیں، میرے جیسا چھوٹا آدمی نہیں بتا سکتا—''

اس نے یکلخت میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، کہنے لگی۔ ''جنگی! مجھے اپنا دوست سمجھو۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے، مجھے صاف بتا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری بتائی باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گی کسی کو— مجھ پر پورا اعتماد رکھو۔'' پھر وہ میز کے دوسری طرف سے قدرے جھک کر بولی۔ ''دیکھو، جنگی! مجھے غلط نہ سمجھنا— میرے بابا خاصے عرصے سے سیٹھ کے ملازم ہیں، ہزاروں لوگوں کا سیٹھ سے واسطہ پڑتا ہے مگر میں نے کسی شخص میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ تم واحد آدمی ہو جسے دیکھ کر جانے کیوں مجھے سب کچھ جاننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں تمہارے بارے میں کہ کہاں سے آئے ہو، کس کام سے آئے ہو— بتاؤ نا! مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔''

پھر اس نے اپنائیت اور نسائیت کی نرمی اور گرمی سے میرے ہاتھ پر اپنے نرم و گداز ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں، لقمے حلق میں پھنسنے لگے— خاصی دیر یہ کیفیت رہی۔ وہ اصرار کرتی رہی، میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ بالآخر وہ روٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر کے بعد ادھیڑ عمر گارڈ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گن کر مجھے ایک ہزار روپے دیئے، یہ سو سو روپے کے نوٹوں کی شکل میں تھے۔ پھر اس نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ جی ایم صاحب نے بھیجے ہیں اور کہا ہے احتیاط سے رکھو، کام ختم ہونے کے بعد جب تم یہاں سے جاؤ گے تو اپنی مرضی سے خرچ کرنا۔ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے اور اس کی رسید بھی تم سے نہیں لی جائے گی—''

میں نے نوٹ تو لے لیے لیکن پوچھ لیا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی—'' گارڈ نے میری طرف سپاٹ نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ بولا نہیں، غالباً سوال و جواب سے بچنا چاہتا تھا میں نے پھر کہا۔ ''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ رات تو میں نے اپنے کمرے میں بند ہو کر گزار لی، دن کو کیا کروں—''

''اپنے کمرے میں ہی رہو۔۔۔'' گارڈ نے خشک لہجے میں کہا۔ ''کمرے سے باہر نکلنے کی بابت سوچنا بھی مت، نہ رات کو اور نہ دن کو۔۔۔ ہمیں آرڈر ملا ہے کہ اگر تم دن یا رات کو کسی بھی وقت اپنے کمرے سے باہر پائے جاؤ تو تمہیں گولی ماردیں۔۔۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے کندھے سے لٹکنے والی کلاشنکوف تھپتھپائی اور کمرے سے نکل کر دروازہ باہر سے بند کردیا۔ پھر وہ گھوم کر کھڑکی کی طرف آیا۔ اس کھڑکی پر باہر سے لوہے کی آرائشی اور مضبوط جالی لگی ہوئی تھی اور اس کے فریم میں پھولدار دھندلے شیشے استعمال کیے گئے تھے، وہاں پہنچ کر بلند آواز میں اس نے کہا۔

''نبی بخش جنگی! اگر کمرے کا دروازہ کھلا بھی رہے تب بھی تم اس کے قریب نہیں آؤ گے۔ ہم ڈیوٹی کے پابند ہیں اور بات کرنے کے لیے بندوق کی زبان استعمال کرتے ہیں۔۔۔''

O

دوپہر کو سرفراز علی کھانا لے کر آیا اور خاموشی سے رکھ کر چلا گیا، نوشین نہیں آئی۔۔۔ رات کا کھانا گارڈ اشرف لے کر آیا اور ہم دونوں نے اکٹھے کھایا۔ غالباً گارڈز کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ذاتی موضوعات پر بالکل بات نہ کریں اور بات چیت کو صرف کھانے پینے اور موسم کے موضوعات تک محدود رکھیں۔ شام کی چائے پر تھوڑی دیر کے لیے نوشین کی جھلک نظر آئی پھر وہ غائب ہوگئی۔ میں اس کے رویے کو سمجھنے سے قاصر تھا، آخر وہ بغیر کسی تعلق کے کسی اجنبی سے کیونکر یہ توقع رکھتی تھی کہ وہ اپنے رازوں میں اسے شریک کرلے؟ یہ تو ناقابلِ فہم بات تھی کہ وہ پہلی ہی نظر میں میری محبت کی اسیر ہوگئی ہو۔ ایسا تو گوٹھ میں بھی کبھی نہیں ہوتا تھا، یہ تو پھر شہر تھا اور شہر بھی اتنا بڑا شہر۔۔۔ صبح سے شام اور پھر رات کا پہلا حصہ میں نے کمرے میں ٹہلتے، وی سی آر پر فلمیں دیکھتے اور ریفریجریٹر سے کھانے پینے کی مختلف چیزیں نکال کر کھاتے ہوئے بڑی بیزاری سے گزارا۔ گارڈز نے مجھے وی سی آر آن اور آف کرنے کا طریقہ سمجھا دیا تھا لہٰذا اس میں کوئی دشواری مجھے پیش نہیں آئی۔ حالانکہ کمرے میں ٹیلی فون کے علاوہ دنیا کی ہر شے جس کی ضرورت ایک تنہا آدمی کو پڑ سکتی تھی، موجود تھی، لیکن قید یا پابندی کی اذیت بھی اس آسائش میں شامل تھی لہٰذا ان سے اس طرح لطف اندوز ہونا ممکن نہیں تھا جس طرح ایک آزاد آدمی ہوسکتا ہے۔۔۔ گارڈ نے رات کے کھانے کے بعد جاتے جاتے ایک پیش کش کی۔

''اگر نیند نہ آئے تو نیند کی گولی مل سکتی ہے، صرف ایک۔۔۔ اور اگر فلموں کی ضرورت ہو تو جتنی چاہو، مل سکتی ہیں۔''

میں نے کبھی نیند کی گولی استعمال نہیں کی تھی البتہ تنہائی اور قید کا احساس رفع کرنے کے لیے کسی دلچسپ مشغلے کی ضرورت تھی جس کا سب سے آسان حل وڈیو فلمیں تھیں لہٰذا میں نے گارڈ سے مزید کیسٹ منگوا لیے۔ پھر کچھ دیر تک ایک فلم دیکھتا رہا اور اس کے بعد وی سی آر آف کرکے سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ تھوڑی دیر بعد اچانک نوشین کمرے میں آجائے گی مگر رات کے ساتھ ساتھ یہ امید دم توڑتی گئی اور نوشین نہیں آئی۔

صبح ناشتے کے ساتھ سرفراز علی چند نئے گارڈ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ تین گارڈز تھے۔ چہرے مہرے سے حد درجہ کرخت اور خونخوار۔ نرمی اور شائستگی کا ان کے چہرے پر نام و نشان تک نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ بھی نہیں ملایا بس تیز، چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا

اور سر ہلا کر باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے سرفراز سے پاچھا۔

''بابا! وہ اشرف اور امجد چاچا نظر نہیں آ رہے ہیں، کہاں چلے گئے—؟''

''ان کی ڈیوٹی کہیں اور لگ گئی ہے۔'' سرفراز علی نے سرسری انداز میں کہا۔

''آپ کے چیتے کی آواز بھی نہیں آ رہی ہے—؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''چیتے کو اس کی ٹرینر کے ساتھ بلوا لیا گیا ہے—''

''کہاں—؟'' میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' پہلی بار سرفراز علی نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''مالکان جس طرح اپنا انتظام بہتر سمجھتے ہیں، کرتے ہیں، ہمیں یا تمہیں یا کسی بھی شخص کو بیچ میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟— خاموشی سے اپنا وقت گزارو— اور سنو!'' وہ میرے قریب آ کر تیز سرگوشی میں بولا۔ ''بہت زیادہ سوالات کرنے کی ضرورت نہیں، کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ یہ تمہارے حق میں بھی بہتر ہے اور دوسروں کے حق میں بھی—''

ناشتے کی چیزیں میز پر سجا کر وہ چلا گیا، جاتے جاتے اس نے معمول کے مطابق باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

O

میرے تین چار دن ایسے بے کیف اور بدمزہ گزرے کہ انہیں یاد کر کر کے ایک عرصہ تک مجھ پر مایوسی، پژمردگی اور اضمحلال طاری ہوتا رہا۔ ناشتہ، کھانا، چائے، رات کا کھانا، وڈیو فلمیں، کمرے میں چہل قدمی، روزانہ بلا ناغہ بغیر کسی رسید کے ایک ہزار روپے نقد، تھوڑی بہت گارڈز اور سرفراز علی کی رسمی سی گفتگو اکھڑے اکھڑے سے انداز میں اور بس!— یہ تھے میرے شب و روز— نوشین سے اگرچہ میرا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس کے غائب ہونے سے یکا یک پورا ماحول بوجھل اور بے رنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس قید میں ایک جوان آدمی کے لیے تمام تر آسائشیں میسر ہونے کے باوجود کون سی کشش تھی؟— ایک نوشین تھی جس کے لمس کی نرمی اور گرمی میرے مسامات سے ہو کر جسم اور دل کے نہاں خانوں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ دھیمی دھیمی سی نامانوس آنچ دھیرے دھیرے دماغ تک پہنچ کر ایک واضح بے چینی میں ڈھل رہی تھی، ہر صبح میں سرفراز علی اور گارڈز سے باری باری پوچھتا تھا کہ کب تک مجھے اس کمرے میں قید رہنا پڑے گا۔ اور ہر بار ایک ہی جواب ملتا کہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے— تنگ آ کر میں نے کہنا شروع کیا کہ مجھے سیٹھ ادریس سے ملواؤ۔ اس کے جواب وہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیتے، کبھی کہتے کہ وہ حد درجہ مصروف ہیں، وقت آنے پر وہ خود ہی ملاقات کے لیے وقت دیں گے۔ اس ٹال مٹول میں چار پانچ دن بیت گئے۔ میری بے چینی اور اضطراب انتہا کو پہنچ گیا تھا— گارڈ کے ہمراہ سرفراز علی پانچویں دن جب ناشتہ لے کر آیا تو میری قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے چیخ کر کہا۔

''سنو، میری بات سنو!— بہت برداشت کر لیا ہے میں نے، مجھے فوراً سیٹھ ادریس سے ملواؤ۔ اگر ابھی اور اسی وقت تم نے مجھے سیٹھ ادریس سے نہ ملوایا تو میں ساری پابندیاں توڑ کر یہاں سے نکل جاؤں گا— میں نے کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا، کوئی جرم نہیں کیا، کوئی شخص مجھے قید

کر کے نہیں رکھ سکتا۔۔۔ میں ناشتہ نہیں کروں گا۔۔۔ مجھے سیٹھ سے ملواؤ، ابھی اور اسی وقت۔۔۔"

"دیکھو۔۔۔!" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اگر تم نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے، ہمیں یہی آرڈر ملا ہے اس کے علاوہ ہم دوسری کوئی بات نہیں جانتے۔"

غصے کے مارے میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔۔۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"میں کئی بار تم لوگوں کے منہ سے گولی مارنے کی بات سن چکا ہوں۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ گولی اور بندوق میرے لیے نئی چیز نہیں ہے۔ اگر مجھے آج اور اسی وقت سیٹھ سے ملوانے کا بندوبست نہ کیا گیا تو پھر میں دیکھوں گا کہ مجھے گولی کون مارتا ہے اور میرے ہاتھوں سے کس طرح بچتا ہے۔۔۔"

گارڈز کے تیور ایسے تھے گویا وہ اچانک مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور مار مار کر مجھے ادھ موا کر دیں گے لیکن انہوں نے خلاف توقع ایک قدم بھی میری طرف نہیں بڑھایا، صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک گارڈ نے کہا۔

"تم ناشتہ کرو۔۔۔ ہم فون پر سیٹھ صاحب سے رابطہ کرتے ہیں۔"

میں نے ناشتہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، سختی سے برتن ایک طرف دھکیل دیئے۔۔۔ گارڈ باہر نکل گئے۔ سرفراز علی کچھ دیر کھڑا مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر وہ بھی چلا گیا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد ایک گارڈ نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ سیٹھ صاحب نے ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی ہے، شام کو وہ خود یہاں آئیں گے اور تم سے ملیں گے۔ یہ خوشخبری میرے لیے غیر متوقع تھی اور حیران کن تھی کہ مارے خوشی کے میرا انگ انگ ناچ اٹھا۔ میں نے لپک کر گارڈ کو گلے لیا، اس کا ماتھا چوم لیا، میری اس والہانہ خوشی پر اس کے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، سپاٹ کا سپاٹ رہا البتہ اس نے زور سے مجھے دھکا دے کر پرے ہٹانے کی بجائے نرمی اور آہستگی سے جدا کیا۔

"اب تم اطمینان سے ناشتہ کرو، کھانا کھاؤ، اور شام کا انتظار کرو۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

O

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب مجھے شام کا اتنی شدت سے انتظار رہا۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل میرے لیے گزارنا مشکل ہو گیا۔ میں ٹہل ٹہل کے وقت گزارتا رہا، گھڑی دیکھتا رہا۔۔۔ ناشتے پر حسب معمول مجھے ایک ہزار روپے دیئے گئے تھے۔ ان روپوں کو پہلے سے ملی ہوئی رقم میں شامل کر کے میں بار بار گنتا رہا کہ شاید اسی طرح کچھ وقت گزر جائے، کئی مرتبہ میں نے گنتی کی۔ یہ پانچ ہزار روپے تھے، سو سو روپے کے لال نوٹوں کی شکل میں۔۔۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے وقت گزارنے کے لیے ان نوٹوں سے کھیل بنا لیا بچوں جیسا، انہیں کمرے کے فرش پر قطاروں کی صورت میں بچھایا۔ پھر ان سے چوکور اور مستطیل شکلیں بنانے لگا۔ کبھی ایک دوسرے سے الگ رکھ کر انہیں اس طرح پھیلایا کہ سڑکیں سی بن گئیں۔ پھر انہیں تکونی شکل میں آگے پیچھے رکھ دیا۔ یہ سب کچھ کرتے کرتے دل اکتایا تو وی سی آر چلا دیا، فلم دیکھنے لگا۔ اتفاقاً یہ فلم کچھ کچھ میرے جیسے سر پھرے آدمی کی کہانی پر مبنی تھی، دیکھنے بیٹھا تو دیکھتا چلا گیا، دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا اور چونکا اس وقت جب ایک گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔

چند لمحوں تک وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے دروازہ کھول کر تعظیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔ سیٹھ ادریس بھاری قدموں سے اندر داخل ہوا مگر یہ کیا؟— یہ سیٹھ ادریس تو اس بارعب سیٹھ ادریس سے بہت مختلف لگ رہا تھا جسے میں نے پانچ دن پہلے اس کے دفتر میں دیکھا تھا۔ یہ سیٹھ ادریس تو بہت بجھا بجھا، اجڑا اجڑا شخص لگ رہا تھا۔ تھکا تھکا اُداس اُداس— میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سیٹھ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ گردن گھما کر اس نے گارڈ کو طرف دیکھا تو گارڈ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں تک صبر آزما خاموشی طاری رہی پھر اس خاموشی کو سیٹھ ادریس کی گھمبیر اور تھکی تھکی سی آواز نے توڑ دیا۔

''نبی بخش جنگی تمہاری اطلاع ٹھیک تھی—''

''شکر ہے، آپ کو میری سچائی کا ثبوت مل گیا—'' میرے منہ سے اطمینان بھری ٹھنڈی سانس نکلی۔

''تمہاری سچائی کا ثبوت میرا مسئلہ نہیں تھا—'' اس نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔ ''میرا مسئلہ اسے بحفاظت واپس لانا تھا لیکن—''

''لیکن کیا—؟'' میں نے گھبرا کر اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ اپنے بیٹے کو واپس نہیں لائے؟''

''نہیں—'' سیٹھ نے اسی لہجے میں کہا۔ ''چھاپہ مار پارٹی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میرے بیٹے کو غائب کر دیا گیا۔ میں نے پولیس اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں کی مدد سے گوٹھ صادق علی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حویلی کی تلاشی اور چپہ چپہ چھاننے کی کوشش کی لیکن کچھ برآمد نہیں ہوا۔ جلال الدین نے اس بارے میں قطعی لاعلمی ظاہر کی ہے لیکن تفتیش کے سلسلے میں ہر قسم کے تعاون کا وعدہ کیا ہے—''

''جلال دین نے وعدہ کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا— ''اور آپ نے اس کے وعدے پر یقین کر لیا—؟''

چند لمحوں تک وہ خاموشی سے دیوار پر لگی ہوئی پینٹنگ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

''میں نے ڈاگ ہاؤس کے نیچے اس تہہ خانے میں بھی پولیس اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ اتر کر دیکھا ہے۔ وہاں فرش پر سوکھی گھاس اور جھاڑیوں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا، بظاہر ایسا لگتا تھا کہ برسوں سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ ہم نے لیڈی پولیس کے ذریعے حویلی کے زنان خانے کے بھی تمام کمرے، گودام، غسل خانے اور اوطاق چیک کروا لیے۔ کہیں بھی ایسے آثار نہیں ملے جن سے معلوم ہوتا کہ میرے بیٹے کو وہاں لایا گیا ہوگا۔ حویلی کی تلاشی کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کا چونکہ تم سے کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا ان کی تفصیلات کا کوئی فائدہ نہیں۔ انتظامیہ اور پولیس کی اعلیٰ سطح پر میرے مراسم نہ ہوتے تو تلاشی تو درکنار، گوٹھ محمد صادق میں داخلہ بھی ممکن نہیں تھا— میرا دل گواہی دیتا ہے کہ صدیق عامر زندہ ہے اور اسے اسی علاقے میں کہیں چھپایا گیا ہے۔ جب وہ غائب ہوا تھا تو اس کی پہلی گمشدگی کے تیسرے دن سے فون پر اغوا کرنے والوں نے ہم سے مسلسل رابطہ قائم رکھا تھا، وہ تاوان کی بھاری رقم مانگ رہے تھے مجھے یہ رقم ادا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صدیق عامر میرا اکلوتا بیٹا ہے لیکن میں ان لوگوں تک پہنچنا چاہتا تھا جنہوں نے اسے اغوا کیا تھا— بہرحال، چھوڑو یہ باتیں، معاملہ اونچی سطح پر پہنچنے کے بعد الجھ جاتا ہے۔ میں اسے نچلی سطح پر حل کرنا چاہتا ہوں، اسی لیے تمہارا پیغام موصول ہوتے ہی میں خود چل کر تمہارے پاس آ گیا ہوں—''

میں گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنا دولت مند اور اثر و رسوخ رکھنے والا صنعت کار ایک وڈیرے کے معمولی ملازم کے سامنے وضاحتیں پیش کر رہا تھا۔

''تم میرے کام آسکتے ہو۔۔۔'' سیٹھ نے مجھے خاموش پا کر کہا۔ ''اس گوٹھ کے چپے چپے سے تم پوری طرح واقف ہو، وہاں جا کر تم آسانی سے صدیق عامر کا سراغ لگا کر مجھے مطلع کر سکتے ہو۔ اس سلسلے میں تمہیں کئی ضروری سہولتیں میں فوری طور پر فراہم کر سکتا ہوں۔ یہ سب کام انتہائی خاموشی سے ہوگا۔ اس کے علاوہ۔۔۔'' سیٹھ نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''اس کے علاوہ میں تمہیں اس سے کہیں زائد رقم دوں گا جس کا وعدہ میرے بیٹے نے تم سے کیا تھا اور اگر تم اسے خود بحفاظت کراچی لے آنے کا وعدہ کرو تو میں یہ رقم دگنی کر دوں گا''۔

خون میری رگوں میں تیزی سے گردش کر رہا تھا، سیٹھ کی باتیں مجھے ہواؤں میں اونچے سے اونچا اڑا رہی تھیں لیکن میں اپنا گوٹھ چھوڑ آیا تھا، اپنی کشتیاں جلا آیا تھا۔ اب وہاں جانا میرے لیے ناممکن تھا اب میری زندگی کے نقشے سے گوٹھ صادق علی نکل چکا تھا۔ یہی بات میں نے سیٹھ ادریس سے کہی لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہا۔

''تمہیں آج رات میں اپنے گوٹھ کے لیے روانہ ہونا ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میرا ڈرائیور تمہیں نیشنل ہائی وے کے اس مقام تک چھوڑ آئے گا جہاں سے گوٹھ صادق علی کے لئے بسیں اور سواریاں مل جاتے ہیں۔'' پھر وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا، کہنے لگا۔ ''اب تم تیار ہو جاؤ، ڈرائیور آئے گا اور تمہیں لے جائے گا۔۔۔ اپنا شناختی کارڈ مجھے دو۔۔۔''

میں نے حیرت سے سیٹھ ادریس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے کمرے میں آمد کے وقت رنج و غم کی تصویر بنا ہوا تھا اب سپاٹ اور بے تاثر تھا۔

''شناختی کارڈ مجھے دے دو۔'' اس نے دہرایا۔

قومی شناختی کارڈ میری جیب میں تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں شناختی کارڈ اس کے حوالے کروں یا نہ کروں؟

''آپ اس کارڈ کا کیا کریں گے؟'' بالآخر میں نے تذبذب کے عالم میں پوچھا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے''۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم کارڈ میرے حوالے کرو۔''

میں نے حیرت اور تذبذب کے عالم میں کارڈ جیب سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے جھپٹ کر کارڈ لیا، غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''ڈرائیور کے آنے تک تم اس پروگرام کے ہر پہلو پر غور کرو اور ذہنی طور پر خود کو سفر کے لیے تیار کر لو۔۔۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

O

سیٹھ کے جانے کے بعد میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔۔۔ میری مثال دن بھر جلتے ہوئے صحرا میں ننگے پاؤں سفر کرنے والے اس مسافر جیسی تھی جو رات آنے کے بعد سوچتا ہے کہ اگلی صبح جب وہ سو کر اٹھے گا تو صحرا ختم ہو چکا ہوگا لیکن جب سورج کی تیز شعاعوں سے اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وسیع و عریض صحرا کی تمازت اور تنہائی اس کی امیدوں کا خون کر دیتی ہے۔ میں گوٹھ صادق علی سے سہانے سپنے لے کر نکلا تھا۔ میں نے خاندانی غلامی کی

زنجیریں توڑ دی تھیں، غلامی کی روایات کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اور حالات ایک بار پھر مجھے شیر کی کچھار میں واپس لے جا رہے تھے جہاں بدترین موت اور اذیت ناک ذلتیں میری منتظر تھیں۔ میں ایک شخص کی غلامی کے حلقے سے نکل کر دوسرے شخص کی غلامی کے حصار میں آ گیا تھا اور صرف جگہ بدلی تھی، نام اور چہرے تبدیل ہوئے تھے — یکا یک جیسے میرے اندر سے کسی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''نبی بخش جنگی! اس معاملے سے خود کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ الگ کر لو۔ زندگی کی بساط پر تمہاری حیثیت صرف ایک عام مہرے کی نہیں رہنی چاہیے، اس کھیل کو طول دینے کی بجائے اسے ختم کر دو — گوٹھ پہنچ کر اپنے غائب ہونے کے بارے میں کوئی معقول سا بہانہ گھڑ کے جلال دین سے معافی مانگ لو یا پھر راستے ہی سے کہیں غائب ہو جاؤ — جب سیٹھ اپنے بیٹے کا سراغ نہ لگا سکا تو تم اکیلے آدمی کیا کرو گے —؟'' یکا یک دو گارڈ کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ اس نے مختلف زاویوں سے میری تصویریں اتارنی شروع کر دیں، دوسرا گارڈ خاموش اور لاتعلق کھڑا دیکھتا رہا۔ میں نے کئی بار پوچھا کہ آخر یہ تصویریں کیوں اور کس لیے اتاری جا رہی ہیں لیکن گارڈ نے ہاتھ کے اشارے سے ہر بار مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ پھر وہ کمرے سے باہر چلے گئے — میں چیختا، چلاتا رہا لیکن کسی نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ ان تصویروں کے اتارنے کا مقصد کیا تھا اور کس کے حکم پر ایسا کیا گیا ہے؟ گارڈز کے چہرے حسب معمول خاموش اور بے تاثر تھے، انہوں نے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا — سورج غروب ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور اب بتیاں جل اٹھی تھیں۔ سرفراز علی رات کا کھانا لے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ گارڈ اور ایک اونچے لمبے قد کا شوفر تھا جس کی داڑھی اور مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ تمام چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا، بادی النظر میں وہ ایک خوفناک اور خونخوار شخص معلوم ہوتا تھا۔ سرفراز علی مزید کھانا لے آیا، یہ کھانا کئی آدمیوں کے لیے کافی تھا۔ ہم چاروں کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ سرفراز علی نے صرف اتنا کہا۔

''یہ ڈرائیور صاحب ہیں —''

اس کے بعد کھانا شروع ہو گیا۔

O

تھوڑی دیر بعد ہم تاریک شیشوں والی ایک ایمبولینس میں روانہ ہوئے، پچھلی سیٹ پر دو گارڈز میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے، شوفر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو شوفر نے ایئر کنڈیشن آن کر دیا اور اس کے ساتھ ہی موبائل فون پر کسی کو اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ پھر مدھم سُروں میں موسیقی گونجنے لگی۔ میں نے دو تین مرتبہ گارڈز اور شوفر کو مخاطب کر کے کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے یہ تاثر دیا جیسے میری بات سنی ہی نہیں بلکہ شوفر نے موسیقی کی لے تیز کر دی۔ ان کا حوصلہ شکن رویہ دیکھ کر میں نے بھی چپ سادھ کر آنکھیں موند لیں اور گردن کو سیٹ پر ٹکا کر سوچنے لگا کہ ان حالات میں آگے چل کر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ — سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ گوٹھ پہنچ کر وڈیرے سے کوئی بہانہ بنا کر معافی مانگ لوں اور سب کچھ بھول بھال کر زندگی کی پرانی روش اپنا لوں۔ وڈیرے کی زمینوں کے پشتی غلام ہونے کے ناتے مجھے اور میرے والدین کو دو وقت کی روٹی بہرحال مل سکتی تھی جب کہ اس معاملے میں ملوث ہو کر میرا اور میرے والدین کا کوئی بھی انجام ہو سکتا تھا، اچھا بھی اور برا بھی — مجھے سیٹھ ادریس کے تمام تر رویے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے مجھے بھی ایک ذریعے کے طور پر یا ایک مہرے کے

طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے ورنہ اسے مجھ سے یا میری ذات سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ پھر مجھے بھاگنے کا خیال آیا، میں نے اس پہلو پر غور شروع کر دیا۔۔۔ جب گاڑی روک کر یہ لوگ مجھے رخصت کر دیں گے تو اس وقت اپنے لیے کوئی راستہ اختیار کرنا میرے نزدیک بہت آسان کام ہوگا۔ یہ سوچ کر میرے ذہن سے بوجھ اتر گیا۔ میری جیب میں پانچ ہزار روپے تھے، یہ رقم میرے لیے خاصے دن تک کافی تھی۔ پھر مجھے نیند آنے لگی، میرا سر میرے کاندھے پر جھولنے لگا۔ بڑی پُرسکون سی نیند کی دھندلی دھندلی سی وادی تھی، روئی اور برف کے گالوں جیسی چٹانیں اور پہاڑ تھے۔ بڑی مدھم مدھم، خنک خنک سی وادی تھی جس میں نوشین میرے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کا سر میرے شانے پر تھا اور میں جھومتا ڈگمگاتا قربت کے نشے میں سرشار ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ یہاں نہ وڈیرا تھا، نہ اس کی پرچھائیں تھی، نہ سیٹھ اور لیس تھا، نہ اس کی آرام دہ قید تھی اور نہ اس گارڈز تھے، نہ بندوقیں تھیں، نہ گولیاں تھیں۔۔۔ جانے کتنی ہی دیر تک میں کیف و سرور کی وادیوں میں اُڑتا اور تیرتا رہا۔ پھر پے در پے دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلی تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا، پھر پہلی ہی کوشش میں اندازہ ہوا کہ میرا وجود بری طرح گاڑی میں پھنسا ہوا ہے۔ ایک شخص مجھے گاڑی سے باہر کھینچنے اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے اور دوسرا شخص میرے نیچے دبا ہوا ہے اور بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، باہر سے چند چیختی ہوئی آوازیں آ رہی ہیں۔ پھر کئی ہاتھوں نے مجھے کھینچ کر بڑی مشکلوں سے باہر نکالا۔

ایمبولینس گاڑی ایک آئل ٹینکر سے ٹکرا کر سڑک سے کئی فٹ نیچے ایک درخت کو توڑتی ہوئی ایک خشک برساتی نالے میں گر پڑی تھی۔ یہ جس رخ پر گری تھی اس طرف میرے داہنے ہاتھ جو گارڈ بیٹھا تھا وہ کوشش کر کے دروازہ کھول کر اوپر سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور اب لوگ مجھے کھینچ کر باہر نکال رہے تھے۔ ڈرائیور بری طرح زخمی تھا مگر وہ بہت مضبوط دل گُردے کا آدمی تھا، خون اس کے سر، چہرے اور کان سے ہوتا ہوا اس کے کپڑے بھگو رہا تھا۔ مجھے معمولی سی چوٹ بھی نہیں آئی تھی مگر میرے نیچے دبا ہوا گارڈ بری طرح زخمی تھا۔ آئل ٹینکر کا ڈرائیور بھی زخمی ہوا تھا مگر وہ گاڑی بھگا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جو گاڑیاں قریب سے گزر رہی تھیں ان کے مسافر انسانی ہمدردی کے تحت اپنی گاڑیاں روک کر نیچے آئے تھے اور اب گاڑی سیدھی کرنے اور ہمیں باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔ اسی لمحے ایک خیال بجلی بن کر میرے ذہن میں کوندا اور میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے، میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ بے ہوش ہو چکا ہوں۔ مجھے کھینچ تان کے بڑی مشکلوں سے باہر نکال کے زمین پر لٹا دیا گیا تھا، لائیٹر اور ماچس کی تیلیاں جلا جلا کر مجھے دیکھا گیا۔

"بے ہوش ہو گیا ہے۔۔۔" ایک آواز عین میرے چہرے کے قریب گونجی۔

"کوئی شدید اندرونی چوٹ آئی ہے۔۔۔" دوسرے نے کہا۔

"گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جاؤ سائیں!" کسی نے زور سے کہا۔

"نہیں۔۔۔" شوفر نے تیز پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اسے مت اٹھاؤ۔ ہم خود اسے ہسپتال لے جائیں گے۔۔۔"

"تم کس پر لے جاؤ گے۔۔۔؟" کسی نے چیخ کر کہا۔ "تمہاری گاڑی تو اس قابل نہیں رہی کہ تم لوگ اس پر آگے یا پیچھے جا سکو۔"

"ہم موبائل فون پر دوسری گاڑی منگوا لیں گے۔" اس گارڈ نے جو باہر نکل گیا تھا، لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ لوگوں کی بڑی

مہربانی، رش نہ لگائیں۔ ہم اپنا بندوبست کرلیں گے — جائیں، شاباش —!''

''دوسرے آدمی کو دیکھو بھئی یہ نیچے دبا ہوا ہے، شاید اس قابل ہی نہیں کہ اٹھ سکے''۔ اسی آواز نے کہا۔ شوفر اور گارڈ ایک شخص سے الجھنے لگے۔ وہ اصرار کررہا تھا کہ بے ہوش آدمی کو اپنی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جائے گا، اس کے دو تین ساتھی بھی اس کی ہمنوائی کرنے لگے۔ شوفر اور گارڈ ان سے الجھ پڑے، نوبت تو تکار سے ہوتی ہوئی ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ اس ہنگامے میں شوفر کو موبائیل فون استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پھر ہسپتال لے جانے پر زور دینے والے نے ریوالور نکال کر فائر کردیا۔ یہ ہوائی فائر تھا مگر جائے حادثہ پر جمع ہونے والے بری طرح سہم کر بھاگے، خود میں پھسل کر ایک گڑھے میں اتر گیا۔ گارڈ نے بھی مشتعل ہوکر اپنا پستول نکال کر پے در پے کئی فائر کیے۔ دوسری پارٹی بھی مسلح تھی، انہوں نے جھاڑیوں اور گڑھوں میں پوزیشنیں لے کر فائرنگ شروع کردی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ہسپتال لے جانے پر زور دینے والے افراد کو ریوالور نکالنے اور فائر کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ ہم سب ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ ایسے بیوقوف تو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے جو انسانی ہمدردی کے نام پر فائرنگ شروع کردیں — دوسرے ہی لمحے شوفر کے منہ سے کراہ کی آواز نکلی اور وہ دھم سے زمین پر گرا، دوسری طرف سے کسی نے فاتحانہ چیخ کے ساتھ کہا۔

''میں نے اس کی ٹانگ توڑ دی ہے دادا! — اٹھالو اس کے آدمی کو —''

پھر وہ فائرنگ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ گارڈ کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اس طرح بدلے گی ورنہ وہ گاڑی سے نکلتے وقت اپنی کلاشنکوف لے آتا جو گاڑی کی روانگی کے وقت اس نے سیٹ کے نیچے رکھ دی تھی۔ اب وہ پسپائی کے انداز میں اِکا دُکا فائر کررہا تھا۔

''یہیں تھا — یہیں —'' فائرنگ کرنے والوں میں سے کسی نے اس جگہ پہنچ کر لائٹر جلایا جہاں تھوڑی دیر پہلے گاڑی سے نکال کر مجھے لٹایا گیا تھا۔

''ڈھونڈو اسے —'' کسی نے چنگھاڑ کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اسے گم نہیں ہونا چاہیے ورنہ بڑی مصیبت آجائے گی۔ ہم کراچی سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے آرہے ہیں —''

''ویسے دادا! یہ تلاطم خان بھی کیا چیز ہے، پاتال سے بھی آدمی کا پتہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔'' اسی شخص نے کہا جس نے اپنے مخاطب کو شوفر کی ٹانگ توڑنے کی اطلاع دی تھی۔

''باتیں نہیں، کام —'' غالباً دادا نامی شخص نے کہا۔ ''ڈھونڈو اسے — اس طرف جاؤ، جھاڑیوں کی طرف —''

اب وہ میری طرف آرہے تھے۔ میں جس گڑھے میں اترا تھا اس کے اِردگرد خاردار گھنی جھاڑیاں تھیں کیا میں مٹی کا مادھو بنا مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتا رہوں گا؟ یہ ہڈ کاٹھ، یہ مضبوط ہاتھ پاؤں، یہ اونچا قد، یہ چوڑی چھاتی، آہنی انگلیاں کس دن کام آئیں گی؟ — میں سوچتا رہا اور لہو میری کنپٹیوں میں سنسناتا رہا، اندر ہی اندر مدافعت کی قوت مجھ میں بیدار ہوتی رہی۔ گوٹھ محمد صادق میں کبھی کبھار میں کشتی لڑنے کے لیے چاچا رحیمو سے داؤ پیچ سیکھنے جاتا تھا۔ وہ ایک بات تواتر سے کہا کرتا تھا کہ جو لوگ دفاعی طریقے ڈھونڈتے ہیں وہ ہمیشہ پسپائی اختیار کرتے رہتے ہیں اور جو

لوگ حملے کو دفاع پر ترجیح دیتے ہیں وہ عموماً جیت جاتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے اپنی مردانگی کی لاج اور اپنے نام کی شرم رکھنے کے لیے دفاعی انداز میں سوچنے کی بجائے پوری قوت سے حملے کے بارے میں سوچنا چاہیے

لیکن وہ اوپر تھے اور لالٹین کی روشنی کی مدد سے گڑھے میں جھانک کر مجھے ڈھونڈ سکتے تھے، چھپنا بے سود تھا اور مجھے بے ہوشی ختم ہونے کا ناٹک رچا کے خود کو ظاہر کردینا چاہیے تھا لہٰذا میں نے یہی کیا، کراہتے ہوئے آواز دی۔

''آہ!— کوئی ہے— مجھے گڑھے سے نکالو، میں ادھر گر پڑا ہوں— بھائی! کوئی ہے— کوئی ہے—''

''وہیں ٹھہرو—'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ ''ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور آہستہ آہستہ باہر نکلو، کوئی چالاکی دکھائی تو گولی بھیجا پھاڑتی ہوئی سر سے نکل جائے گی''۔

میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اندھیرے میں صرف ہیولے ہی نظر آرہے تھے۔ پھر انہوں نے جھپٹ کر مجھ پر قابو پالیا اور تیزی سے ان کے ہاتھ میری تلاشی لینے لگے۔ تیسرا ہیولہ بھی ان کے ساتھ آملا— یہ ایک بھاری بھرکم شخص معلوم ہوتا تھا، غالباً اسی کو دادا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔

''اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے''۔

انہوں نے دادا کو مطلع کیا۔ پھر وہ مجھے لے کر تیزی سے ایک گاڑی کی طرف بڑھے جو سڑک کے کنارے جھاڑیوں کے پاس کھڑی تھی۔ یہ گاڑی ڈبل روٹی کی ایک کمپنی کی تھی اور چاروں طرف سے بند تھی، صرف پیچھے سے کھلتی تھی۔ ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا، دوسرے نے پچھلا دروازہ کھولا۔ گاڑی میں ڈبل روٹیاں لدی ہوئی تھیں جو گتے کے ڈبوں میں پیک تھیں، انہیں ایک طرف سمیٹ کر جگہ بنائی گئی اور ہم تین آدمی ٹھنس کر اندر بیٹھ گئے۔ گاڑی چل پڑی تو اندر کی لائٹ آن ہوگئی۔ پہلی بار ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ لباس سے کسی فرم کے سیلز مین لگتے تھے لیکن ان کا چہرہ اور چہرے کے تاثرات لباس سے بہت مختلف تھے— یقینی طور پر ان کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہوگا لیکن جرائم پیشہ افراد آخر مجھ سے کیا چاہتے تھے، میرا تعاقب انہوں نے کیوں کیا تھا اور انہیں میرے بارے میں کس نے خبر دی تھی؟— ان کے مشکوک چہرے دیکھ کر مجھے خود پر غصہ آنے لگا کہ میں نے بلاوجہ خود کو گڑھے سے باہر نکال کر ان کے حوالے کردیا تھا، مجھے وہاں چھپے رہنا تھا۔ بعض اوقات بے سوچے سمجھے اٹھایا ہوا کوئی قدم آدمی کو ایک چھوٹی مصیبت سے نکال کر بڑی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔ اب پتہ نہیں یہ لوگ کون تھے اور مجھ سے کیا چاہتے تھے؟— گاڑی مسلسل چل رہی تھی۔ دادا میرے پہلو سے اٹھ کر سامنے والی سیٹ کے ڈبے ہٹا کر بیٹھ گیا۔

''نبی بخش جنگی—!'' اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہیں جانتے ہیں، بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور تم بھی ہمیں جانتے ہو—''

O

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر مجھے جھٹکا سا لگا، جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ میں اپنے تاثرات چھپا نہیں سکا، ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم کون ہو؟''

دادا ہنسا۔۔۔ اس کی ہنسی عیاری اور مکاری میں ڈوبی ہوئی نمائشی ہنسی تھی، ایسی ہنسی جس میں کوئی جذبہ پنہاں نہیں ہوتا۔ یہ ہنسی اپنے حقیقی تاثرات چھپانے کے لیے کام میں لائی جاتی ہے۔

''کریم دادا۔۔۔'' اس نے ایک خاص انداز سے کہا۔ ''کریم میرا نام ہے اور دادا لوگ مجھے کہتے ہیں۔۔۔ دادا اس آدمی کو کہتے ہیں جو ایک طرح سے دوسروں پر اپنی برتری کا سکہ جما سکتا ہو، بس یہی میرا تعارف ہے اور بہت کافی ہے۔۔۔ یہ ندیم عرف دیمی ڈنک ہے۔ اس کے ڈنک سے بچنے کی کوشش کرنا، بچھو بھی اسے دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں۔۔۔''

''مگر۔۔۔'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں۔۔۔؟''

''کراچی۔۔۔'' ندیم عرف دیمی ڈنک نے کہا۔

''کراچی۔۔۔؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''مگر۔۔۔ مگر مجھے تو اپنے گوٹھ جانا تھا۔''

''گوٹھ بھی جاؤ گے۔'' دادا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مگر پہلے کراچی۔۔۔''

پھر انہوں نے تاش کی گڈی نکالی اور ڈبل روٹی کے ایک کارٹن کو درمیان میں میز کے طور پر رکھ کر تاش کھیلنے لگے۔ میں نے آنکھیں موند لیں، مجھے تاش کھیلنی نہیں آتی تھی اور ویسے بھی انہوں نے مجھے کھیل میں شامل ہونے کی رسمی دعوت بھی نہیں دی تھی۔۔۔ وہ تاش کھیلتے رہے اور میں آنکھیں موندے سوچتا رہا، اسی ملی جلی کیفیت میں جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔۔۔ آنکھ کھلی تو گاڑی ایک قدیم سی عمارت کے احاطے میں کھڑی تھی۔ اس کی بیرونی دیوار پر ڈبل روٹی کا بہت بڑا فوٹو بنا ہوا تھا جو پرانا ہونے کی وجہ سے اپنا رنگ روپ تقریباً کھو چکا تھا۔ کچھ لوگ گاڑی سے ڈبل روٹی کے ڈبے نکال رہے تھے، ندیم عرف دیمی ڈنک مجھے جگا رہا تھا۔ میں جمائیاں لیتا ہوا نیچے اتر آیا۔۔۔ غالباً یہ ڈبل روٹی کی فیکٹری اور گودام تھا، کریم دادا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا البتہ قریب ہی اسی فیکٹری کی ایک پرانی گاڑی کے نزدیک ایک مسلح دربان کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر خشونت تھی۔ فیکٹری کے احاطے کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور باہر سڑک پر سے گزرنے والی بسوں اور ٹرکوں کے اوپری حصے نظر آتے تھے۔ ایک اونٹ گاڑی گزری تو اونٹ کی گردن جھولتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف غالباً میدان تھا کیونکہ سامنے اور اردگرد عمارتیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر دیمی ڈنک مجھے اندر لے گیا، اندر سے یہ عمارت باہر سے بھی زیادہ خستہ اور پرانی تھی، جگہ جگہ سے پلستر اکھڑ چکا تھا اور اینٹیں جھانک رہی تھیں، چھت کی درزوں میں ابابیلوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ چند لوگ ڈبل روٹیاں پیک کر رہے تھے کچھ مشینوں پر کام کر رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔۔۔ دیمی ڈنک مجھے لوہے کی چکردار پرانی سیڑھیوں کے ذریعے اوپر لے گیا۔ یہاں کچھ پرانے کمرے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور پردہ لٹک رہا تھا، دیوار پر ایک پرانی سی تختی پر غالباً ''دفتر'' لکھا ہوا تھا۔ یہ دفتر بوسیدہ فرنیچر، پرانے قالین اور معمولی آرائشی سامان اور چند الماریوں پر مشتمل تھا۔ ایک بڑی سی میز کے گرد چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، دیوار پر فیکٹری کی پروڈکشن کا گراف اور مختلف نقشے تھے۔ ایک سیاہ فون فائلوں کی ٹرے کے پاس رکھا ہوا تھا اور جنرل منیجر کی میز پر جو شخص بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔۔۔ یہ نیاز محمد عرف حاکم نیازو تھا اور بڑے انہماک سے اپنا منقش دستے والا خنجر لیے انگلیوں اور ناخنوں سے اس کی دھار چیک کر رہا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک تیز چبھتی ہوئی، زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے خنجر اپنے گلے سے لٹکی ہوئی چرمی پیٹی میں ڈال لیا، اٹھتے ہوئے بولا۔

''آ بھئی جنگی! میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

○

مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں — میں گنگ ہو کر رہ گیا، کچھ بولنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا جبکہ حاکم نیازو اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ کراچی کا پانی کھارا ہے، آسانی سے باہر کے لوگوں کو راس نہیں آتا مگر تجھے تو چار پانچ دن میں راس آ گیا، رنگ نکال لیے ہیں تُو نے — واہ سائیں، واہ — مگر ایک بات کی سمجھ نہیں آئی''۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا — پتہ نہیں کیا بات تھی، اسے دیکھتے ہی میں نے خجالت آمیز انداز میں نظریں چرا لی تھیں۔ ایک بار بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا تھا مگر وہ مسلسل میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ چند ثانیوں کا وقفہ دے کر اس نے کہا

''سمجھ اس بات کی نہیں آئی کہ تُو کراچی میں کیا کر رہا ہے، مالکوں سے تُو نے ادھر آنے کی اجازت کیوں نہیں لی، اپنے ماں باپ سے جھوٹ کیوں بولا — بول؟''

میں کیا بولتا؟ — چپ کھڑا رہا۔ اتنے میں دبلے پتلے جسم اور سانولے رنگ کا انتہائی تیز طرار چلتا پرزہ شخص تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے منہ میں پان تھا، اندر داخل ہوتے ہی وہ سیدھا میز کے پاس پہنچا وہاں نیچے ہاتھ ڈال کر اگالدان نکالا۔ پھر پان کی پیک اس میں تھوکی، اگالدان کو اپنے پاؤں کے قریب رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ کر میری طرف دیکھا اور حاکم نیازو سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کیوں میرے آقا! کیا کہتے ہو مانتے ہو اپنے تلاطم خاں کو کہ نہیں مانتے — اس کا پتہ تمہارے شکاری کتے بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ تم نے تجربہ کر کے بھی دیکھ لیا ہے، کتے شہر کی بھیڑ بھاڑ اور ٹریفک کے رش سے گھبرا جاتے ہیں کیونکہ جو گاؤں کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں، وہ صرف گاؤں میں اپنے جوہر دکھا سکتے ہیں۔ شہر کے لیے اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے، بس دام دو اور کام لو — کیوں میرے آقا؟''

یہ کہہ کر وہ حاکم کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پھنسی پھنسی آواز میں ہنسا کیونکہ اس کے منہ میں پان تھا۔ پھر انہوں نے اشاروں اور سرگوشیوں میں کوئی بات کی۔ دبلے پتلے آدمی نے اگالدان اٹھا کر پیک پھینکی، نیا پان منہ میں ڈالا اور اونچی آواز میں بولا۔

''میرے آقا! تمہارے لیے اپنی جان بھی حاضر ہے، دس دفعہ بلاؤ گے تو دس دفعہ آؤں گا۔ تم آدمی سنبھال لو، اچھی طرح دیکھ بھال لو — یہی ہے نا، کوئی اور تو نہیں —؟''

حاکم نیازو کے ہونٹوں پر بھیڑیے جیسی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''یہی ہے تلاطم خان! یہی ہے، مہربانی تمہاری — مانتا ہوں کہ تم سمندر میں ڈوبا ہوا قمیض کا بٹن ڈھونڈ کر نکال سکتے ہو''۔

تلاطم خاں نامی شخص اپنی تعریف پر پھولے نہیں سمایا۔ اس نے پھر حاکم نیازو کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور پھنسی پھنسی آواز میں ہنسنے لگا۔ اتنے میں کریم دادا اندر آ گیا مگر وہ بھاری بھرکم، لحیم شحیم آدمی اکڑ کے کھڑا ہونے کی بجائے پالتو بھیگی بلی کی طرح ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ تلاطم نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''چل بھئی، کریے! تیری ڈیوٹی ختم— جبار کو میں نے بول دیا ہے، وہ ادھر ہی رہے گا— ایک منٹ ذرا ادھر آ کر میری بات سننا—''

بھاری بھرکم کریم دادا سہمے سہمے انداز میں قریب آ کر اس کے شانوں پر جھک گیا۔ تلاطم خاں نے اس سے پتہ نہیں کیا کہا، میں سن نہیں سکا۔ کریم دادا سر ہلاتا رہا، پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تلاطم خاں نے اب کے پھر کچھ کہا۔ آخری الفاظ جو میں سن سکا وہ غالباً کچھ یوں تھے کہ ٹی ٹی خود لے کر جائے گا— پھر کریم دادا کمرے سے نکل گیا۔ تلاطم خاں اب پھر حاکم نیازو سے اشاروں اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگا۔ اس دوران حاکم نیازو نے کہیں فون کیا، پھر ایک فون کال ریسیو کی۔ اس کے بعد تلاطم خاں اُٹھ کھڑا ہوا اور حاکم نیازو سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''میرے آقا! پروگرام اپنی طرف سے ڈن ہے— اب چلتا ہوں، اپنا بندہ چیک کر لینا—''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی حاکم نیازو کے تیور بدل گئے، تیوریاں چڑھا کر پھنکارا۔

''تُو نے بتایا نہیں کہ بغیر اطلاع اور بغیر اجازت کراچی کیوں آیا تھا—؟''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میں نے وڈیرا شاہی نظام کے غلاموں کے مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑ لیے اور گھگھیا کر کہا۔

''حاکم سائیں! مجھ سے غلطی ہو گئی— معاف کر دیں سائیں، آئندہ میری توبہ ہے—''

حاکم نیازو سفاکی سے مسکرایا اور بولا۔ ''یہ تو میری بات کا جواب نہیں ہے، میں تو اپنے سوال کا جواب مانگتا ہوں—''

''حاکم سائیں!'' میں نے عاجزی سے کہا۔ ''میں سچی بات کرتا ہوں— گوٹھ قاسم علی میں فضل داد سے میں نے اپنی رقم لینی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ رقم مل جائے گی، یہی خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح فضل داد ٹال مٹول کرے گا اور میں اپنے گوٹھ آ جاؤں گا مگر جب اس نے رقم میرے ہاتھ پر رکھ دی تو میرا جی چاہا کہ اتنی دور آیا ہوں تو کیوں نہ کراچی کی سیر کروں، منڈوا دیکھوں— بس اسی چکر میں کراچی میں آ گیا—''

''تو منڈوا دیکھنے آیا تھا تُو—'' حاکم نیازو نے چبا چبا کر کہا۔ ''تجھے منڈوا دیکھنے کا بہت شوق ہے نا؟''

''شوق تو ہے سائیں—!'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''دیکھ، نبی بخش جنگی—!'' حاکم نیازو نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''چالاکیاں چھوڑ دے اور اور جو کچھ پوچھتا جاؤں، سچ سچ بتاتا جا—''

''یہ چالاکی نہیں ہے سائیں—'' میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم یقین کرو۔''

''میں تیری ایک بات پر بھی یقین نہیں کرتا۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔ ''تُو نمک حرام ہے۔ تُو نے وڈیرے سائیں کا نمک کھا کر ان سے نمک حرامی کی ہے، ان کے ٹکڑوں پر پل کر ان سے غداری کی ہے—''

اپنی جان بچانے کے لیے مجھے یہی راستہ دکھائی دیا کہ میں حقیقت سے انکار کردوں اور اسی لیے چیخ پڑا۔ ''کون سی نمک حرامی کی ہے میں نے، کون سی غداری کی ہے میں نے — بتاؤ مجھے — بتاؤ؟''

''آہستہ بول —'' حاکم نیاز و دانت پیس کر بولا۔ ''دو منٹ میں تیری چٹنی بنوا دوں گا — کیا تُو نہیں جانتا کہ کراچی میں بھی سائیں وڈیرے کی کوٹھی ہے، یہاں بھی اس کا ڈیرہ ہے اور صرف گوٹھ، صادق علی ہی نہیں یہاں بھی اس کا حکم ماننے والے موجود ہیں — جو کچھ میں پوچھتا جاؤں بتاتا جا، یہ بتا کہ تُو صدیق عامر تک کیسے پہنچا؟''

''صدیق عامر —؟'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کی اداکاری کی۔ ''کون صدیق عامر؟''

''وہی صدیق عامر جسے دیکھنے کے لیے تُو بارش والی رات تہہ خانے میں گیا تھا اور تجھے حویلی کے ملازم کریم بخش نے دیکھ لیا تھا۔ پہلے وہ یہی سمجھا کہ تُو کتوں کو راتب وغیرہ ڈالنے آیا ہے، اس لیے اس نے ایک دن تک تیرے غائب ہونے کے بعد کسی کو کچھ نہیں بتایا لیکن جب تیری گمشدگی کو دو دن بیت گئے تو اس نے وڈیرے سائیں کو بتا دیا کہ تُو رات کو تہہ خانے میں گیا تھا اور اگلی صبح جب صدیق عامر کو روٹی دینے گیا تو اس نے سیڑھیوں پر تیرے قدموں کے نشانات بھی دیکھ لیے تھے —''

میں چکرا کر جھولنے لگا۔ اگر فوری طور پر کرسی کی پشت کو مضبوطی سے تھام نہ لیتا تو زمین پر گر پڑتا۔

''بعد کا کام ہمارے لیے بہت آسان تھا۔'' مجھے حاکم نیاز و کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دینے لگی۔ ''ہم نے صدیق عامر سے اتنا تو اگلوا لیا کہ کوئی شخص اس کے پاس آیا تھا مگر وہ کون تھا، اس کی شباہت کیسی تھی اور صدیق عامر کے ساتھ اس کی کیا بات چیت ہوئی، اس بارے میں ہم اب تک کچھ اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ بڑا پختہ جوان ہے، بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا کر بھی کچھ بولنے پر آمادہ نہیں ہوا — بہرحال، ہم تیرا سراغ لگاتے ہوئے کراچی پہنچ گئے۔ یہاں ہمارے اپنے آدمی موجود تھے جن کے ذریعے ہم نے تیرا پتہ ٹھکانہ یہاں تک کہ روانگی کا وقت بھی معلوم کر لیا۔ ہم تجھے نیشنل ہائی وے کے اس کنارے سے پکڑنا چاہتے تھے جہاں سے تجھے گوٹھ صادق علی کے لیے بس یا اونٹ کے ذریعے جانا تھا۔ وہاں سے ہم تجھے پکڑ کر یہاں اس کمرے میں لے آتے''۔

O

میں چکرا کر دھم سے ایک کرسی پر گر پڑا — میرے فرار کا بھانڈہ پھوٹ چکا تھا، اب جھوٹ بولنے یا بہانے تراشنے کی گنجائش ختم ہو چکی تھی لیکن یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ نیشنل ہائی وے سے پکڑ کر دوبارہ مجھے کراچی لانے کا پروگرام انہوں نے کیوں بنایا تھا۔ اگر سزا ہی دینی مقصود تھی تو وہ مجھے سائیں وڈیرے کے پاس لے جاتے۔ کراچی لانے کا مقصد کیا تھا؟ — یکا یک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور اس خیال کے آتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وڈیرے جلال الدین کے نزدیک ایک سرکش اور غدار آدمی کے وجود کی کوئی اہمیت اور قیمت نہیں تھی۔ میرے بارے میں اصل صورتِ حال کا علم ہوتے ہی اس نے صدیق عامر کو کہیں چھپا کر عقوبت خانے سے تمام نشانیاں اور علامتیں مٹا دی تھیں اور شکاری کتوں اور اپنے آدمیوں کے ساتھ اپنے معتمد منشی نیاز محمد کو شہر بھیج دیا تھا تاکہ وہ اصل معاملات کا کھوج لگا کر مجھے واپس گوٹھ صادق علی پہنچانے کی

بجائے کراچی میں ہی میری زندگی کا قصہ پاک کر دے۔ وہ اپنے ہاتھ میرے خون سے رنگین نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کام کے لیے اس کے پاس دوسرے لوگ موجود تھے اور ویسے بھی گوٹھ صادق علی میں لا کر مجھے مارنے سے بات باہر نکل سکتی تھی، معاملات الجھ سکتے تھے۔ گوٹھ کے رہنے والے اور دیگر گوٹھوں کے باسی متنفر ہو سکتے تھے اور ان دنوں جلال دین اُن کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں سکتا تھا کیونکہ ملک میں انتخاب ہونے والے تھے اور وہ اپنے علاقے سے صوبائی اسمبلی کی ایک سیٹ کے لیے کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس کا مدِ مقابل وڈیرا سردار محمد خاں اسی علاقے سے صوبائی اسمبلی کی سیٹ کے خواب دیکھ رہا تھا۔ سردار محمد، گوٹھ محمد بخش کے مرحوم رئیس وڈیرا خان بہادر کا اکلوتا بیٹا تھا اور رشتے میں وڈیرا جلال دین کا چچازاد بھائی تھا۔ سردار محمد خاں بھی جلال دین کے ساتھ کچھ عرصے انگلستان میں رہ چکا تھا اور اسی کی طرح تعلیم ادھوری چھوڑ کر آیا تھا، زمین اور جائیداد تھی، پھلوں کے باغات اس کے علاوہ تھے لہٰذا اس میں بھی جلال دین کی طرح خاصی رعونت اور نخوت تھی، اسی کی طرح تنک مزاج اور ہتھ چھٹ تھا۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا یا لڑائی نہیں تھی اور عید، بقرعید پر ایک دوسرے سے ملتے تھے، تحفے تحائف دیتے تھے لیکن باہمی تعلقات میں ایک خاص قسم کا کھچاؤ تھا، دونوں دل ہی دل میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے خواہاں رہتے تھے، بظاہر اپنی نفرت یا کسی بھی اختلافی پہلو کو عام لوگوں کے سامنے نہیں آنے دیتے تھے۔ مگر اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ دونوں گوٹھوں کے ملازمین کے درمیان بھی مخاصمت تھی۔ تاہم ایک دوسرے سے کھل کر بات نہیں کرتے تھے اور معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ وڈیرا جلال دین ان انتخابات میں جیت جائے گا کہ اس کے خاندان کا تھوڑا بہت سیاسی پس منظر بھی تھا اور اس کے ووٹروں کی تعداد بھی گوٹھ محمد بخش کے سردار محمد خاں کے ووٹروں سے زیادہ تھی—

حاکم نیازو بڑے غور سے میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہا تھا، میرے سانسوں کے زیر و بم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

''غداری کی سزا کے خلاف تو جنگی اپیل بھی نہیں ہو سکتی اور یہ تو جرم ہی بڑا گھناؤنا ہے، نمک حرام کو ہم معاف نہیں کر سکتے۔ سائیں وڈیرے کا صاف صاف حکم ہے کہ تیرے غلط وجود کو گوٹھ صادق علی میں لانے کی بجائے ہم سمندر کے حوالے کر کے آئیں تاکہ تُو ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے اور دوسرے غدار عبرت پکڑیں، مائیں ہمیشہ اپنے بچوں کو نصیحت کریں کہ اپنے مالک سے کبھی غداری نہ کرنا ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے''۔

موت مجھ پر مسلط کی جا رہی تھی، فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔ کمرے میں میرے اور حاکم نیازو کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا، ابھی اور اسی وقت کرنا تھا— حاکم نیازو وڈیرے کا سب سے منہ چڑھا ملازم تھا، وڈیرے کے بعد اس کی حیثیت وڈیرے جیسی تھی، لوگ اس سے خوف کھاتے تھے لیکن اب میرے پاس خوف کھانے اور رحم کی بھیک مانگنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ میری موت کا پروانہ لئے پھر رہا تھا، اس کی کلائی مروڑ کے یہ پروانہ اس سے چھین کر پرزے پرزے کرنا اب میری مجبوری تھی اور میری ضرورت تھی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے۔ اگر میں اس کمرے سے نکل کر بھاگتا تو وہ شور مچا کر سب کو متوجہ کر سکتا تھا لہٰذا سب سے پہلے اسے خاموش کرنا ضروری تھا۔ میں نے اچانک اٹھ کر اس پر چھلانگ لگائی اور اسے اس طرح دبوچ کر فرش پر پٹخا کہ میری ہتھیلی اس کے منہ پر جمی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس نے جدوجہد کی کوشش کی، خنجر نکال لیا مگر میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر کے دوسرے سے کلائی مروڑ کر ایک جھٹکے سے خنجر پرے پھینکا اور اس پر چڑھ بیٹھا۔

''دو ٹکے کے ملازم—!'' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ کا دباؤ پوری وحشت اور شدت سے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''انسان کی موت اور

زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جب تک اس کا حکم نہیں ہوتا، تُو اور تیرے جیسے سینکڑوں درندے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔"

حاکم نیاز و میرے جسم کے نیچے بری طرح مچل رہا تھا لیکن بے بس تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر جما رکھا تھا، دوسرے ہاتھ سے اس کے بال پکڑ لیے۔ اس شخص نے جانے کتنے ہی غریبوں اور مظلوموں کی عزتیں برباد کی تھیں، جانے کتنے لوگوں کو زمین کی تہہ میں پہنچا دیا تھا اور جانے کتنے ہی گھروں میں اپنی دہشت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ یہ شخص کسی بھی طرح زندہ رہنے کا مستحق نہیں تھا مگر میں اس کے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا تھا، صرف وقتی طور پر اس کا منہ بند کرنا ضروری تھا۔ اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر میں نے دو تین مرتبہ اس کا سر زمین سے ٹکرایا، وہ بری طرح مچلا اور پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں پھرتی سے اٹھا، جھک کر زمین سے اس کا خنجر اٹھایا اور پوری رفتار سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا لیکن سیڑھیوں کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گیا۔ یہ قدیم آہنی سیڑھیاں تھیں، ان کی ایک ایک چول ہل رہی تھی، اس پر سے اترتے ہوئے ہر شخص سیڑھیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے میری طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، دائیں طرف ایک خستہ کھڑکی کھلی تھی جس کے زنگ آلود فریم کے شیشے تقریباً ٹوٹ چکے تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا، یہ کھڑکی زمین سے خاصی بلند تھی اور ایک گلی کے پچھواڑے کھلتی تھی۔ گلی ویران تھی اور اس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ کھڑکی کے دائیں طرف لوہے کا ایک پرانا پائپ فرش سے چھت تک گیا تھا غالباً گندے پانی کے نکاس کے لیے۔ میں نے کھڑکی کے فریم پر ہاتھ رکھ کر اس کے پٹ کھینچ کر کھولے۔ ایک پاؤں اوپر رکھا اور لوہے کا پائپ پکڑ کر اپنے پاؤں اس کے ہک پر جما دیئے اور پھرتی کے ساتھ مگر انتہائی احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔۔۔ حیرت ہے کہ بیس پچیس فٹ اونچے پائپ سے نیچے اترتے ہوئے مجھے کسی نے نہیں دیکھا، جب فرش چند فٹ نیچے رہ گیا تو میں نے پائپ چھوڑ دیا، نیچے چھلانگ لگا دی اور گلی کے کھلے ہوئے حصے کی طرف بھاگا۔ گلی سے نکلتے ہی میں نے اپنی رفتار مدھم کر دی۔ اجنبی شہر کے گلی کوچے سڑکیں اور بازار میرے لیے مکمل طور پر اجنبی تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کون سی سڑک کہاں تک جاتی ہے اور کس گلی کے مکانات کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں؟ حالانکہ دن کا وقت تھا مگر اتنی رونق نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ علاقہ زیادہ تر پرانی عمارتوں پر مشتمل تھا۔۔۔ یکا یک میرے قدم رک گئے۔۔۔ سامنے پولیس کی ایک وین کھڑی تھی۔ غالباً کوئی چائے خانہ تھا، دو تین پولیس والے وین کے قریب کھڑے چائے پی رہے تھے۔ لوہے کے پائپ کی رگڑ سے میرا لباس جگہ جگہ سے بدرنگ ہو گیا تھا، ہاتھ اور گال پر بھی ہلکی ہلکی خراشیں تھیں۔ میرا مشکوک حلیہ دیکھ کر وہ مجھے روک سکتے تھے۔ میں نے پلٹ کر مخالف سمت بڑھنا شروع کیا، احتیاطاً ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک پولیس والا میری طرف اشارہ کر رہا تھا دوسرے نے اپنا کپ وین کے بونٹ پر رکھا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔

"او بھائی صاحب! رکنا ذرا ایک منٹ۔۔۔"

شاید میں عام حالات میں رک جاتا اور مڑ کر اس سے پوچھتا کہ جی، فرمایئے۔ آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟ لیکن اس وقت عام حالات نہیں تھے۔ میں ایک شخص کو زخمی کر کے بھاگا تھا، میرے پاس ایک خنجر اور پانچ ہزار روپے کی رقم تھی۔ مجھ پر کوئی بھی الزام عائد ہو سکتا تھا، لہٰذا میں نے اپنی رفتار پہلے تو تیز کی، پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر ایک سائبان کے نیچے کوئی کھوکھا تھا، اس کے ساتھ ہی ایک گلی اندر گھومتی تھی، دائیں ہاتھ ایک عمارت کے فلیٹوں کا چوڑے زینوں والا دروازہ تھا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر زینوں میں چھلانگ لگا دی اور ایک ساتھ دو دو تین تین

سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ یہاں ایک تنگ سا کوریڈور تھا اور دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ بچوں اور عورتوں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پہلے میں نے ڈسٹ بن کے پیچھے چھپنا چاہا لیکن وہاں سے مجھے پکڑا جا سکتا تھا، پھر میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر ایک فلیٹ کی کال بیل پر انگلی رکھ دی، اندر گھنٹی بجنے کی آواز گونجی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا، ایک ایک لمحہ مجھ پر بھاری تھا۔ میں نے دستک دینے کے لیے دروازہ پر ہاتھ رکھا تو میرے ہاتھ کے دباؤ سے وہ اندر کی طرف کھل گیا، اندر لوہے کی باریک جالی کے فریم والا دروازہ تھا جس میں باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کنڈی کھولی اور نتائج سے بے پروا ہو کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ دو کمروں کا سادگی سے سجا ہوا ایک عام فلیٹ تھا، اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف ایک قد آدم ریفریجریٹر رکھا تھا۔ میں اس کے پیچھے چھپ گیا۔ میری سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں — پھر باہر کوریڈور میں پولیس والے کے قدموں کی چاپ گونجی، وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

''میں نے خود دیکھا ہے، وہ مشکوک آدمی اسی گلی میں آیا تھا —''

''اس گلی میں کئی عمارتیں ایسی ہیں جن میں اس طرح سیڑھیاں اور فلیٹ بنے ہوئے ہیں''۔

ایک نسوانی آواز نے کہا۔

''ممکن ہے، وہ ساتھ والے فلیٹوں میں گیا ہو —''

''پھر بھی آپ لوگ ہوشیار رہیں —'' پولیس والے نے کہا۔ ''چوریاں چکاریاں عام ہیں، دن دیہاڑے ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ شہریوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی حفاظت کا خیال رکھیں —''

پھر چند عورتوں کے اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں، غالباً وہ پولیس والے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا معاملہ ہے؟

''نفیسہ بہن —!'' ایک عورت نے کہا۔ ''تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ صرف کنڈی لگا کر نہ آیا کرو، تالا لگایا کرو چاہے ایک منٹ کے لیے بھی کہیں جانا ہو — حالات اچھے نہیں ہیں''۔

''ہاں، باجی''۔ جواباً کسی عورت نے کہا۔ ''حالات تو واقعی اچھے نہیں ہیں لیکن ہم سے کسی کو کیا ملے گا —''

غالباً پولیس والا جا چکا تھا اور اب وہ کوریڈور میں کھڑی آپس میں تبصرے کر رہی تھیں — کسی بھی لمحے کوئی اندر آ سکتا تھا۔ جہاں میں دم بخود کھڑا تھا وہ چھپنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی، دائیں طرف ایک اسٹور سا نظر آ رہا تھا جس میں کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ ایک وہیل چیئر عین دروازے میں ترچھی رکھی ہوئی تھی، اندر دواؤں کے خالی ڈبے اوپر نیچے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے لپک کر وہیل چیئر کے پیچھے، ڈبوں کے عقب میں چھلانگ لگا دی۔ یہاں ایک آدمی کے چھپنے کے لیے خاصی جگہ تھی۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص بڑی سی وہیل چیئر کو اپنی جگہ سے ہٹائے بغیر ڈبوں کے پیچھے اتنی صفائی سے پہنچ سکتا ہے کہ ڈبوں پر جمی ہوئی گرد بھی نہ جھڑنے پائے۔ میں بالکل فرش سے چپک کر لیٹ گیا تھا کوئی شخص اگر مجھے ڈھونڈنے کے لیے وہیل چیئر ہٹا کر اسٹور کے اندر بھی آ جاتا تو فوری طور پر مجھے ڈھونڈ نہیں سکتا تھا، مجھے سنبھلنے اور بھاگنے کی مہلت مل سکتی تھی۔ میں رات ہونے تک کے لیے یہاں چھپنا چاہتا تھا کہ اندھیرا ہوتے ہی کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں باہر نکل جاؤں گا۔ میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ

میں بڑی آسانی سے کئی دن کسی عام سے بازاری ہوٹل میں گزار سکتا تھا— یکا یک دروازہ چرچرایا اور پھر کسی نے چیخ کر کہا۔

''خالہ!— ذرا دیکھیں، یہ دروازہ کس نے کھولا ہے؟ میں خود جالی والے دروازے کو کنڈی لگا کر گئی تھی''۔

''یہ اس موٹی آصفہ کے پیٹو بیٹے کی حرکت ہوگی''۔ ایک بڑی بی کی آواز آئی۔ ''کمبخت جہاں ذرا نظر چوکتی ہے، کسی فلیٹ میں گھس کر کھانے پینے کی چیزوں پر ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ کتنی مرتبہ شکایتیں کر چکی ہوں اس کی ماں سے— چلو، اپنا فریج چیک کولو''۔

پھر دونوں اندر داخل ہوئیں، ریفریجریٹر کھلنے کی آواز آئی، کسی نے اس میں جھانک کر چیزیں چیک کیں اور پھر آواز آئی۔

''لگتا ہو مٹھائی پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا، ڈبہ کچھ آگے کی طرف کھسکا ہوا لگتا ہے— نہیں مٹھائیوں کو بھی ہاتھ نہیں لگایا شاید اس نے—''

''چلو، چھوڑو—'' بڑی بی نے کہا۔ ''آئندہ باہر نکلتے وقت تالا ڈال دیا کرو— میں چلتی ہوں۔'' بڑی بی کی دروازے کی طرف جاتی ہوئی آئی۔

''ہاں— یہی کرنا پڑے گا۔''

عورت انہیں دروازے تک رخصت کرنے جا رہی تھی۔ پھر دروازہ بند ہو گیا۔ قدموں کی چاپ کمرے میں گونجی اور کسی کے گنگنانے کی آواز آئی۔

تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے
ہم بھری دنیا میں، تنہا ہو گئے

بے حد حسین آواز تھی، بے انتہا پُرسوز اور سریلی— کبھی یہ آواز مدھم ہوتی اور کبھی تیز، کمرے کے ایک کونے میں سنائی دیتی اور کبھی دوسرے کمرے سے بلند ہوتی۔ غالباً وہ کچھ چیزیں رکھ رہی تھی، کچھ اٹھا رہی تھی، کسی گھریلو کام میں مصروف تھی۔ پھر وہ باتھ روم چلی گئی۔ وہاں سے نکلی تو سنگھار میز کی طرف چلی گئی، خاصی دیر تک وہاں بیٹھی رہی اور گنگناتی رہی، پھر اس نے دوسرے کمرے میں جا کر غالباً لباس تبدیل کیا، سینڈل پہنے اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا فلیٹ کے بیرونی حصے میں پھیل گیا۔ اس نے لوہے کی جالی والا دروازہ بند کیا، غالباً اس مرتبہ اس میں تالا بھی لگایا، پھر دوسرا دروازہ بند کیا، تالا لگایا۔ اور اس کے سینڈل کی کھٹ کھٹ کوریڈور سے ہوتی ہوئی سیڑھیوں پر معدوم ہو گئی— دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی بے ساختہ میں اٹھ بیٹھا، بڑی احتیاط سے ڈبوں کے پیچھے سے نکلا۔ پھر کمرے کے بیرونی حصے سے ہوتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ یہ غالباً بیڈ روم تھا، ڈبل بیڈ پر ایک ہی تکیہ تھا اور بیڈ کے شیلف پر دو تصویریں ساتھ ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ یہ غالباً میاں بیوی کی تصویریں تھیں اور غالباً یہی اس فلیٹ کے مکین تھے، مرد کی عمر عورت سے زیادہ تھی لیکن دونوں کے نقوش تیکھے اور خوبصورت تھے، عورت زیادہ حسین تھی۔ یہ فلیٹ اس طرح بنا ہوا تھا کہ بیرونی دروازے کے فوراً بعد ایک کمرہ نما حصہ تھا جس کے ساتھ ساتھ باتھ روم اور اسٹور تھا اور کونے میں باورچی خانہ، اس کے بعد دوسرا کمرہ تھا جس کی عقبی کھڑکیاں گلی یا بازار میں کھلتی تھیں۔ شیشے کی ان چوڑی کھڑکیوں پر ہلکے رنگوں کے پھولدار پردے پڑے ہوئے تھے، دائیں بائیں دیواروں میں چوبی اور سنگی الماریاں بنی ہوئی تھیں جو بند تھیں۔ سرہانے ایک کرسی اور ایک

اونچا اسٹول پڑا ہوا تھا جس پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا اور اس کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ آگے بڑھا اور عین ممکن تھا کہ میں ریسیور اٹھا لیتا لیکن اچانک خیال آیا کہ میں ایک مفرور شخص ہوں اور غیر اخلاقی طور پر چوروں کی طرح کسی کے گھر میں داخل ہوا ہوں اور یہاں کسی چیز سے میرا کوئی تعلق نہیں — میرا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے گر پڑا، گھنٹی بجتی رہی اور پھر بند ہو گئی — پتہ نہیں وہ خاتون کون تھی، کہاں گئی تھی، کب واپس آئے گی اور اس کا شوہر کب آئے گا؟ — بہت سارے سوالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ فلیٹ میں قید ہو کر میں باہر کی دنیا سے محفوظ تو ہو گیا تھا لیکن یہاں خدا جانے کتنے خطرات میرے منتظر تھے۔ مجھے شدید بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے ریفریجریٹر کھولا۔ اس میں دودھ، پھل اور مٹھائیوں کا ایک بڑا ڈبہ موجود تھا۔ کچھ برتن تھے جن میں سالن بھی تھا، فرائی مچھلی کا ایک بڑا قتلہ بھی رکھا تھا اور ڈبل روٹی بھی موجود تھی۔ میں کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑا، کھڑے کھڑے ساری چیزیں کھا گیا۔ پھر گھوم پھر کر فلیٹ کا جائزہ لیا۔ بیرونی حصے میں ایک ریک تھا جس کے نچلے خانے میں کئی نئے اور پرانے زنانہ سینڈل پڑے تھے، دیوار گیر پر لٹکے ہوئے بیشتر کپڑے بھی زنانہ تھے بیرونی دروازے کے ساتھ بھی ایک کھڑکی تھی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا ویسا ہی رنگین اور پھولدار جیسا اندرونی کمرے کی عقبی کھڑکی پر تھا، اس کھڑکی کے نزدیک ریفریجریٹر رکھا ہوا تھا اور ایک میز پر ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا جس کی تار فرش پر لٹک رہی تھی، وہیں ایک ٹی وی سیٹ بھی تھا۔ غالباً کمرے میں مناسب فاصلے پر انہیں رکھنے کی جگہ نہیں تھی لہٰذا انہیں بیرونی حصے میں رکھا گیا تھا، بیڈ پر لیٹ کر ٹی وی سکرین عین سامنے آ جاتی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب کھا پی کر میں تھوڑی دیر کے لیے بیڈ پر لیٹا۔ اتنا نرم، خوشبودار اور آرام دہ بیڈ تو سیٹھ اور یس کے گیسٹ روم کا بھی نہیں تھا۔ مجھے نیند آنے لگی مگر یہاں لیٹنا خطرناک تھا اس لیے باتھ روم سے ہو کر میں وہیل چیئر پھلانگتا ہوا اپنی کمین گاہ میں چھپ گیا۔ میں نے اپنے لیٹنے کی جگہ ایک پرانے کپڑے سے خوب اچھی طرح صاف کر لی تھی ایک ڈبے میں پڑے ہوئے اسفنج کے ٹکڑے جمع کر کے ان کا تکیہ سا بنا لیا تھا لیکن سخت فرش اور تنگ سی جگہ میں نیند نہیں آئی، بڑی بے چینی محسوس ہو رہی تھی — میں سوچ رہا تھا کہ جونہی وہ عورت اور اس کا شوہر اندر داخل ہوں گے میں پھرتی سے انہیں ڈاج دے کر باہر نکل جاؤں گا اور بھاگتا ہوا، چھپتا ہوا اس علاقے سے نکل جاؤں گا لیکن پتہ نہیں وہ کب آئیں گے؟ — دیوار گیر کلاک ٹک ٹک چلتا رہا، آنے والے تھے کہ آ ہی نہیں چکتے تھے، دس بجے، بارہ بجے، دو بجے، چار بجے اور پھر چھ بج گئے مگر کوئی نہیں آیا۔ شاید وہ عورت اور اس کا شوہر کسی کے گھر چلے گئے ہوں، کسی شادی پر یا کسی دعوت میں، پتہ نہیں کب آئیں گے — باہر شام ہو رہی تھی۔ ایک ایک کر کے بتیاں جلنے لگی تھیں مگر فلیٹ میں اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا — ٹھیک ساڑھے سات بجے بیرونی دروازے کا تالہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر جالی دار دروازہ کھول کر عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا، بتی جلائی اور پھر کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے شاید لباس تبدیل کیا، چپل پہنے، باتھ روم سے ہو کر کچن کی طرف گئی۔ وہاں سے ریفریجریٹر کی طرف آئی — یہ لمحہ میرے لیے بڑا صبر آزما تھا، کھانے پینے کی خاصی چیزوں کا میں نے صفایا کر دیا تھا اور لازماً اس کی نظر ان چیزوں پر پڑ سکتی تھی لیکن معلوم نہیں کیوں اس نے ریفریجریٹر کی بے ترتیبی پر زیادہ توجہ نہیں دی یا اس کا ذہن کسی کام میں الجھا ہوا تھا لہٰذا اس نے غور نہیں کیا، بس جو کچھ نکالنا تھا، وہ نکالا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کھانے کے بعد اس نے بیک وقت ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ ٹی وی پر مقامی خبریں آ رہی تھیں، ٹیپ ریکارڈر پر کوئی گیت بج رہا تھا۔ پھر وہ کسی سے فون پر بات کرنے لگی جبکہ مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے آنے میں یہ خطرہ تھا کہ وہ چیخ

مار کر فلیٹ کے مکینوں کو ہوشیار کر دے گی اور میرے بھاگنے کی راہیں مسدود ہو جائیں گی یہی مناسب تھا کہ جب وہ رات کو سو جائے تو میں چپکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاؤں لیکن اس طرف میرا ذہن بالکل نہیں گیا تھا کہ ممکن ہے، وہ رات کو دروازہ اندر سے مقفل کرنے کی عادی ہو، بہت ممکن ہے اس کا شوہر رات کو دیر سے گھر آتا ہو۔ پھر جیسے ہی میں دروازے سے باہر نکلوں اس سے یا کسی سے بھی مڈھ بھیڑ ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فلیٹ کی سیڑھیوں کا آہنی جالی دار گیٹ رات کو بند کر دیا جاتا ہو۔ پتہ نہیں وہ عورت دن بھر کے لیے کہاں گئی تھی اور اس کا شوہر اب تک کیوں نہیں پہنچا تھا--- میری بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا، اچک کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے، ٹی وی چل رہا تھا البتہ ٹیپ ریکارڈر بند تھا۔ اب اس جگہ مزید ٹھہرنا میری برداشت سے باہر تھا، میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہونے ہی والا تھا کہ وہ عورت دوسرے کمرے سے نکلی، ٹی وی آف کیا اور باتھ روم چلی گئی۔ یہ نکل بھاگنے کے لیے سنہری موقع تھا۔ میں نے جیسے ہی ڈبوں کے عقب سے نکلنے کا ارادہ کیا، اسی لمحے باتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئی۔ کچھ دیر تک وہ ریفریجریٹر اور کچن میں چیزیں رکھتی رہی۔ پھر بیرونی حصے کی بتی آف کر کے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ ہر طرف ہلکی نیلگوں روشنی پھیل گئی۔ میں نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا پھر آہستہ سے باہر نکل آیا، باہر نکل کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ دروازے میں اندر سے تالہ لگا ہوا تھا، حیرت ہے کہ میں نے تالا لگنے کی آواز نہیں سنی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ تالا اب چابی کے بغیر نہیں کھل سکتا تھا اور چابی عورت کے پاس تھی--- آخری چارہ کار کے طور پر میں اس کے کمرے میں داخل ہو گیا، میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی، وہ اتنی حیران اور حواس باختہ تھی کہ چیخ کے لیے اس کا منہ کھلا تو پھر کھلا ہی رہ گیا۔

O

''دیکھو، بی بی ---!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں ہوں، حالات کا ستایا ہوا آدمی ہوں۔ اپنے دشمنوں اور پولیس سے بچ کر میں نے تمہارے فلیٹ میں پناہ لی تھی۔ خدا کے لیے آہستہ سے دروازہ کھول کر مجھے باہر نکال دو۔ تمہارا شوہر آ جائے گا تو میرا یہاں سے نکلنا تمہارے حق میں مشکوک ہو جائے گا---''

میری باتوں سے اس کے اوسان بحال ہو گئے، اس کا کپکپاتا ہوا وجود جیسے اپنے قدموں پر مستحکم ہو گیا اور اس کا دہشت زدہ چہرہ نارمل ہونے لگا۔

''تم اندر کیسے آئے؟'' بالآخر اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''صبح جب تم باہر سے کنڈی لگا کر پڑوس میں گئی تھیں تو اسی وقت میں پولیس سے بچتا ہوا یہاں آیا تھا۔'' میں نے صاف بتا دیا۔

''تم صبح سے یہاں تھے ---؟'' وہ حیرت سے لرز کر بولی۔ ''کہاں تھے تم --- کس جگہ چھپے ہوئے تھے؟''

''تمہارے اسٹور میں، ڈبوں کے پیچھے ---'' میں نے اطمینان سے بتایا۔

''اُف میرے خدا ---!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور چکرا کر بیڈ کے کنارے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''کون ہو تم ---؟'' بالآخر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھتے ہوئے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔

''بتایا تو ہے کہ میں حالات کا ستایا ہوا ایک دیہاتی آدمی ہوں''۔ میں نے کہا۔ ''بڑی لمبی کہانی ہے۔ سنانے بیٹھا تو رات گزر جائے گی اور میں اب مزید ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ ٹھہرا تو اگلی صبح دن کی روشنی میں پکڑا جاؤں گا---''

''مگر ---'' وہ تذبذب آمیز لہجے میں بولی۔ ''اس وقت تم کیسے جاؤ گے؟--- اول تو کوریڈور میں تیز روشنی ہوتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ سیڑھیوں کا گیٹ رات کو بند ہو جاتا ہے، چابی چوکیدار کے پاس ہوتی ہے۔ وہ سیڑھیوں کے پاس اپنی چارپائی بچھا کر سوتا ہے---''

''کسی طرح اس سے چابی لے کر مجھے باہر نکال دو۔'' میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے راستہ بتا دو کہ میں کس طرف سے گزر کر کسی ہوٹل تک پہنچ سکتا ہوں۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی---''

ایک طویل القامت، مضبوط تن و توش کے جوان آدمی کو بچوں کی طرح گڑگڑاتے دیکھ کر اس کی کھوئی ہوئی توانائیاں جیسے لوٹ آئیں۔ میرے لہجے کی سچائی نے اسے متاثر کر دیا۔

''بہت ناممکن ہے---'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''اول تو میں نیچے جا کر چوکیدار سے چابی نہیں مانگ سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم نے بھی اس سے چابی لینے کی کوشش کی تو پھنس جاؤ گے۔ فلیٹ کے مکینوں نے چندہ کر کے اسے ایک جدید رائفل خرید کر دی ہے۔ وہ نڈر اور نمازی آدمی ہے، گولی چلانے میں لمحہ بھر کی تاخیر بھی نہیں کرے گا''۔

''پھر---'' میں نے مضطربانہ انداز میں پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں، یہاں سے کیسے نکلوں--- اگر تمہارا شوہر آ گیا تو پھر کیا ہوگا---؟''

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی، نفی میں سر ہلاتی رہی جیسے اس کی کچھ سمجھ میں نہ کر آ رہا ہو۔

''عجیب مصیبت ہے—'' وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ''میں کیا کروں— سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟'' پھر جیسے کسی خیال کے تحت اس کے چہرے پر اعتماد کی روشنی پھیل گئی۔ ''دیکھو—'' اس نے آہستہ سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم مجھے سچ مچ یقین دلا دو کہ تم ایک شریف اور بے ضرر انسان ہو، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے تو میں سوچوں گی کہ فوری طور پر تمہارے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے—''

میں فرش پر بیٹھ گیا۔

''بی بی—!'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''— نہ میں شریف ہوں، نہ بے ضرر ہوں لیکن تمہیں قسم کھا کر یقین دلا سکتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے ایک پریشان حال آدمی سمجھو جسے اپنی جان بچانے کی فکر پڑی ہوئی ہے—''

وہ چند لمحوں تک میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر اس نے الماری کھول کر چادریں اور تکیے نکالے۔

''یہ لو—'' اس نے یہ سامان میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''خاموشی سے ٹی وی والی میز کے پاس بستر بچھا کر سو جاؤ۔ صبح ہی صبح چوکیدار چلا جائے گا تو میں کوریڈور کا جائزہ لے کر تمہیں باہر نکال دوں گی''۔

O

میں نے اظہارِ ممنونیت میں سر جھکا دیا کہ وہ خوفزدہ ہونے کے باوجود انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار تھی۔ پھر میں نے ٹی وی والے میز کے پاس بستر بچھا لیا، تکیے پر سر رکھا اور کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں، نیند شدید تھی کہ نرم تکیے پر سر رکھتے ہی میرا ذہن نیند کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس عورت کی طرف سے ذرا بھی خدشہ میرے دل میں پیدا نہیں ہوا کہ وہ میرے بارے میں فون پر پولیس کو اطلاع دے سکتی ہے یا مجھے گہری نیند میں پا کر چوکیدار اور پڑوسیوں کو مطلع کر سکتی ہے۔ اس کے لیے ہر بات ممکن تھی کیونکہ وہ اس فلیٹ کی مکین تھی اور میں یہاں بالکل اجنبی تھا— صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ کچن سے میرے لیے ناشتہ بنا کر باہر نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کی دور دور تک کوئی علامت نہیں تھی اور دن کی روشنی میں اسے دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ رات والی خوفزدہ عورت ہے۔ اس کا چہرہ نکھرا نکھرا اور پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ وہ دبلی پتلی عورت تھی مگر اتنی جاذب نظر اور پُر کشش کہ کسی بھی مرد کا اسے دیکھ کر بے چین ہو جانا فطری امر تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ رات کو زیرو وولٹ کے نیلگوں بلب کی روشنی میں مجھے اس کے چہرے اور سراپا کا اچھی طرح جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ میری نیند اچاٹ ہو سکتی تھی اور میرا ایمان ڈگمگا سکتا تھا— اس نے ناشتہ میز پر رکھ دیا اور ایک کرسی کھینچ کر میز کے ساتھ لگا دی، کہنے لگی۔

''ہاتھ منہ دھو کر جلدی سے ناشتہ کر لو— ساڑھے سات بج گئے ہیں—''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا واقعی صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔

''تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں—'' میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

وہ آہستہ سے بولی۔ ''جگایا اس لیے نہیں کہ تم بے خبر سو رہے تھے، غالباً بہت تھکے ہوئے تھے — بہر حال جلدی سے باتھ میں دھو کر ناشتہ کر لو، کہیں ناشتہ ٹھنڈا نہ ہو جائے —''

میں جلدی سے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا، باہر نکلا تو میز کے گرد دوسری کرسی بھی رکھ دی گئی تھی اور وہ خاموشی سے بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی، قریب ہی دیوار گیر ہینگر پر ایک استری شدہ شلوار سوٹ نظر آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

''آؤ، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے — اس کے بعد تم میرے بھائی کا سوٹ پہن لینا۔ تمہارے کپڑے بہت میلے اور داغ دار ہیں، یہ تمہیں مشکوک بنا دیں گے''۔

نہا دھو کر میں بھی تر و تازہ ہو گیا تھا، چہرے پر بھی بہت چمک آ گئی تھی۔ وہ تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ناشتے کی پلیٹیں میری طرف سرکائیں اور ہم خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔

''اگر کوئی آ جائے —'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''تو خاموشی سے باتھ روم میں چلے جانا''۔

''ٹھیک ہے —'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''تمہارے شوہر نہیں آئے؟''

وہ چپ رہی۔

''کہاں ہیں تمہارے شوہر، آئے کیوں نہیں —؟'' میں نے پھر پوچھا۔ ''آتے کیسے —'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''کیسے آ سکتے تھے —؟''

''کیوں —؟'' میں نے ناشتہ سے ہاتھ روک لیا۔

وہ کچھ دیر تک چپ رہی، پھر بولی۔ ''انہوں نے مجھے طلاق دے دی ہے''۔

''کیوں دے دی طلاق —'' میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ''اتنی اچھی اتنی پیاری بیوی کو طلاق دینے والا شخص کتنا بے وقوف اور ظالم ہو گا، لعنت ہے اس پر —؟''

''چھوڑو —'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''جانے دو یہ قصے — عورت کی زندگی ہی دکھ سہنے کے لئے ہوتی ہے۔ کبھی وہ کم جہیز لانے پر شوہر اور سسرال کے ہاتھوں ذلیل ہوتی ہے، کبھی اولاد نہ ہونے پر طلاق یا سوتن کے عذاب سہتی ہے''۔

میں نے دو چار لقمے مزید زہر مار کئے، پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے بھائی کے سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے باتھ روم میں جا کر سوٹ پہن لیا، وہ لمبائی میں کم تھا لیکن اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے پرانے لباس کی جیبوں سے خنجر اور رقم کو نئے سوٹ کی جیبوں میں منتقل کیا اور باہر نکلا تو وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی — کہنے لگی۔

''میں باہر نکل کر دیکھ چکی ہوں، کوریڈور میں بہت سی عورتیں اور بچے جمع ہیں — بچے کھیل رہے ہیں، عورتیں باتیں کر رہی ہیں اور کم از کم آدھ پون گھنٹے تک یہی حال رہے گا''۔

''کوئی بات نہیں۔۔۔'' میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''میں انتظار کرلوں گا۔۔۔''

''تمہارے جانے کی مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔۔۔'' وہ قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اگر کوئی آ گیا تو کیا ہوگا؟ جب میں فلیٹ میں موجود ہوتی ہوں تو عورتیں اکثر آتی رہتی ہیں''۔

''تم کہیں ملازمت کرتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک دفتر میں ملازم ہوں، پرائیوٹ فرم ہے لیکن اچھی تنخواہ دیتے ہیں۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟۔۔۔ دیکھو تو بھلا، رات سے تم یہاں ہو مگر میں نے اب تک تم سے تمہارا نام نہیں پوچھا۔۔۔''

جی میں تو آیا کہ میں جھوٹ بول دوں، اسے اپنا کوئی فرضی نام بتادوں لیکن اس کے اعتماد کو دھوکہ دینا اپنے ضمیر کو قتل کرنے کے مترادف تھا لہٰذا میں نے اسے صاف بتادیا۔

''نبی بخش جنگی ہے میرا نام۔۔۔''

''میرا نام نفیسہ بانو ہے۔۔۔'' اس نے بتایا ''۔۔۔ اور میرے بیڈ کے سرہانے میرے شوہر کی نہیں، میرے شادی شدہ بھائی کی تصویر ہے۔ وہ مجھے بیحد عزیز رکھتے ہیں اور اس شہر کے مشہور بیرسٹر ہیں۔۔۔ بیرسٹر عطاالرحمٰن شیخ!''

اب اپنے بارے میں کوئی بات صیغہ راز میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک مرتبہ زبان کھولی تو پھر اپنے بارے میں بتاتا گیا۔ گوٹھ محمد صادق سے کراچی اور پھر کراچی سے گوٹھ صادق کے راستے سے واپسی اور فرار۔۔۔ وہ غور سے میری باتیں سنتی رہی اور بیچ بیچ میں حیرت سے چونکتی رہی۔ بار بار اس کے منہ سے ''اوہ!'' نکلتا۔ میری بے ربط اور بے ترتیب کہانی جاری تھی کہ وہ اٹھ کر دروازے تک گئی، کان لگا کر باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھولا، کوریڈور میں جھانک کر دیکھا اور دروازہ بند کر کے میری طرف پلٹی۔۔۔ اب اس کی زبان اور آنکھیں بول رہی تھیں تاہم اس نے آہستہ سے کہا۔

''کوریڈور میں تو کوئی بھی موجود نہیں۔۔۔ لیکن نبی بخش جنگی! تم کہاں جاؤ گے؟''

وہ دروازے سے پشت لگائے اس طرح کھڑی تھی جیسے میرا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی ہے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں، کیا کروں لیکن جب میں اپنی کرسی سے کھڑا ہوا تو وہ دروازے سے ہٹ گئی اور میں دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔

O

اس کے قریب پہنچ کر میں رک تو گیا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں؟۔۔۔ وہ میری محسنہ تھی، ایک اجنبی جوان مرد کو اس نے اندھا اعتماد کر کے ساری رات اپنے فلیٹ میں بسر کرنے کی اجازت دی تھی۔ وہ جانتی تک نہیں تھی کہ چوروں کی طرح اس کے فلیٹ میں داخل ہو کر چھپنے والا شخص حقیقت میں کون ہے اور محض اس نے میرے چہرے مہرے اور میری باتوں سے مجھ پر اعتبار کرلیا تھا۔ اس نے شاید اپنی زندگی کا سب سے بڑا رسک لیا تھا اور اب مجھے اس نیک دل اچھی عورت سے رخصت ہو کر باہر پھیلی ہوئی دنیا میں جانا تھا جہاں ہر طرف اجنبیت رچی ہوئی تھی اور اجنبی لوگوں کے

اس جنگل میں موت میری گھات لگائے بیٹھی تھی۔۔۔ میں بے ساختہ اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا، میرے جیسا لحیم شحیم اور قد آور، قوی اور توانا شخص ایک دھان پان سی دبلی پتلی عورت کے قدموں میں جھک گیا تھا۔۔۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''نفیسہ بی بی! مجھے نہیں معلوم، قسمت نے تمہاری جیسی اچھی عورت کے ساتھ اتنا ظلم کیوں کیا کہ تمہاری زندگی تباہ کردی لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ میں جہاں جاؤں گا، تمہیں یاد رکھوں گا اور زندگی نے کسی قابل بنایا تو تمہارے اس احسان کا بدلہ ضرور اتاروں گا، یہ نبی بخش جنگلی کا تم سے وعدہ ہے۔۔۔''

نفیسہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی، پھر آہستہ سے بولی۔

''آہستہ۔۔۔ خدا کے لئے آہستہ بولو۔ کسی نے سن لیا تو میری ساری شرافت اور ساری پاکبازی خاک میں مل جائے گی۔۔۔ سنو، میری بات سنو!۔۔۔ اٹھو اور آؤ، کرسی پر میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔۔۔'' میں ہپناٹائزڈ آدمی کی طرح دھیرے دھیرے اٹھا، خاموشی سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ نفیسہ بانو دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ''تمہاری کہانی سننے سے پہلے میں دل ہی دل میں ڈر رہی تھی، رات بھر اپنے خدا سے دعا مانگتی رہی تھی کہ پروردگار! میری عزت محفوظ رکھنا۔ میں نے ایک نیکی کی ہے، اس کے صلے میں دنیا کے سامنے مجھے رسوا نہ کرنا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری لاج رکھی، میری عزت محفوظ رہی۔۔۔ اب تمہارے منہ سے تمہاری پوری کہانی سن کر میں سوچ میں پڑ گئی ہوں۔ رات تک تم میرے لیے ایک خطرناک چور ڈاکو کی حیثیت رکھتے تھے لیکن تمہارے کردار کی مضبوطی اور تمہاری شرافت نے مجھے متاثر کر دیا ہے۔۔۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں، تم یہیں بیٹھے رہنا۔۔۔''

یہ کہہ کر اٹھ کر کمرے میں چلی گئی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں زنانہ پرس تھا۔ پرس کھول کر اس نے میرے سامنے رکھ دیا اور بولی۔

''اس میں جو کچھ ہے، اسے تم لے لو۔۔۔ تم پردیس میں ہو، تمہیں پیسوں کی ضرورت پڑے گی اور نقد رقم کے علاوہ اس میں میری سونے کی چوڑیاں اور شادی کی ایک انگوٹھی بھی ہے۔۔۔ بس میں اتنی ہی تمہاری مدد کر سکتی ہوں، اس سے زیادہ کی کوشش کروں گی تو مشکلات میں پڑ جاؤں گی۔ پھر میں کسی کے سامنے وضاحت نہیں کروں گی کہ میں تم سے کیسے متعارف ہوئی اور تمہاری مدد کیوں کرنا چاہتی ہوں۔۔۔''

یہ کہہ کر اس نے کھلا ہوا پرس میری گود میں ڈال دیا۔۔۔ بے ساختہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میرا گلا رندھ گیا اور بولنا چاہا تو الفاظ حلق میں پھنس گئے۔ خود پہ قابو پانے کے لیے حلق صاف کیا تو آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو ڈھلک کر رخساروں پر گر پڑے۔

''نفیسہ بیگم۔۔۔!'' میں گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''پیسے میرے پاس موجود ہیں، مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ساری کہانی میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ اب مجھ پر صرف ایک احسان کرو، مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟''

وہ چند لمحے تک کچھ سوچتی رہی، پھر بولی۔

''میں چاہوں تو اتنے بڑے شہر میں تمہاری رہائش کا کہیں بھی بندوبست کر سکتی ہوں۔ کسی کے گھر یا دکان یا فرم میں تمہیں ملازم رکھوا سکتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں کسی کو کیا بتاؤں گی؟۔۔۔ خود سوچو کہ جن حالات میں ہم دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا ہے کیا وہ کسی کو بتائے جا سکتے ہیں اور اگر میں کوئی جھوٹ گھڑ بھی لوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کبھی میرا جھوٹ ایکسپوز نہیں ہوگا۔۔۔ جس قسم کے تمہارے

حالات ہیں، ان میں کسی بھی قسم کا واقعہ رونما ہوسکتا ہے۔ میں آسانی سے تمہیں اپنے بھائی کے پاس بھیج سکتی تھی مگر یہ قانونی معاملہ نہیں ہے۔ تم جن حالات میں گوٹھ سے نکلے ہو اور مجھ تک پہنچے ہو اس کے درمیان ایک الجھا دینے والی کہانی ہے جس کا افشا ہونا تمہارے حق میں کسی صورت بھی مفید نہیں لہٰذا نبی بخش جنگی! بہتر یہ ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ اور جو کچھ میں تمہیں دے رہی ہوں، اسے میرا اظہارِ تشکر سمجھ کر قبول کرلو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "شریف رہنے کی قیمت وصول کرنا دنیا کی سب سے بڑی بدمعاشی ہے اور میں یہ بدمعاشی کبھی نہیں کرسکتا۔۔۔ بس اتنا احسان کرو کہ مجھے اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ دے دو تاکہ میں کسی وقت تمہیں فون کرسکوں۔۔۔"

یہ کہہ کر میں اٹھا اور پرس میز پر رکھ دیا۔۔۔ نفیسہ چند ثانیوں تک کچھ سوچتی رہی پھر اس نے کمرے میں جا کر اپنے بھائی کا ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا۔۔۔ تھوڑی دیر تک پھر سوچ میں ڈوبی رہی اور آخر قلم نکال کر کارڈ کی پشت پر اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ دیا۔ نمبر لکھتے ہوئے اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں، وہ گہرے تذبذب اور اندرونی کش مکش کا شکار تھی۔ پھر کارڈ اس نے میری طرف بڑھا دیا۔

"اسے بہت احتیاط سے رکھنا۔۔۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں، کبھی ظاہر نہ ہونے دینا کہ میری کبھی تم سے ملاقات ہوئی تھی۔۔۔"

میں نے کارڈ احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ نفیسہ اب بھی کسی سوچ، کسی تذبذب میں ڈوبی جہاں کی تہاں ساکت کھڑی تھی، شاید سوچ رہی تھی کہ ایک اجنبی پر اندھا اعتماد کرکے اور اسے اپنا فون نمبر دے کر اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ اس کا اندرونی کرب اور بے چینی اس کی آنکھوں اور اس کی پیشانی سے ہویدا تھی۔۔۔ آخر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، جھانک کر باہر دیکھا اور سر کی جنبش سے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

"خدا حافظ۔۔۔"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر گلوگیر آواز میں کہا اور ایک جست میں کمرے سے باہر نکل کر کوریڈور میں پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دو ننھے بچوں کے علاوہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا، بچے کھیل رہے تھے اور انہوں نے ایک نظر میری طرف دیکھا ضرور لیکن کوئی خاص توجہ نہیں دی بلکہ پھر اپنے کھیل میں مگن ہوگئے۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک شخص نیچے سے اوپر کی طرف آرہا تھا، سیڑھیوں پر رک کر بلکہ میری طرف گھوم کر ایک نظر اس نے مجھے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ شاید پوچھنا بھی چاہتا ہو کہ میں کون ہوں، کہاں سے آرہا ہوں لیکن میں اسے نظر انداز کرتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ نیچے پہنچ کر تیزی سے میں نے آہنی گیٹ عبور کیا اور کھوکھے کی مخالف سمت چل پڑا۔۔۔ باہر لوگ چل پھر رہے تھے، یہ گنجان آبادی کے فلیٹ تھے لہٰذا کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ میری رفتار تیز تھی، سمت کا اندازہ نہیں تھا اور کہاں جانا ہے، کدھر مڑنا ہے، کچھ معلوم نہیں تھا۔ گلی آگے جا کر ایک بڑی سڑک پر کھلتی تھی جہاں چوک تھا۔ بسیں آجا رہی تھیں، لوگ خرید و فروخت کر رہے تھے اور خاصی چہل پہل تھی۔ میں غیر ارادی طور پر لپک کر ایک بس میں سوار گیا۔ بس روانہ ہوئی تو کنڈیکٹر تیر کی طرح میری طرف آیا اور بولا۔

"کہاں جانا ہے۔۔۔؟"

میں کیا بتاتا۔۔۔ کاش! نفیسہ سے اس علاقے کا نام، مختلف سڑکوں اور اسٹاپوں کے نام معلوم کرکے آتا تاکہ راستے میں دشواری نہ ہوتی اور

اب میں کنڈیکٹر کو بتاتا تو کیا بتاتا؟

''آخری اسٹاپ---''

بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ اس نے ٹکٹ کاٹ کے مجھے پکڑایا کچھ کھلے نوٹ میری اوپری جیب میں تھے، ان میں سے ایک نوٹ نکال کر میں نے اسے دے دیا۔

''کھلے پیسے ابھی پکڑاتا ہوں---''

یہ کہہ کر وہ دوسرے مسافر کی طرف متوجہ ہوگیا--- میرے ساتھ بیٹھا ہوا شخص مجھے بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمبوترے منہ اور ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا شخص تھا، کچھ دیر تک چپ بیٹھا رہا اور پھر بولا۔

''بھائی کہاں سے آئے ہو---؟''

''کیوں---؟'' میں نے خشک انداز میں اسے گھورا۔

وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ''آپ تو بھائی جی ناراض ہوگئے۔ پوچھنے میں کوئی ہرج ہے کیا؟--- بندہ بندے کے کام آتا ہے۔ مسافری میں ایک دوسرے سے بات کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے، یہ تو اخلاق ہے اپنا پنا--- دنیا سے اور کیا لے جانا ہے، یہی بول بچن ہیں اور کیا ہے---؟''

مجھے اس کا التجا آمیز لہجہ اچھا لگا--- وہ بتا رہا تھا کہ دنیا بڑی خود غرض ہوگئی ہے اور کسی کو خدا کا خوف نہیں، سب کو اپنی اپنی پڑی ہے اور پتا نہیں اس دنیا کا کیا بنے گا--- بس چلتی رہی اور وہ خاصی دیر تک دنیا کی بے ثباتی اور مطلب پرستی کے بارے میں باتیں کرتا رہا، درمیان میں اتنا وقفہ ہی نہیں چھوڑتا تھا کہ میں کوئی بات کرسکوں۔ پھر اتفاقاً اسے کھانسی آگئی تو میں نے کہا۔

''میں پردیسی آدمی ہوں کوئی اچھا سا ہوٹل بتاؤ---''

اس نے مجھے باہر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بلڈنگوں اور سڑکوں کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ فلاں بلڈنگ کا یہ نام ہے فلاں سڑک یہاں سے وہاں جاتی ہے اور فلاں ہوٹل ادھر ہے فلاں سرائے وہاں ہے۔ اسی اثناء میں اچانک اس کا سٹاپ آگیا اور وہ تیزی سے اٹھ کر بس سے اتر گیا۔ میں بھی اگلے ہی سٹاپ پر بس سے اتر آیا۔ یہ ایک بارونق بازار تھا، اردگرد کئی ہوٹل بھی نظر آرہے تھے، ٹریفک اور لوگوں کا رش تھا۔ میں ٹہلتا ہوا ایک ہوٹل کے باہر بچھی ہوئی بینچ پر بیٹھ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی، سوچا کہ کچھ کھا لینا چاہیے اور یوں بیرے سے معلومات بھی مل جائیں گی۔ تھوڑی دیر بعد ایک میلا کچیلا، ڈھیلا ڈھالا بیرا ڈولتا، ڈگمگاتا ہوا بینچ کے پاس آگیا اور میری طرف بیزاری سے دیکھ کر بولا۔

''ہاں جی، کیا کھاؤ گے؟--- مچھلی ہے، پلاؤ ہے، بریانی ہے، قورمہ ہے، قیمہ ہے، سبزی ہے، دال ہے، مغز ہے، کلیجی ہے--- بولو، جلدی آڈر دو۔''

''مچھلی لے آؤ---'' میں نے کہا۔

''اندر جا کر بیٹھو---'' بیرے نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ ''باہر کھانا وانا ہم نہیں دیتے، مالکوں کا آرڈر ہے---''

میں اندر جا بیٹھا— اس ہوٹل میں خاصا رش تھا۔ بیرے نے تھوڑی دیر بعد کھانا لا کر میز پر رکھ دیا اور میں خاموشی سے سر جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گیا— میں کھانا کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟— عجب اضمحلال اور بے دلی سی طاری تھی۔ جیسے تیسے میں نے کھانا ختم کیا۔ بیرہ بل لایا تو میں نے پوچھا۔

''یہاں ٹھہرنے کی بھی جگہ مل جاتی ہے—؟''

وہ بولا۔''بہت— کتنی چاہیے۔ ایک منجی، دو منجی، ایک بسترہ، دو بسترے؟''

''ایک منجی اور ایک بسترہ—''میں نے کہا۔

اس نے بل والی پلیٹ میرے آگے رکھ دی۔ بولا۔''پہلے کھانے کے پیسے دے دو—''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر دوسرے ہی لمحے اچھل کر کھڑا ہو گیا— میری جیب کٹ چکی تھی میں نے بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں کپڑے جھاڑنے شروع کر دیے، بیرہ بڑے غور سے میری حرکات وسکنات دیکھتا رہا اور پھر زہر آلود لہجے میں بولا۔

''میں اس قسم کے بہت سے ڈرامے دیکھ چکا ہوں— بند کرو یہ ناٹک بازی اور سیدھی طرح پیسے نکالو—''

پیسے ہوتے تو میں نکالتا، میری تو جیب کٹ چکی تھی— ہم دونوں کی بحث وتکرار سن کر دو مشٹنڈے سے بیرے بیچ میں کود پڑے۔ انہوں نے پہلے تو اکھڑ لہجے میں معاملہ پوچھا اور پھر میرے بولنے کا انتظار کیے بغیر ایک نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ دوسرا مکہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ ہوٹل کا مالک بھی شور سن کر قریب آ گیا۔ اس کے آتے ہی وہ دونوں شیر ہو گئے، ایک نے دانت کچکچا کر میرا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا اور بولا۔

''ارے بوت بدمعاش بنتا ہے نی، ابھی تمہارے کو پنچ لگاتا ہوں—''

میرا گریبان پکڑنے والا چیخ کر بولا۔''نکال پیسے— یہ تیرے باپ کا ہوٹل نہیں ہے''۔ میں نے گریبان چھڑانا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی، مجبوراً مجھے اس کی کلائی کو جھٹکا دے کر پرے ہٹنا پڑا مگر اگلے ہی لمحے وہ دونوں مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں چیختا رہ گیا کہ بھائی، میری بات سنو، بات تو سنو لیکن کسی نے میری بات نہیں سنی مجھ پر مکے اور تھپڑ برسنے لگے اس کشمکش کے دوران غالباً کسی نے چیخ کر کہا تھا۔

''یہ جیب کترا ہے مارو سالے کو—''

O

دونوں بیروں کے ساتھ مجھے مارنے والوں میں دو تین اور لوگ شریک ہو گئے۔ ان کا انداز بہت وحشیانہ تھا اور اگر میں اپنے ہاتھ پاؤں نہ چلاتا تو وہ مجھے توڑ پھوڑ کے رکھ دیتے— میں نے گوٹھ محمد صادق میں کبھی زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں چلائے تھے، صرف چند ایک دیہاتی کشتیوں میں حصہ لیا تھا اور ان میں بھی کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا لیکن یہاں معاملہ اپنی جان بچانے کا تھا۔ میرے اندر کا اجڈ دیہاتی ایک طنطنے کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ گریبان تھامنے والے کو ایک بھرپور مکے سے میں نے پرے دھکیلا اور اچھل کر دوسرے کو مکہ رسید کیا۔ تیسرا مجھے پشت سے قابو کرنے کی کوشش میں تھا، اسے اچھال کر میں نے سر سے اونچا پھینکا تو وہ گاہکوں کی میز پر جا کر گرا۔ میرے بازوؤں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں، انگلیاں لوہے

کا شکنجہ بن گئی تھیں اور غصہ تھا کہ انگ انگ میں شعلے بھڑکا رہا تھا۔ اس ہنگامے میں کئی میزیں دہری ہوگئیں، کئی کرسیاں الٹ گئیں، گریبان تھامنے والے کے دانت ٹوٹ گئے، منہ سے خون ابل پڑا اور باقی کا حشر بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ ہوٹل کا مالک بھاگ کر علاقے کے ایک ایسے شخص کو بلا لایا جس کے بازو انتہائی مضبوط تھے البتہ سر گنجا تھا اور جسم پر دھاری دار بنیان تھی۔ اس کے آتے ہی مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا، لوگ دبک گئے۔ مجھ پر حملہ کرنے والے اپنی توانائیاں سمیٹ کر ایک بار پھر مجھ پر جھپٹے لیکن اس شخص نے آتے ہی گرج کر کہا۔

''بند کرواوئے، یہ لفڑے بازی—''

میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا، پٹنے والوں کا حلیہ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ پھر قریب آ کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھیں سفاک اور بے رحم تھیں، چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے، ناک کے بانسے پر ایک گہرا نشان تھا جو اس کے چہرے کو مزید بھیانک بنا رہا تھا— چند لمحوں تک وہ مجھے گھورتا رہا تھا پھر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے وہ ہوٹل کی چوبی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر ایک بالکونی سی بنی ہوئی تھی جس میں چند صوفے پڑے ہوئے تھے۔ یہ صوفے میلے اور بوسیدہ تھے اور بالکونی کا پردہ بھی خاصا پرانا تھا۔ درمیان میں رکھی ہوئی میز پر ایک بڑی سی ایش ٹرے پڑی تھی، وہ سفاک آنکھوں والا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ صرف ہوٹل کا مالک اوپر آیا تھا۔ بیرے اور دوسرے لوگ نیچے کھڑے تھے اور اچک اچک کر بالکونی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''بیٹھو—'' اس نے ایک صوفے کی اشارہ کیا۔ ''دلیر لوگ مجھے پسند ہیں۔ تمہارا لڑائی کا اسٹائل اچھا ہے مگر کچا ہے— تمہیں پہلے اس علاقے میں نہیں دیکھا، کون سا علاقہ ہے—؟''

غالباً وہ مجھے کوئی بدمعاش سمجھ رہا تھا، میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کہا۔

''میرا جھگڑے فساد سے کوئی تعلق نہیں— میں پردیسی آدمی ہوں، سر جیب کٹ گئی ہے لہٰذا کھانے کے پیسے ادا نہ کر سکا اور اس لیے لڑائی ہوگئی۔''

''لڑائی اچھی ہوئی ہے—'' اس نے چمڑے کا سگریٹ کیس نکال کر اپنا سگریٹ سلگایا اور ایک سگریٹ میری طرف بڑھایا۔ ''سگریٹ پیو— اپنا علاقہ تم نے اب تک نہیں بتایا؟'' وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

''میرا کوئی علاقہ نہیں ہے جناب!'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں بتا چکا ہوں کہ لڑائی مار کٹائی میرا میدان نہیں ہے—''

''مجھے معلوم ہو چکا ہے—'' ہوٹل کا مالک کڑوے لہجے میں بولا۔ ''تمہارا میدان جیب تراشی ہے— عبدل مجھے بتا رہا تھا کہ تم پکے جیب تراش ہو، جیبیں کاٹتے ہو اور اوپر سے بدمعاشی کرتے ہو— جانتے ہو یہ علاقہ کس کا ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''یہ علاقہ اژن سانپ کا ہے—'' ہوٹل کا مالک چبا چبا کر بولا۔ ''اژن سانپ علاقے کا بادشاہ ہے، کوئی مائی کا لال یہاں دم نہیں

مار سکتا--- یہ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں یہ اُڑن سانپ کے نائب ہیں باؤ صدیق---!"

"میرا نام رحیم بخش ہے---" میں نے لاپرواہی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "حیدرآباد میں چوڑیوں کا کاروبار ہے لیکن میرا بدمعاشی سے کوئی تعلق نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو---"

باؤ صدیق نے یکا یک اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا اور ایک کھٹکے سے اس کا بڑا سا چمکدار پھل باہر نکل آیا، چاقو لہراتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سالے کتے کے پلے! جھوٹ بولتا ہے---؟"

O

گالی ابھی اس کے ہونٹوں پر تھی کہ میرا خون بھی جوش کھا گیا۔ پھر اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں ہے، میں اس پر جھپٹ پڑا۔ میری پہلی لات اس کے چاقو والے ہاتھ پر پڑی، دوسری پیٹ پر--- چاقو اچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور وہاں سے پھسل کر صوفے پر گر گیا--- باؤ صدیق کے انداز بتاتے تھے کہ وہ آسانی سے اپنی شکست نہیں تسلیم کرے گا۔ اس نے اچھل کر میرے پیٹ میں ٹکر رسید کی اور اگر تیزی سے گھوم کر بالکونی کی ریلنگ سے نہ لگ جاتا تو اس کی ٹکر میرے لیے خوفناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے پہلو بچا کر ایش ٹرے اٹھالی، یہ بھاری ایش ٹرے میرے پنجے میں پھنس کر جب اس کے چہرے سے ٹکرائی تو پورا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ ہم دونوں وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کو ٹکریں مارنے اور بالکونی سے نیچے پھینکنے کی جدوجہد کرنے لگے--- بیشک باؤ صدیق قوی تھا، اسے لڑنے بھڑنے کا خاصا تجربہ تھا مگر میں بھی موم کا بنا ہوا آدمی نہیں تھا اور اس کا اندازہ تھوڑی دیر بعد باؤ صدیق کو ہو گیا۔ یہ تاثرات اس کی آنکھوں میں صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ لڑائی کے ابتدائی لمحوں میں اس کا پلہ بھاری تھا مگر اب میں اس پر حاوی تھا اس کی سلطنت چھن رہی تھی لہٰذا وہ تابڑ توڑ حملوں کے ساتھ اپنی ساکھ بچانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ میری کوئی سلطنت نہیں تھی میں بے یار و مددگار تھا مجھے اپنی جان بچانی تھی اور جان بچانے والے کی جنگ ہمیشہ خوفناک ہوتی ہے--- ہوٹل کا مالک اس عرصے میں بالکونی سے جھک جھک کر چیخ چیخ کر بیروں کو آوازیں دے رہا تھا۔

"ارے عبدل--- اوئے بشیرے--- اُڑن سانپ کو بلاؤ فوراً--- فوراً---"

میں نے ایک زوردار لات اس کی پنڈلی پر رسید کی تو وہ لڑھک کر سیڑھیوں کے ستون سے ٹکرایا اس کا سر پھٹ گیا۔ باؤ صدیق سے مدافعت کی جنگ لڑنے کی بجائے اب میں بڑھ چڑھ کر اس پر حملہ کر رہا تھا۔ اسی کشمکش کے دوران اس کی انگلیاں میری انگلیوں میں پھنس گئیں۔ میں نے پوری قوت سے زور لگایا۔ اس کے بازو بہت جاندار تھے مگر میرے بازوؤں سے زیادہ نہیں، تھوڑی دیر بعد اس کے بازو دہرے ہونے لگے تھے۔ اس نے دو ایک مرتبہ لات گھما کر مجھے پرے دھکیلنے کوشش کی مگر اس کی انگلیاں میرے آہنی شکنجوں میں پھنسی ہوئی تھیں اور عنقریب اپنے جوڑوں سے علیحدہ ہونے والی تھیں، پسینہ اس کے مساموں سے بارش کے قطروں کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا--- بالآخر اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''چھوڑ دو مجھے --- میرے جوڑ ہل گئے ہیں''۔

میں نے پوری قوت سے اس کے پنجے مروڑتے ہوئے پھولے پھولے سانسوں میں کہا۔

''بلاؤ اپنے اُڑن سانپ کو میں اس کا بھی یہی حشر کرنا چاہتا ہوں --- میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ بدمعاشی کے معنی کیا ہوتے ہیں اور بدمعاش کسے کہتے ہیں ---''

باؤ صدیق بے دم ہو گیا تھا اب وہ شدید کرب کے عالم میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا --- یکا یک چوبی سیڑھیوں پر قدموں کی دھپ دھپ سنائی دی، پھر یکے بعد دیگرے دو تین ہوائی فائر ہوئے اور اڑن سانپ چوبی زینے پر نمودار ہوا۔ وہ اوسط جسامت کا ایک انتہائی سادہ نین نقش رکھنے والا آدمی تھا مگر اس کے چہرے پر سب سے خوفناک اس کی آنکھیں تھی جو سانپ کی طرح چمکدار ساکت اور پُر اسرار تھیں۔ اڑن سانپ گہرے نیلے رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں ماؤزر تھا۔

''میرے آدمی پر ہاتھ کس نے اٹھایا --- ؟'' اس نے آتے ہی انتہائی ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

اس وقت میں اپنے جنون کی انتہاؤں پر تھا، میرے اندر کا جنگی بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے بے خوف لہجے میں کہا۔

''ہاتھ اٹھانے والا تمہارے سامنے کھڑا ہے''۔

''چھوڑ اسے ---'' وہ آخری زینے سے اوپر آتے ہوئے بولا۔ ''اسے چھوڑ دو اور مجھ سے بات کرو۔'' ماؤزر کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''پستول ایک طرف رکھ کر بات کرو ---'' میں نے دھڑلے سے کہا۔ ''تمہیں شرم آنی چاہیے، پستول کے زور پر بدمعاشی کرتے ہو؟ --- میری طرح خالی ہاتھ دلیری دکھاؤ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ بدمعاشی کیا ہے --- ؟''

اُڑن سانپ کی آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں چہرہ تاثرات سے خالی تھا اور ماؤزر کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نشانہ لیے بغیر ایک فائر کیا اور گولی میرے سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو چھوتی ہوئی دیوار میں دھنس گئی، دوسرے ہی لمحے اس نے ماؤزر اپنے قدموں کے پاس پھینک دیا اور ایک شاہانہ انداز میں کمر پر ہاتھ رکھ کر مجھے گھورنے لگا۔ میں نے باؤ صدیق کو چھوڑ دیا اس کی حالت بیحد ابتر ہو چکی تھی۔ وہ ڈولتا ڈگمگاتا بلکہ گھسٹتا ہوا بڑی مشکل سے اٹھا اور ایک صوفے پر گر پڑا۔ اُڑن سانپ کی زہریلی پُر اسرار اور منجمد آنکھیں میرے وجود میں اترتی چلی جا رہی تھیں۔

''کیا نام ہے تمہارا ---'' بالآخر اس نے مہرِ سکوت توڑ دی۔ ''کس کے آدمی ہو؟''

''نام رحیم بخش ہے ---'' میں اپنے جھوٹ پر قائم رہا۔ ''اور اللہ کے سوا کسی کا آدمی نہیں''۔

''اصل معاملہ بتاؤ ---'' وہ طمطراق کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ہوٹل کا بل ادا نہیں کر سکا، جیب کٹ گئی تھی ---'' میں نے لباس جھاڑتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے قریب جا کر بولا۔ ''اس طرح مجھ سے بات مت کرو۔ میرے پاس زبان نہیں، ہاتھ ہیں ---''

''بیٹھ جاؤ ---'' اس نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ صوفے سے چاقو بھی اٹھایا اور کھلے ہوئے چاقو کی دھار پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر وہ

باؤ صدیق کی طرف متوجہ ہوا جو کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''باؤ صدیق ---!''

وہ چبھتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں بولا۔ ''ورکشاپ میں جا کر آرام کرو، ہم تھوڑی دیر بعد وہاں آ رہے ہیں --- اور ہاں، سنو! نیچے جتنے لوگ بھی جمع ہیں، سب کو گم کرو۔ اپنے آدمیوں کو کہہ دو کہ کام پر چلے جائیں --- کوئی اوپر نہیں آئے گا ---''

باؤ صدیق بڑی مشکل سے اٹھا۔ میں نے اس کے پنجوں اور کندھوں کے جوڑ ہلا دیئے تھے --- بیشک وہ ایک قوی اور مضبوط آدمی تھا مگر میرے اندر چھپی ہوئی طاقت کا اس نے غلط اندازہ لگایا تھا --- دھیرے دھیرے اثباتی انداز میں سر ہلاتا ہوا وہ زینے کی طرف بڑھ گیا، جاتے جاتے اس نے مجھے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں زخمی سانپ کا غیض و غضب تھا جس میں جسمانی طور پر پسپا ہونے کا گہرا طیش اور دکھ بھی شامل تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ''ہونہہ'' کہا اور فرش پر پڑا ہوا ماؤزر اٹھا کر اُژن سانپ کے سامنے بیٹھ گیا۔

''مجھے اکھڑ، بدتمیز اور جھگڑالو لوگ حد درجہ پسند ہیں ---'' اُژن سانپ نے چاقو کی نوک سے میز پر ایک گہری لکیر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میرا کام ہی ایسا ہے اس لائن میں جی جناب نہیں چلتی --- میری بدمعاشی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے مخاطب کو مشتعل کر دو اور اس کے حملے سے پہلے اس پر وار کر دو لیکن ---'' وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔ ''لیکن کبھی کبھی یہ اصول غلط ثابت ہوتا ہے، کم از کم تمہارے معاملے میں ---'' وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک چپ رہا پھر چاقو میز پر جما کر مصافحے کے انداز میں ہتھیلی میری طرف پھیلا دی۔ ''ہاتھ ملاؤ --- تم ایک جی دار آدمی ہو ---''

میں نے ماؤزر اپنی جیب میں رکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اوسط قد و قامت کے اس شخص کی انگلیوں میں بڑی جان تھی جیسے لوہے اور اسٹیل کا بنا ہوا ہاتھ تھا۔ میں نے بھی اپنی طاقت کا تھوڑا سا مظاہرہ کیا۔ اس نے ستائشی انداز میں سر ہلایا اور مجھے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں زندگی کی جھلک نظر آئی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا مگر اسے مسکراہٹ تو نہیں کہا جا سکتا۔ بس ہونٹوں کے دائیں گوشے پر مدھم سی لکیر نظر آئی اور فوراً معدوم ہو گئی۔

''میرا اصلی نام صمد خان ہے ---'' اس نے بتایا۔ ''لیکن دنیا مجھے اُژن سانپ کہتی ہے۔ یہ علاقہ میرا ہے ---'' اس نے قمیض کے نیچے ہاتھ ڈال کر چمڑے کی ایک مضبوط پیٹی کھولی۔ یہ مضبوط پیٹی پیتل کے کئی دندانے دار بٹنوں سے بنی ہوئی تھی جس میں ہک کی جگہ لوہے کا ایک پردار سانپ بنا ہوا تھا۔ ''یہ پیٹی مجھے استاد کریم نے دی تھی''۔ وہ دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ پیٹی نہیں، میرا ہتھیار ہے اور اسی ہتھیار کے ذریعے میں نے اپنی سلطنت قائم کی ہے --- صمد خان ایک گیراج کا مالک ہے، اس کے کارندے اس گیراج کے ملازم ہیں لیکن زیر زمین دنیا میں صمد خان اُژن سانپ ہے اور اس کے ملازم اس کے ساتھی ہیں --- بس میرا اتنا تعارف کافی ہے۔ اب میں جو کچھ پوچھتا جاؤں، بتاتے جاؤ ---''

''پوچھو ---'' میں نے پیٹی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری کسی سے دشمنی؟''

''ہے ---''

''پولیس سے بھاگے ہوئے ہو؟''

''ہاں---''

''کراچی میں رہتے ہو---؟''

''نہیں---''

''خیر، آؤ میرے ساتھ---'' اُڑن سانپ اٹھتے ہوئے بولا۔''ورکشاپ چل کے بیٹھتے ہیں۔ آج سے ہم دوست بن گئے ہیں، تم کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو---یہ بتاؤ، اس شہر میں تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟''

''کہیں بھی نہیں---'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''جگہ چاہتے ہو؟'' وہ مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''بالکل محفوظ، دشمنوں اور پولیس سے بالکل محفوظ---''

O

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میرے سر کی یہی جنبش جرائم کی دنیا میں میرے داخلے کا ٹوکن بن گئی---جب میں نے سر ہلایا تھا تو ایک محفوظ پناہ گاہ کے حصول کے لیے ہلایا تھا مگر پوچھنے والے کے اپنے مقاصد تھے جو آہستہ آہستہ مجھ پر بعد میں واضح ہوئے۔ اسے اپنے گروہ میں ایسے آشفتہ سروں کی ضرورت ہر دم رہتی تھی جو اس کے اشارے پر جان پہ کھیل سکیں، اس کی دہشت کو لوگوں کے دلوں پر قائم و دائم رکھ سکیں۔ وہ ایک سفاک، ظالم اور جابر جرائم پیشہ آدمی تھا۔ دوہرے قتل کے ایک مقدمے میں بری ہونے کے بعد اسے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ یہ قتل اس نے شہر کے ایک بارونق بازار میں کئے تھے اور استاد کریم کے اشارے پر کیے تھے لیکن استاد کریم کی دہشت کے سامنے استغاثہ کے گواہ مقدمے سے الگ ہو گئے یا کر دیے گئے۔ استغاثہ کی کہانی اتنی کمزور کر دی گئی کہ درجنوں چشم دید گواہوں میں سے ایک نے بھی اس ہولناک واردات کی شہادت نہیں دی تھی۔ پولیس کی ملی بھگت نے استاد کریم کے شاگرد اُڑن سانپ کی دہشت لوگوں کے دلوں پر بٹھا دی۔ جج ایک منصف مزاج اور دیانت دار آدمی تھا مگر وہ مقدمے کے فیصلے سے چار روز پہلے مخالف سمت سے آنے والی ایک گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہو گیا اور شاید یہ حادثہ بھی استاد کریم کے اشارے پر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں لایا گیا تھا کیونکہ جج نے ایک بار اپنے چیمبر میں مقتولین کے والدین سے کہا تھا کہ انہیں اُڑن سانپ کے مجرم ہونے میں ذاتی طور پر کوئی شبہ نہیں لیکن قانون گواہوں کے بیانات اور شہادتوں کی روشنی میں کسی جرم یا عدم جرم کا فیصلہ کرتا ہے اور اب تک شہادتوں اور بیانات کی روشنی میں اُڑن سانپ کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کا مجرم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ فیصلے کے دن تک کوئی ایسا نکتہ نکل سکے جس کے تحت اسے پھانسی کے تختے تک پہنچایا جا سکے کیونکہ صفائی کے گواہوں کے بیانات میں جھول محسوس ہو رہا ہے اور اسے میں بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔ جج کے یہ ذاتی ریمارکس مقتولین کے ورثاء کے منہ سے کسی ایسے شخص کے سامنے نکل گئے جو اُڑن سانپ اور استاد کریم کا مخبر تھا اور اس کی مخبری نے ایک معزز جج کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جرائم کی دنیا میں اُڑن سانپ نے اپنا مقام اس وقت بنایا جب ایک پارٹی سے تصادم کے نتیجے میں استاد کریم ہلاک ہو گیا، اس کے بعد استاد کا گیراج اور کارندے اس کی ماتحتی میں آ گئے۔ یہ ورکشاپ برائے نام ورکشاپ تھا جہاں گاڑیاں مرمت کی جاتی تھیں، حقیقتاً یہ جرائم پیشہ افراد کی کمین گاہ تھی جسے پولیس کے بعض اہلکاروں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس ورکشاپ کی چھت ٹین اور لوہے کی تھی لیکن

نیچے گتہ لگا ہوا تھا۔ کئی کمرے ایسے بنا دیے گئے تھے جن میں سے بیشتر میں ناکارہ گاڑیوں کا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا--- جب میں اُژن سانپ کے ساتھ نیچے اترا تو سڑک کے کنارے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے، سینکڑوں دہشت زدہ آنکھیں ہم پر مرکوز تھیں۔ پھر ہم جدھر سے گزرے، بھیڑ چھٹتی گئی اور لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میری طرف اشارے کئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم سڑک اور مختلف گلیوں سے گزر کر نسبتاً ایک کھلی جگہ پر آ گئے جہاں ایک بڑے سے احاطے میں کئی پرانی اور ناکارہ گاڑیاں کھڑی تھیں، بعض اچھی کنڈیشن کی گاڑیوں پر ترپالیں پڑی ہوئی تھی اور بعض پر کام ہو رہا تھا، کئی لوگ کام میں مصروف تھے مگر اُژن سانپ کو دیکھ کر لوگ ادب سے کھڑے ہو گئے، بعضوں نے اسے سلام بھی کیا، وہ سر کی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دیتا، کاٹھ کباڑ کے مختلف ڈھیروں سے گزرتا ہوا آفس روم میں آیا اور تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ ایسے ٹوٹے پھوٹے گیراج کا آفس اندر سے اتنا کشادہ اور سلیقے سے سجا ہوا ہوگا۔ اس بڑے سے دفتر کو لکڑی کی خوبصورت پارٹیشن اور چوڑے سفید شیشے کی کھڑکی سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ ایک شخص باہر بیٹھا تھا، اس کے سامنے کی تپائی پر ٹیلی فون پڑا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اُژن سانپ کو اس نے تن کر سلیوٹ کیا اور آگے بڑھ کر دفتر کا دروازہ کھول دیا۔ اندر پہنچ کر اُژن سانپ نے جوتے اتار کر قالین پر پھینکے اور ایک آرام دہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ میں دوسرے صوفے پر بیٹھنے لگا تو اس نے زور سے کہا۔

''جوتے اتار کے آرام سے لیٹ جاؤ اور بے فکر ہو کر اپنے بارے میں بتانا شروع کرو--- کوئی بات مجھ سے چھپانے کی کوشش مت کرنا اب ہم دوست بن چکے ہیں''۔

O

میں اتنی کچی گولیاں کھیلا ہوا نہیں تھا۔ میں نے حیدر آباد سے کراچی پہنچنے کی ایک فرضی کہانی اسے سنادی کہ حیدر آباد میں میرا چوڑیوں کا کاروبار ہے یہاں کاروباری سلسلے میں آیا تھا کہ جیب کٹ گئی اور ہوٹل کا بل ادا نہ کرنے کی وجہ سے نوبت یہاں پہنچ گئی۔۔۔ اُڑن سانپ میری باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں کے کناروں پر ایک سفاک مسکراہٹ طلوع ہوئی، بڑے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

''میرے دوست! تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔ بہر حال میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم اصل میں کون ہو؟۔۔۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم حماقت کی حد تک دلیر ہو بلکہ تمہارے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ تم احمق دلیر ہو۔ تم ایک ایسے پلے پلائے طاقتور سانڈ ہو جسے اپنے جسم کے پٹھوں اور اپنے سینگوں کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں۔ جس دن تمہیں اس کا اندازہ ہو گیا اس روز تم ناقابل تسخیر ہو جاؤ گے۔ میں نے تمہارے اندر کچھ ایسی صلاحیتیں دیکھ لی ہیں جو عام آدمی ایکس ریز سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ دیکھو، میرے دوست! یہ دنیا بڑی ظالم ہے، اس پر حکمرانی کا حق صرف طاقتور لوگ رکھتے ہیں اور وہ طاقت چاہے اقتدار کی ہو، پیسے کی ہو یا بازو کی ہو، طاقت بہر حال طاقت ہوتی ہے۔ تم طاقت کا صحیح استعمال سیکھ لو گے تو ان سب کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا لو گے جو تم پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔۔۔''

میرے کان اور آنکھیں اس کی طرف تھیں لیکن میں اس کی باتوں کے تناظر میں کسی اور دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ یہ گوٹھ محمد صادق کی دنیا تھی یہ وڈیرے جلال دین کی دنیا تھی۔ یہ آقاؤں اور غلاموں کا معاشرہ تھا اس کا پورا نظام آقا اور غلام کے باہمی تعلق کی قیود اور حد بندیوں سے مل کر بنا تھا۔ میں نے اپنا بچپن، اپنا لڑکپن اور جوانی کے اولین دور کی ساعتیں اس گھٹی گھٹی فضا میں بسر کی تھیں اور ایک آزاد ملک کا غلام باشندہ بن کر عمر کے اتنے سال گزارے تھے۔ صدیق عامر کے علاوہ کبھی کسی نے مجھے آزادی اور غلامی کا فرق نہیں سمجھایا تھا، اسی کی باتوں نے مجھ میں بغاوت کا شعلہ بھڑکایا تھا، اس شعلے میں لالچ کی تپش بھی شامل تھی لیکن شعلے اچانک نہیں بھڑکتے، یہ اندر ہی اندر پہلے پرورش پاتے ہیں، پختہ ہوتے ہیں اور پھر بلند ہو جاتے ہیں۔ اپنے معاشرے اور ماحول کے جبر نے میرے اندر ایک وحشی پیدا کیا تھا۔ وہ جب تک غلام تھا تو اپنے باہر پھیلے ہوئے وڈیرا شاہی نظام کی زنجیریں اور جکڑ بندیاں دیکھ کر ڈر جاتا تھا، حقائق سے آنکھیں موند لیتا تھا لیکن جب یہ وحشی یہ آزاد پرندہ پھڑ پھڑا کر بیدار ہوا تو مکر و فریب اور ظلم و زیادتی کا ہر پردہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ سیٹھ ادریس کے بیٹے نے مجھ میں چھپے ہوئے آزاد پرندے کو اپنی گفتگو کی چھڑی مار کے بیدار کر دیا تھا اور اب صمد خان عرف اُڑن سانپ میری زندگی میں داخل ہونے والا دوسرا فرد تھا جو مجھے کچوکے دے رہا تھا، بیدار کر رہا تھا اور میں بیدار ہو گیا تھا۔۔۔ میں نے اُڑن سانپ کو اپنا استاد تسلیم کر لیا۔ اس نے فوری طور پر گیراج کے پیچھے ایک صاف ستھرے چھوٹے سے کمرے میں میری رہائش کا بندوبست کر دیا۔ میرا بستر لگ گیا، میرے سائز کے سلے سلائے کپڑے بھی آ گئے اور دوسرے دن سے فیکا میرا ٹرینر بن گیا، وہ بیک وقت مجھے کئی باتیں سکھا رہا تھا مثلاً گاڑیوں کے پُرزوں کے نام، ان کے کام کرنے کے طریقے، ان میں نقص پیدا ہونے کی صورتیں، خرابی کو دور کرنے کے طریقے، مخاطب پر پہلا وار کرنے کا انداز، مختصر اور طویل مار کٹائی کے طریقے۔ صمد خان گاہے بگاہے ہماری یہ مشقیں بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا۔۔۔ وہاں رہتے ہوئے جب کئی دن بیت گئے تو رفتہ رفتہ وہاں کا ماحول میری سمجھ میں آنے لگا۔ اُڑن سانپ کو اس کے ساتھی صمد خان کہہ کر پکارتے تھے، آپس میں بھی اس کو اُڑن سانپ نہیں کہا جاتا تھا اور وہ اُڑن سانپ صرف باہر کے لوگوں کے لئے تھا۔ کسی شخص کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اسے صمد صاحب یا خان صاحب

کہہ کر پکارے، اسے صاحب کے نام سے چڑ تھی اور وہ لوگوں سے اپنا پورا نام سنا کرتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ تھا لیکن اس دوستی میں بھی بڑے فاصلے تھے۔ دن بھر ورکشاپ میں گاڑیاں مرمت ہوتی تھیں شام کو فیکا مجھے الگ کمرے میں لے جا کر لڑنے بھڑنے کے گُر سکھاتا تھا یہ ایک گھنٹے کی مشق ہوتی تھی اور صرف شام کو ہوتی تھی۔ اس کے بعد گاڑیوں کا کام سکھانے کے لئے کبھی فیکا مجھے گیراج میں لے جاتا تھا اور کبھی محمد بخش۔۔۔ فیکا پولیس کی ملازمت سے بھاگا ہوا ایک ادھیڑ عمر گٹھیلے جسم کا آدمی تھا، نہایت پھرتیلا اور برق رفتار، جتنی تیزی سے اس کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے اسی تیزی سے اس کی زبان چلتی تھی۔ پھر دس گیارہ بجے رات کو آفس کے قالین پر تاش کی بازیاں یا شراب و کباب کی محفلیں جمتی تھیں۔ تاش تو میں نے سیکھ لی لیکن صمد خان کے پُرزور اصرار کے باوجود بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا البتہ ان کی محفل میں بیٹھ کر انہیں پیتے اور بہکتے ضرور دیکھتا تھا۔ وہ جھوم جھوم کر گانے گاتے تھے، غل غپاڑہ کرتے تھے، آپس میں گتھم گتھا ہوتے تھے اور صمد خان ایک طرف بیٹھا ان کا تماشہ دیکھتا رہتا تھا، میں بھی اس محفل کا تماشائی تھا لیکن مجھے شراب سے شدید نفرت تھی اور اس نفرت کی جڑیں میرے اندر بہت گہری تھیں۔ ایک مرتبہ عید کے دن میں نے اپنے رشتے کے ایک ماموں کو شراب کے نشے میں دُھت الٹیاں کرتے اور گالیاں بکتے دیکھا تھا۔ اس بدبخت کے کچے گھر کے مکین، اس کی بیوی اور معصوم بچے سہمے ہوئے تھے، رو رہے تھے اور وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ عید گزر گئی وہ دن گزر گیا مگر میرے بچپن کی یہ گھناؤنی تصویر میرے دماغ کے پردے پر اتنی گہری چسپاں ہوئی کہ کبھی اُتر نہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے گوٹھ کے دوستوں کی ناؤنوش کی محفلوں میں بھی کبھی شرکت نہیں کی تھی۔ یہ شے میرے لیے دنیا کی سب سے بدترین چیز تھی جو انسان سے اس کی عقل، اس کی سمجھ اور اس کی انسانیت چھین لیتی تھی۔ میں نے ایسے بھی شرابی دیکھے تھے جو پی کر بہکتے نہیں تھے مگر پھر بھی شراب سے میری نفرت ہمیشہ برقرار رہی۔ وڈیرا جلال دین بھی شراب کا رسیا تھا اس کی ایک خوبصورت الماری میں دنیا جہاں کی قیمتی شرابوں کی رنگ برنگی بوتلیں موجود رہتی تھیں اور پی کر وہ بہکتا نہیں تھا بلکہ اس کے اندر کا خونخوار بھیڑیا باہر آ جاتا تھا۔ شاید شراب سے نفرت کی وجہ یہ بھی ہو کہ جب جلال دین نے مجھے پہلی مرتبہ گلدان کھینچ مارا تھا تو وہ حسب عادت نشے میں تھا۔۔۔ صمد خان بھی شراب پینے کا عادی تھا مگر اعتدال میں، اور چوکس رہتا تھا البتہ اس کے لب و لہجے میں نشے کی وجہ سے نرمی کی ہلکی سی لہر محسوس ہونے لگتی تھی۔ باؤ صدیق مجھ سے پٹنے کے بعد اس کی نظروں سے گر چکا تھا لیکن جرائم پیشہ لوگوں کی دنیا میں آ کر مجھے ان کے بارے میں آہستہ آہستہ بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کا مجھے پہلے علم نہیں تھا، مثلاً یہ کہ اگر کوئی خلیفہ پٹ جائے اور یہ عام لوگوں کے علم میں آ جائے تو پھر اس شخص کو اس وقت تک معطل شدہ سمجھا جاتا تھا جب تک کہ وہ کوئی نیا کارنامہ دکھا کر اپنی ساکھ نہ بحال کرے اور معطل شدہ شخص کی نگرانی ایسے غیر محسوس اور منظم طریقے سے کی جاتی تھی کہ اسے شبہ تک نہ ہونے پائے۔۔۔ مجھے جس طرح تیار کیا جا رہا تھا اسے دیکھ دیکھ کر محسوس ہوتا کہ جیسے لوہے اور سیمنٹ، اسٹیل اور بارود کو ملا کر ایک ایسا وجود تشکیل دیا جانا مقصود ہے جو ہر طرح سے تباہ کن ہو اور خطرناک ہو۔ میری ٹریننگ جب تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی تو میں بائیس دن بیت چکے تھے، میں گاڑیوں کی مرمت کا واجبی سا کام سیکھنے کے ساتھ ساتھ گاڑی ڈرائیو کرنا سیکھ چکا تھا۔ پانچ سات آدمیوں کو انڈوں کی طرح پھینٹ کر رکھ دینا اب میرے لیے کوئی خاص کارنامہ نہیں تھا۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانا، گاڑی سے گاڑی ٹکرا کر محفوظ رہنا اور کسی عمارت سے پائپ یا رسی کے ذریعے نیچے آنا بھی میں نے سیکھ لیا تھا۔۔۔ سیٹھ ادریس کے گیسٹ روم میں وی سی آر پر مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ رشک آتا تھا، حیرت ہوتی تھی کہ وہ

ایسے ناقابلِ یقین کام کیسے کر لیتے ہیں لیکن جب خود ان کاموں کی پریکٹس کے مراحل سے گزرا تو مجھے اندازہ ہونے لگا کہ دنیا میں کوئی بھی کام مشکل نہیں، صرف ہمت اور پریکٹس کی ضرورت ہے --- یہاں ہفتہ وار تنخواہ کے نام پر مجھے ایک ہزار روپیہ نقد مل رہا تھا، اچھی خوراک اور اچھے لباس کی سہولت حاصل تھی اور گاہے بگاہے ہم سمندر کے کنارے یا سینماؤں میں بھی جاتے تھے۔ وہ مجھے رحیم بخش کے نام سے قبول کر چکے تھے کسی نے مجھ سے میرا اصل نام اور میرا پس منظر نہیں پوچھا اور شاید جرائم کی دنیا میں اس کا رواج نہیں ہوتا۔ گیراج میں رہائش کے اگلے ہفتے صمد خان نے رحیم بخش کے نام سے میرا شناختی کارڈ بنوایا دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ آخر اس کی کیا ضرورت ہے لیکن اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اس کی بہت ضرورت ہے رحیم بخش --- تمہیں آگے چل کر اندازہ ہو جائے گا---''

O

گوٹھ محمد صادق میں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر اپنے بوڑھے اور ضعیف والدین کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لیتی تھی، کبھی کبھی وہ مجھے خواب میں نظر آتے تو میں چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ سارے واقعات مجھے کسی فلم کا حصہ معلوم ہوتے جس میں میرا کوئی کردار نہیں تھا لیکن پھر بھی تمام کردار میرے تھے، میں ہر فریم میں موجود تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے ان سے رابطہ قائم کروں، ان کے بارے میں دریافت کروں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟--- نوشین اور نفیسہ، سیٹھ اور یس اور وڈیرا جلال دین بھی مسلسل یاد آتے تھے۔ افسوس، نفیسہ کا کارڈ بھی میری اسی جیب میں تھا جو کٹ گئی تھی۔ اس کا فون نمبر تو درکنار، مجھے تو اس علاقے کا نام تک معلوم نہیں تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ میں ٹیلی فون کے کھمبوں پر گزرتی ہوئی تاریں دیکھ دیکھ کر سوچتا تھا کہ شاید انہی تاروں میں سے کسی تار کا ربط اس کے ٹیلی فون سیٹ سے بھی ہوگا، شاید ان تاروں میں اب بھی اس کی آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر رہی ہو لیکن مجھے نہیں معلوم کہ یہ گونگی اور خاموش تاریں کتنے نمبروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاتی ہیں، کن کن گھروں میں گھنٹیاں بجاتی ہیں۔

صمد خان کے ڈیرے پر میرے قیام کا دوسرا مہینہ اختتام کو پہنچ رہا تھا کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

اس رات ہم کلفٹن کی سیر کے لئے گئے گاڑی میں چلا رہا تھا اور صمد خان میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر فریکا، محمد بخش اور کمال خان بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ آج علاقے کے دکانداروں سے بھتہ وصول ہوا تھا اور سب چہک اور لہک رہے تھے۔ سمندر کنارے ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بیٹھ کر ہم سب گپ شپ کے موڈ میں تھے۔ میرے علاوہ وہ سب حسب عادت ناؤ نوش کی محفل بپا کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ پینے بیٹھیں گے تو میں اٹھ کر سمندر کے کنارے ٹہلوں گا۔ حسب پروگرام جب وہ سمندر کنارے ایک چٹان کے قریب دری بچھا کر پینے بیٹھے تو میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا اور ٹہلتا ٹہلتا ان سے دور نکل گیا۔ بے پناہ ہجوم تھا، بچے اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے اور کچھ اونٹ کی سواری کر رہے تھے۔ عورتیں اور لڑکیاں کنارے کے پانی میں چہل قدمی کر رہے تھے، جوڑے ٹہل رہے تھے۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجیں ایک دوسری کا تعاقب کر رہی تھیں، ایک دوسری پر چھلانگیں لگا رہی تھیں۔ سورج غروب ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی لیکن شفق کی سرخی پوری طرح سیاہی میں مدغم نہیں ہوئی تھی۔ میرے قریب سے ایک مرد اور عورت گزرے تو میں نے یونہی ان کی طرف سرسری انداز میں دیکھا اور دیکھتے ہی چونک پڑا،

ریت جیسے تیزی سے سرسراتی ہوئی میرے قدموں کے نیچے سے نکلتی چلی گئی تھی اور حیرت کے مارے میری آنکھیں پھیل گئیں--- اس طویل قامت مرد کے ساتھ چہل قدمی کرنے والی عورت نوشین تھی۔ اتنے دنوں بعد یوں اچانک اسے دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا، سانس تیزی سے چلنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے آواز دوں لیکن یہاں آواز کا مطلب ہنگامہ تھا اور اس ہنگامے سے میرا سارا پول کھل سکتا تھا--- ویسے بھی اس سے میرا کوئی تعلق نہیں بنتا تھا، نہ جذباتی اور نہ روحانی، نہ قلبی اور نہ جسمانی مگر پھر بھی میں اس کے سامنے جانا چاہتا تھا، اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عجیب احمقانہ سی بے تکی خواہش تھی جس کا نہ کوئی جواز تھا، نہ منطق تھی، نہ پیر تھا--- فوری طور پر میں پلٹا اور تیزی سے ساتھیوں کی طرف بھاگا۔ ان کا شغل ابھی اچھی طرح شروع نہیں ہوا تھا۔

''صمد خان---!'' میں نے پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ نوشین اور اس کے ساتھی کے معدوم ہوتے ہوئے ہیولوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''وہ--- وہ--- عورت--- صمد خان! اس کا پیچھا کرنا ہے، معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے---؟''

صمد خان کے ہونٹ پھڑکے۔ کہنے لگا۔ ''زیادہ پسند آ گئی ہے کیا---؟''

''ہاں، صمد خان! اس عورت کو گم نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اس کے بارے میں پوری معلومات چاہئیں کہ یہ کون ہے اور رہتی کہاں ہے؟''

فیکا اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔ ''چلو، مجھے دکھاؤ۔ میں اس کی سات پشتوں کی ہسٹری نکال کر لے آؤں گا۔''

O

ہم دونوں تیزی سے اُدھر لپکے جہاں نوشین گئی تھی، میں تقریباً بھاگ رہا تھا لیکن فیکا متوازن رفتار سے چل رہا تھا--- خاصا ہجوم تھا، اس میں سے راستہ بنانا اور چہرے پہچاننا خاصا مشکل کام تھا پھر بھی ہم دور تک انہیں ساحل پر ڈھونڈتے رہے، ایک ایک چہرہ دیکھتے رہے مگر وہ دونوں کہیں نظر نہیں آئے۔ ہم نے بھیڑ میں دائیں بائیں کئی چکر لگائے لیکن وہ نہیں ملے۔ ہم نے کار پارکنگ کا بھی چکر لگایا فش ایکیوریم کی طرف بھی گئے مگر خدا جانے وہ کہاں اوجھل ہو گئے تھے۔ آخر تھک ہار کے ہم لوٹ آئے--- صمد خان کہنے لگا۔

''لگتا ہے کہ اس عورت سے تمہارا کوئی خاص تعلق ہے، محض پہلی مرتبہ کسی کو دیکھ کر کوئی یوں دیوانہ نہیں ہوتا--- کون تھی وہ؟''

''تھی ایک خاص عورت---!'' میں نے دری پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''کاش! ہمارا آمنا سامنا ہو جاتا---''

''تم نے اسی وقت اس سے بات کیوں نہیں کی---'' صمد خان بگڑ کر بولا۔ ''ہمیں بلانے کیوں چلے آئے؟--- شاید اس کے ساتھ کوئی مرد ہو گا جبھی تم رک گئے---''

میں ہنس پڑا۔ ''صمد خان! یاد رکھو، میں مردوں سے نہیں ڈرتا--- بڑی عجیب سی بات ہے کہ میں اس کا سامنا کرنے کی خواہش کے باوجود اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا--- ہے نا، عجیب سی بات---؟''

فیکا برا سا منہ بنا کر دری پر پھیلا ہوا سامان سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ شام سالی، غارت ہو گئی--- اب اپنا موڈ آف ہو گیا ہے صمد خان! دفتر

میں چل کے محفل گرم کرتے ہیں۔"

صمد خان بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔"اپنا بھی یہی خیال ہے فیکے!— چلو، سامان اٹھاؤ۔"

کمال اور محمد بخش نے سامان سمیٹا اور ہم گاڑی میں آ بیٹھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے پارکنگ لاٹ سے باہر نکالی تو ایک گاڑی جس کے شیشے تاریک تھے، ہمارے عقب میں اسٹارٹ ہوئی۔ پھر ہم سڑک پر آ گئے۔ ابھی تک مجھے سڑکوں اور علاقوں کے نام اچھی طرح معلوم نہیں ہوئے تھے، پوچھ پوچھ کر ڈرائیونگ کرتا تھا۔ جب ہماری گاڑی تین تلواروں والے چوک سے گزری تو میں نے عقبی شیشے میں اس گاڑی کو دیکھا، صمد خان بھی دوسرے شیشے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ فیکے کی طرف مڑ کر بولا۔

"پیچھے آنے والی گاڑی پر نظر رکھو۔ میں کافی دیر سے اسے پیچھے آتا دیکھ رہا ہوں"۔ پھر اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔"رحیم بخش! آگے جا کر گاڑی سائیڈ پر کھڑی کر دو مگر انجن بند نہ کرنا—"

میں نے موڑ مڑ کر گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی۔ دوسری گاڑی خاصے فاصلے پر تھی لیکن ہمیں رکتے دیکھ کر رک گئی۔ میں نے دوبارہ گاڑی آگے بڑھائی تو پچھلی گاڑی بھی حرکت میں آ گئی۔ یہ آنکھ مچولی خاصے فاصلے تک جاری رہی۔ اب ہم ایک ایسے علاقے میں تھے جہاں ٹریفک کم تھی اور راہ گیروں کا رش بھی نہیں تھا۔ اسی لمحے پچھلی گاڑی برق رفتاری سے قریب آئی، آناً فاناً اس نے اپنی رفتار بڑھائی اور ہمارے برابر پہنچ گئی۔ میں ایک دم گاڑی روک کر ابھی ریورس گیئر ڈال ہی رہا تھا کہ وہ گاڑی صمد خان کی سائیڈ تک پہنچ گئی۔ تیزی سے اس کا ایک تاریک شیشہ نیچے ہوا ایک ریوالور کی نال ابھری اور ٹھائیں، ٹھائیں دو فائر ہوئے۔ یہ گولیاں ہماری گاڑی کے بونٹ پر ماری گئیں اور صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں ہلاک یا زخمی نہیں کرنا چاہتے تھے ان کا مقصد یا تو ہمیں خوفزدہ کرنا تھا یا گاڑی روکنا تھا مگر گاڑی وہ کیوں روکنا چاہتے تھے؟ اس پر غور کرنے کی ہمیں نہ فرصت تھی، نہ ضرورت تھی۔ میں نے اب تیزی سے سائیڈ مار کر گاڑی آگے نکال لی، دوسری گاڑی ایک دھچکے سے لہرائی اور پھر سیدھی ہو کر طوفان کی طرح ہماری طرف بڑھی۔

O

"اسپیڈ بڑھاؤ—" صمد خان چلایا۔"یہاں سے نکال کر ایک طرف لے جاؤ۔ یہ کتے کے پلے خاص مہم پر ہیں انہیں پتہ نہیں کہ گاڑی میں ان کا باپ اڑن سانپ موجود ہے—"

میری کوشش یہ تھی کہ گاڑی کو کسی محفوظ مقام تک اس طرح پہنچا دوں کہ ہم بیک وقت باہر نکل کر کسی درخت یا عمارت کی آڑ لے سکیں لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ سڑک پر ٹریفک بہرحال موجود تھی اور سامنے سے آنے والی گاڑیاں کئی مرتبہ ہماری گاڑی سے ٹکراتی ٹکراتی بچی تھیں۔ ایک بوکھلایا ہوا راہ گیر ہماری لپیٹ میں بھی آ گیا مگر شکر ہے ہماری گاڑی کے نیچے نہیں آیا، سائیڈ سے ٹکرا کر سڑک پر گر پڑا— آگے ایک ہوٹل کا سائبان تھا جس کے باہر بنچوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں ایک زیر تعمیر بنگلہ تھا، دائیں طرف سے لہراتا بل کھاتا ایک ٹرک بڑھتا چلا آ رہا تھا اور بائیں طرف سیوریج لائن تھی جس کے ساتھ ساتھ ہماری گاڑی دوڑ رہی تھی۔ ٹرک سے بچنے کی واحد صورت یہ تھی کہ میں نتائج کی پروا کیے بغیر گاڑی کو کچے پر اتار کر زیر تعمیر بنگلے کی بیرونی دیوار سے ٹکرا دوں اور میں نے یہی کیا۔

''استاد!۔۔۔چھلانگ۔۔۔''

میں نے چیخ کر کہا اور گاڑی کو یوٹرن دے کر کچے پر اتار کر بھگاتا ہوا زیر تعمیر بنگلے تک لے گیا، بریک لگاتے لگاتے بھی گاڑی بنگلے کی دیوار سے ٹکرا گئی اور زبردست دھماکہ ہوا مگر اس سے پہلے ہی میں اور صمد خان گاڑی کے دروازے کھول کر باہر نکل آئے تھے۔ ہم نے گاڑی کی آڑ میں پوزیشنیں سنبھالیں۔ میں غیر مسلح تھا، صمد خان کے پاس اس کا ماؤزر تھا، ہمارے تین افراد گاڑی کے پچھلے حصے سے نکل کر بنگلے کی نیچی سی دیوار کی آڑ لینے کے لئے بھاگے اور اسی وقت گاڑی سے تین افراد باہر نکل آئے جن میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ یہاں سٹریٹ لائٹ کی خاصی روشنی تھی۔ اسٹین گن والے قد آور بار یش آدمی کی چال میں لنگراہٹ تھی مگر میں نے تیز روشنی میں اسے صاف پہچان لیا تھا، وہ سیٹھ ادریس کا ڈرائیور تھا اور ہم اس کے نشانے کی زد میں تھے۔

''نبی بخش جنگی۔۔۔!'' اس نے پھرتی سے اینٹوں کے ایک ڈھیر کی آڑ لیتے ہوئے للکار کر کہا۔ ''خاموشی سے باہر نکل آؤ۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے''۔

صمد خان نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

''یہ کس کو بلا رہا ہے''۔ پھر اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ تمہیں آواز دے رہا ہے۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں سر جھٹک کر کہا۔ ''میرا نام رحیم بخش ہے اور یہ کسی نبی بخش جنگی کو بلا رہا ہے۔۔۔ ماؤزر مجھے دو، وہ کچھ کچھ میرے نشانے کی زد میں آ سکتا ہے۔ تم ادھر سے اس کا نشانہ نہیں لے سکتے۔۔۔''

''صبر کرو۔۔۔'' صمد خان نے اپنے جسم کو سمیٹ کر رینگتے ہوئے ماؤزر اینٹوں کے ڈھیر کی طرف سیدھا کیا۔ ''وہ جو کوئی بھی ہے، اس کے ہاتھ میں اسٹین گن ہے اور وہ یہاں مذاق کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔۔۔''

''میں تین تک گنوں گا۔۔۔'' اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے سے گرجتی ہوئی آواز آئی''۔ اس کے بعد سیدھا برسٹ تم پر پڑے گا۔۔۔ باہر نکل آؤ۔۔۔''

ایک لمحے کے لئے قیامت خیز سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر صمد خان نے سرگوشی کی۔

''زمین سے چپک کر سر نیچا کر لو۔ میں نے اسٹین گن کا کھٹکا سن لیا ہے، یقیناً وہ برسٹ فائر کرے گا۔۔۔ ہوشیار!'' یہ کہہ کر اس نے پھرتی سے اچک کر اینٹوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے سر نیچا کر لیا۔

''ایک۔۔۔'' موت کے ہرکارے نے چیخ کر کہا اور کلک کلک کی آواز آئی۔ ''دو۔۔۔'' ایک مرتبہ پھر کلک کلک کی آواز آئی۔ ''تین۔۔۔''

O

موت کے ہرکارے نے تیزی سے کہا۔ پھر کئی دھماکے ہوئے مگر ایک بھی گولی ہماری طرف نہیں آئی، ایک دلدوز چیخ البتہ فضا میں گونج اٹھی۔ صمد خان کا ماؤزر بروقت کام آ گیا تھا، موت کے ہرکارے کی آخری چیخ اور اینٹوں کے لڑھکنے کی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ پھر دوسرے ہی لمحے ان کی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے گھوم کر گرد و غبار کے مرغولے اڑاتی ہوئی پیچھے گئی۔ گاڑی والوں کا ایک ساتھی گاڑی میں سوار نہیں ہو سکا تھا

اوراس وقت فیکے کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔فیکے نے پلک جھپکتے میں اس پر قابو پا کر اسے غیر مسلح کر دیا تھا۔ہم گاڑیوں کی آڑ سے باہر نکل آئے۔صمد خان نے پوری قوت سے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس شخص کے منہ پر رسید کیا۔اس کے ہونٹ پھٹ گئے،خون کی ابلتی ہوئی ایک دھار ہونٹوں سے نکل کر ٹھوڑی پر بہنے لگی۔صمد خان نے دوسرا زناٹے دار تھپڑ اس شخص کے منہ پر رسید کیا۔اس شخص نے بڑی دلدوز چیخ ماری۔

''کس کے آدمی ہو تم---؟''صمد خان نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔''بولو،کس کے آدمی ہو تم؟''

''مم---مم---مجھے کچھ نہیں معلوم---''مضروب شخص نے کراہتے ہوئے کہا۔''مجھے چھوڑ دو، میں کچھ نہیں جانتا، مجھے کچھ نہیں معلوم---''

''فیکے اسے گاڑی میں ڈالو---''صمد خان نے گرج کر کہا۔''اس ماں کے لال کو پتہ نہیں کہ یہ کون ہے،ہم اسے اس کا پتہ بتائیں گے---''

محمد بخش ہلاک ہونے والے ڈرائیور کی بھاری اسٹین گن اٹھا لایا۔اینٹوں کے ڈھیر پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا اور اس کے درمیان ڈرائیور کی لاش پڑی تھی،صمد خان نے اس کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔اس وقت اس کی خون میں لت پت کھوپڑی اور چہرہ ایسی حالت میں تھا کہ نظر بھر کر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی ڈیرے کی طرف جا رہی تھی۔اب کے ڈرائیونگ سیٹ پر فیکا بیٹھا تھا،اس کے ساتھ میں اور صمد خان ایک ہی سیٹ پر جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ پچھلی سیٹ پر محمد بخش اور کمال کے درمیان وہ مضروب شخص بیٹھا تھا۔اس نے بھاگ نکلنے کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے تھے،ٹکریں مار کر ہمیں پرے ہٹنے اور گرفت ڈھیلی کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن بالآخر جال میں آئے ہوئے پرندے کی طرح بے بسی سے پھڑ پھڑا کر رہ گیا---ابھی ہم گیراج سے دو تین کلو میٹر کے فاصلے پر تھے کہ محمد بخش نے جیب سے کپڑا نکال کر اس کی آنکھوں پر باندھ دیا۔یہاں سے اُڑن سانپ کا علاقہ شروع ہو رہا تھا،ہم آندھی طوفان کی طرح اپنے علاقے میں داخل ہوئے اور فیکا گاڑی کو سیدھا گیراج میں لیتا چلا گیا۔جب دفتر میں لا کر اس کی آنکھوں سے پٹی کھول کر تھرڈ ڈگری کے ذریعے اس سے سوال وجواب شروع کئے گئے تو وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکا کہ ایک عورت کی نشاندہی پر انہوں نے گاڑی کا پیچھا کیا تھا۔وہ عورت ان کے ساتھ موجود تھی اور ان کا ٹارگٹ نبی بخش جنگی کو اغوا کرنا تھا۔اس نے اعتراف کیا کہ وہ سیٹھ ادریس کا آدمی ہے۔

''تم جانتے ہو نبی بخش جنگی کو---؟''صمد خان نے بیہوش ہوتے ہوئے شخص کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اسے نہیں دیکھا---''وہ کراہتے ہوئے بولا۔''البتہ اس کی تصویر ڈرائیور نے ہم دونوں ساتھیوں کو دی تھی---''

''تصویر کہاں ہے---؟''صمد خان دھاڑا۔

مضروب شخص نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے میری تصویر نکال کر صمد خان کے سامنے رکھ دی،یہ ان تصویروں میں سے ایک تھی جو ایک گن مین نے گیسٹ روم میں کھینچی تھی---صمد خان غور سے میری تصویر دیکھتا رہا،سر ہلاتا رہا۔پھر تصویر اس نے اپنی جیب میں رکھ لی اور فیکے سے کہا۔

''اسے پانی پلاؤ اور دوسرے کمرے میں لے کے جاؤ۔۔۔ میں رحیم بخش سے بات کرنا چاہتا ہوں۔۔۔''

فیکے نے بازو سے پکڑ کر اس شخص کو کھینچا اور گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

''بنی بخش جنگی۔۔۔!'' صمد خان نے ٹھہرے ٹھہرے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے یہ نہیں ہوچھوں گا کہ تم نے اپنا نام غلط کیوں بتایا، میں تم سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم سیٹھ ادریس کو کیوں مطلوب ہو؟''

''میں کسی سیٹھ ادریس کو نہیں جانتا۔۔۔'' میں نے سوچا سمجھا جواب دیا۔

''دوستوں سے جھوٹ بولنے والوں کو میں دوست نہیں سمجھتا۔۔۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''صرف بتاؤ کہ یہ کیا لفڑا ہے؟۔۔۔ اب تک ہمارا سیٹھ ادریس سے کوئی پھڈا نہیں تھا لیکن تمہاری وجہ سے ہوسکتا ہے لہٰذا ساری بات میرے علم میں ہونی چاہئے۔ تم میرے قیمتی آدمی ہو میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔۔۔''

اب خود کو پوری طرح چھپائے رکھنا ممکن اور مناسب نہیں تھا، جلد یا بدیر میری کہانی کو منظرِ عام پر آجانا تھا لہٰذا میں نے گول مول انداز میں بتایا کہ کچھ عرصے تک سیٹھ نے مجھے اپنے زیرِ تعمیر بنگلے میں قید رکھا تھا جہاں سے میں بھاگ نکلا اور تب سے وہ میری تلاش میں ہے کیونکہ میں اس کے بیٹے کو اغوا کرنے والوں کو بہت قریب سے جانتا ہوں وہ عورت بھی مجھے اسی بنگلے میں ملی تھی۔۔۔ صمد خان نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بولا۔

''غالباً تم اغوا کرنے والوں کی طرف سے کوئی مطالبہ لے کر سیٹھ ادریس کے پاس گئے تھے جہاں اس نے تمہیں قید کرلیا۔۔۔؟''

''اغوا کرنے والوں کی طرف سے نہیں۔۔۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سیٹھ ادریس کے بیٹے کی طرف سے۔۔۔ اور مطالبہ لے کر نہیں پیغام لے کر۔۔۔''

صمد خان کی ساکت آنکھوں میں حیرت کی چمک اُبھری اور پھر ڈوب گئی، زیادہ دیر تک کوئی تاثر اس کے چہرے پر قائم نہیں رہتا تھا۔

''بہرحال۔۔۔'' وہ اپنی انگلیاں ایک دوسری سے ملاتے ہوئے بولا۔ ''اب تمہارا جھگڑا ہمارا جھگڑا بن گیا ہے۔ سیٹھ ادریس بہت طاقت ور آدمی ہے اور ہم نے اس کے ایک بہت بااعتماد ساتھی کو ختم کردیا ہے مگر پولیس اس معاملے میں نہیں پڑے گی کیونکہ یہ معاملہ پولیس تک نہیں جائے گا، جانے ہی نہیں پائے گا۔۔۔''

''مگر ایک آدمی قتل ہوا ہے استاد۔۔۔!'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''چاہے دس ہوجاتے۔۔۔'' صمد خان نے لاپرواہی سے کہا۔ ''کراچی میں کئی پارٹیاں ایک دوسرے سے الجھتی رہتی ہیں، روز کوئی نہ کوئی لاش کہیں نہ کہیں سے برآمد ہوجاتی ہے اور پولیس کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ وہ فوراً قاتلوں تک پہنچے اور پہنچ بھی جائے تو اس علاقے کی پولیس ہماری پہنچ سے دور نہیں۔۔۔ کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکتا، اطمینان رکھو البتہ یہ معاملہ ایک آدمی کی موت کا معاملہ نہیں ہے ایک اور آدمی کا قصہ پاک کرنا پڑے گا۔''

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

''یہ آدمی جو ہم پکڑ کر لائے ہیں، اب کیماڑی کے کھاری پانی کے کچھوؤں کی خوراک بنے گا لیکن پہلے ہم اسے اچھی طرح کھنگال لیں۔ ہمارا اصول ہے کہ آدمی کے اندر سے ساری معلومات نچوڑ کر نکالتے ہیں، پھر اس کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر یہ بچنا چاہے گا تو ہمارا آدمی بن جائے گا اور مرنا چاہے گا تو کیماڑی جائے گا۔۔۔''

لیکن کیماڑی کی نوبت نہیں آئی۔ فیکا ہاتھ جھاڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور سپاٹ لہجے میں اس نے اطلاع کی کہ مضروب اللہ کو پیارا ہو گیا، غالباً اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔۔۔ صمد نے صرف اتنا کہا۔

''اسے یہاں نہیں مرنا چاہیے تھا۔۔۔'' پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا، فیکے کے قریب جا کر اس نے سرگوشی میں لاش کو ٹھکانے لگانے کی ہدایات دیں اور پھر مجھ سے کہا۔

''رحیم بخش! میرا خیال ہے، اب تمہیں اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا چاہیے''۔

O

میں بھی یہی چاہتا تھا۔۔۔ کمرے میں آ کر آرام دہ کوچ پر لیٹ گیا مگر کئی باتیں میرے ذہن میں کھٹک رہی تھیں، کئی سوالات سانپوں کی طرح پھن اٹھائے جھوم رہے تھے۔ یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آ گئی تھی کہ نوشین نے مجھے دیکھ لیا تھا اور سیٹھ ادریس کے آدمیوں کو میرے بارے میں اطلاع دے دی تھی لیکن اس نے ایسا کیوں کیا، آخر وہ تھی کون؟۔۔۔ اس کے بارے میں بہت سی باتیں تھیں جو الجھن میں مبتلا کر رہی تھیں لیکن میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا اور جب تعلق ہی نہیں تھا تو اس کے بارے میں سوچنا ہی بیکار تھا۔ میں نے جس دنیا میں قدم رکھ دیا تھا یہ ایک مختلف دنیا تھی اس دنیا کے اپنے ہی رنگ ڈھنگ تھے، اپنے ہی طور طریقے تھے۔ یہ اندرونی جذبات کی نہیں۔ بیرونی مظاہر کی دنیا تھی اور لڑنا بھڑنا، مرنا مارنا اس کا معمول تھا۔ اس میں کسی قلبی یا روحانی معاملے کی باریکیوں پر بیٹھ کر غور کرنے کی فرصت کسی کے پاس نہیں تھی۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود میرا دل بے چین تھا۔ ایک اضطراب تھا جو رگوں میں لہو بن کر دوڑتا پھر رہا تھا، کنپٹیوں میں سنسنا رہا تھا۔ اس بے چینی اور اضطراب کی کئی وجوہ تھیں اور دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے گوٹھ محمد صادق لوٹ جاؤں لیکن اب میں نے اپنے اِردگرد اتنی دیواریں کھڑی کر لی تھیں کہ گوٹھ اور اس کے سب رشتے ناتے اوجھل ہو چکے تھے، کشتیاں جل چکی تھیں اور اب جدائی کے دریا کو عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔۔۔ سیٹھ ادریس کے ڈرائیور کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں تھی، جائے وقوعہ پر موجود کوئی بھی شخص آسانی سے ہماری گاڑی کا نمبر اور ہمارے حلیے نوٹ کر کے سیٹھ ادریس تک پہنچ چکا ہوگا۔ اس کے دو آدمی مارے جا چکے تھے۔ ان دو افراد کے قاتلوں تک وہ ضرور پہنچے گا۔ یہی خیال بار بار میرے ذہن میں چکر لگاتا تھا۔ میں نے اگلے دن صمد خان سے اس کا اظہار کیا تو اس نے کندھے اُچکا کر کہا۔

''علاقے کا ایس ایچ او میرے پاس دو تین بار آ چکا ہے، اس پر خاصا دباؤ ہے لیکن وہ میرا پرانا یار ہے اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس نے خانہ پُری کیلئے تھوڑی بہت کاغذی کارروائی کی ہے لیکن اپنی رپورٹ میں یہی لکھا ہے کہ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں''۔

O

ایس ایچ او کو میں صمد خان کی محفلوں میں دو تین بار دیکھ چکا تھا، یہ سانولے رنگ اور بڑی بڑی مونچھوں والا فربہ اندام شخص تھا اور صمد خان کا گہرا دوست تھا، دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی لیکن اس کی آنکھیں دیکھ کر پہلی بار ہی میں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ وہ کسی کا دوست نہیں ہو سکتا اور میری یہ رائے درست ثابت ہوئی۔ ایک رات وہ ناؤ نوش کی محفل میں موجود تھا، میں بھی دیوار کے قریب بچھے ہوئے صوفے سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا مونگ پھلیاں کھا رہا تھا اور ان کے غل غپاڑے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک ایس ایچ او اٹھا۔ وہ نشے میں جھوم رہا تھا، کہنے لگا۔

''صمد خان! اب تیرا آدمی میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا، یہ دیکھ اس کی تصویر—''

یہ کہہ کر اس نے جیب سے مڑا تڑا اخبار نکال کر کھولا اور اسے سب کے سامنے لہرایا۔ صمد خان نے جھپٹ کر اخبار چھین لیا، میں بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگے بڑھا— اخبار کے اندرونی صفحے پر گمشدہ کے کالم میں میری تصویر چھپی ہوئی تھی اور نیچے میرے والدین کی طرف سے مجھ سے التجا کی گئی تھی کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، لوٹ آؤں۔ سب میری گمشدگی سے پریشان ہیں، ماں بستر مرگ پر ہے اور اس کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نیچے پتے کی جگہ معرفت وڈیرا سائیں جلال دین، گوٹھ صادق، تحریر تھا۔

''آج مجھے بڑے صاحب کا فون بھی آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''انہوں نے ہدایت دی تھی کہ میں اپنے علاقے میں اس شخص کو تلاش کروں—'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ ''تلاش کیا کرنا ہے، بندہ میری مٹھی میں ہے— کیوں صمد خان؟''

صمد خان بھی نشے میں تھا لیکن وہ کبھی نہیں بہکتا تھا۔

''مٹھی میں ہے تو لے جاؤ— لیکن یاد رکھنا کہ یہ تمہارا نہیں۔ ہمارا آدمی ہے اور ہم اپنا آدمی پولیس کو نہیں دیتے—''

''پولیس تم سے مانگ بھی نہیں رہی ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ تو غلام قادر کا سوال صمد خان سے ہے، ایک دوست دوسرے دوست سے بات کر رہا ہے اور اس میں پولیس کا کوئی ٹانکا نہیں ہے۔ یہ آدمی تم میرے حوالے کرو گے تو مجھے انعام ملے گا، ممکن ہے صاحب ترقی کی سفارش بھی کر دے— نہیں کرو گے تو میں مجبور بھی نہیں کروں گا۔''

یہ کہہ کر غلام قادر اطمینان سے آلتی پالتی مار کر قالین پر بیٹھ گیا، ناؤ نوش کا سلسلہ پھر چل پڑا لیکن اس اثناء میں صمد خان نے مجھے آنکھ کے اشارے سے اپنے کمرے میں جانے کی تاکید کی۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا، فیکا بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گیا اور سرگوشی میں بولا۔

''آج ضرور کوئی گڑبڑ ہو گی— دو جوڑے کپڑے اٹھاؤ اور میرے پیچھے آ جاؤ''۔

میں نے کپڑے ایک لفافے میں ڈالے، فیکے نے ایک گاڑی نکالی اور پلک جھپکتے ہی ہم سڑک پر تھے۔

''زیادہ دور نہیں جانا ہے—'' وہ تیزی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔ ''اپنے ہی علاقے کے ایک فلیٹ میں تمہیں رہنا ہے۔ جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے، تمہیں آرام سکون سے وقت گزارنا ہے۔ میں روز تمہارے پاس آؤں گا، رابطے کیلئے اس فلیٹ میں فون بھی موجود ہے''۔

فون اور فلیٹ کے ذکر پر میرا دل دھڑک اٹھا— کیا خبر ان ہی فلیٹوں میں سے کسی ایک فلیٹ میں مجھے لے جایا جا رہا تھا جہاں نفیسہ رہتی

ہے؟— لیکن ایسا اتفاق صرف فلموں میں ہوتا ہے، حقیقی زندگی میں دور دور تک ایسے اتفاقات نہیں پائے جاتے اور اس کا اندازہ مجھے اس فلیٹ میں پہنچ کر ہوا۔ جس بلڈنگ میں یہ فلیٹ واقعہ تھا وہ ایک قدیم بلڈنگ تھی، بوسیدہ دیواروں اور شکستہ زینوں والی ایک بلڈنگ جس کے شہتیروں میں ابابیلوں اور کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے لیکن دو کمروں کا یہ فلیٹ اندر سے خاصی حد تک آرام دہ تھا، میرے لیے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس فلیٹ میں سنگھار میز کے سامنے ایک گوری چٹی قبالہ بیٹھی تھی، اس نے فلیٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر ہمیں آئینے میں دیکھ لیا تھا اور مڑے بغیر اطمینان سے بولی تھی۔

کم ان فیکے ڈرالنگ!— باس نے مجھے فون کر دیا ہے۔"

O

پھر وہ لچکتی ہوئی اٹھی اور ہماری طرف مڑی تو میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی، سر سے پاؤں تک سرخ و سفید، نرم و گداز، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیا، جھجک اور نسائیت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی کتاب کی طرح تھی جسے ہر شخص آسانی سے پڑھ سکتا تھا— فیکے نے گل بہار کے نام سے اس کا تعارف کرایا، پھر الگ لے جا کر اس سے کچھ باتیں کیں اور مجھ سے مصافحہ کر کے جاتے جاتے بولا۔

"بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ جب تک ہماری طرف سے سگنل نہ ملے اس فلیٹ سے باہر نہ نکلنا۔ یہاں کے معاملات گل بہار سنبھال لے گی—"

گل بہار کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ نہایت بے جھجک اور بے باک عورت تھی ہے، ایسی عورت کے ساتھ رہ کر خود کو برائی سے محفوظ رکھنا اور اپنے اندر کے شیطان پر قابو پانا بہت مشکل کام ہے۔ صمد خان نے حفاظت کے خیال سے مجھے ایک ایسی کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا جو ابھی سے مجھے اعصاب شکن معلوم ہو رہی تھی لیکن جب فیکا چلا گیا اور گل بہار نے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تو میرے تاثرات کا قلعہ اس طرح زمین بوس ہوا کہ چکرا کر رہ گیا— یہ فلیٹ اس طرح بنا ہوا تھا کہ آگے پیچھے اس کے دو کمرے تھے ایک کمرہ نشست گاہ کا کام دیتا تھا اور دوسرا خواب گاہ کا، درمیان میں لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ گل بہار مجھے نشست گاہ میں لے گئی۔ یہ خاصا کشادہ کمرہ تھا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں میں قدِ آدم الماریاں تھیں جو مقفل تھیں۔ گل بہار ایک صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی پرس کھول کر سگریٹ سلگایا اور ایک سگریٹ میری طرف بڑھایا مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس نے سگریٹ کیس پرس میں رکھ لیا، سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولی۔

"رحیم بخش! تم ایک خوبصورت جوان مرد ہو اور مجھے خوبصورت اور جوان لوگ پسند ہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے توقف کیا۔ سگریٹ کا ایک اور کش لیا، بڑی مہارت سے دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر چھت کی طرف پھینکنے لگی۔ پھر بولی۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاؤ تمہارا اور میرا تعلق محض اتنا رہے گا کہ تم یہاں مہمان کی حیثیت سے رہو گے۔ مجھے عورت سمجھ کر دن یا رات کے کسی لمحے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا اور نہ میرے کسی معاملے میں دخل دینے کی کوشش کرنا۔ کوئی بھی ٹیلی فون آئے تم ریسیور کبھی نہیں اٹھاؤ گے خواہ میں یہاں ہوں یا نہ ہوں اور جس روز تم نے میرے اور اپنے درمیان تین فٹ کے فاصلے کو ایک انچ بھی کم کرنے کی کوشش کی اسی وقت تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جوان، صحت مند اور

خوبصورت عورت اگر مارشل آرٹ سیکھ لے تو کتنی خطرناک ہو جاتی ہے۔۔۔"

"ڈرا رہی ہو مجھے؟" میں نے دائیں آنکھ بھینچ کر پوچھا۔

"تجربہ کر کے دیکھ لو۔۔۔"

وہ اچانک صوفے سے اٹھ کر میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ اس عورت سے مجھے وحشت ہونے لگی، میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"دیکھو، بی بی۔۔۔!" میں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "میری مردانگی کو بہت زیادہ چیلنج کرنے کی ضرورت نہیں اور تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ بھی محسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ میں تمہاری پناہ میں ہوں اور خاصی حد تک تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔۔۔ جو کچھ تم نے کہا، میں نے سن لیا۔۔۔ میں جتنے دن بھی یہاں رہوں گا، تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔۔۔"

"یہ بات ہے تو ہاتھ ملاؤ۔۔۔"

اس نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے مصافحہ کرنا چاہا لیکن اس نے قدرے جھک کر میرا ہاتھ پکڑا، کلائی پر گرفت مضبوط کی پھر پوری قوت سے ایک جھٹکا دیا اور دوسرے ہی لمحے میں پورے قد سے اٹھ کر قلابازی کھاتا ہوا دھڑام سے فرش پر چاروں شانے چت جا پڑا۔ آناً فاناً اس نے پشت کی طرف سے میرے دونوں بازو جکڑ لئے۔ اس کی گرفت میں ایسی مشاقی اور مہارت تھی کہ وہ جھٹکا دیتی تو میرے کہنیوں کے جوڑ ہل جاتے یا دونوں بازو کندھوں کے جوڑ سے کھل جاتے، درد کی ایک شدید لہر مجھے اپنے پورے وجود سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے تھوڑی دیر تک مجھے اسی پوزیشن میں رکھا پھر اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ پسینہ میری کنپٹیوں سے پھوٹ پڑا تھا، آہستگی سے میں دونوں بازو سہلاتا اور قہر آلود نظروں سے اسے گھورتا ہوا اٹھ بیٹھا۔۔۔ وہ کھلکھلا کر ہنستی ہی چلی گئی۔ پھر اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"آئی ایم ویری سوری، رحیم بخش!۔۔۔ میں یہ سمجھی تھی کہ تم ڈیفنس کرو گے لیکن تم نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا، اسی لیے ڈھیلے ڈھالے بیٹھے رہے۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ ہاتھ پاؤں چلانے کی تمہیں خاصی پریکٹس ہے اور تم باس کے قیمتی آدمی ہو مگر مارشل آرٹ بھی سیکھو، اس کے بغیر بات نہیں بن سکتی۔۔۔"

"غالباً تم مجھے آرٹ سکھاؤ گی۔۔۔؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں نہیں۔۔۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "تمہاری بدتمیزیاں تمہیں یہ آرٹ سکھائیں گی۔ جب بھی میری طرف بڑھو گے۔ ایک نئی تکنیک سے مار پڑے گی۔"

"اپنے بارے میں غالباً تمہیں بڑی خوش فہمی ہے۔۔۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"مجھ جیسی جوان اور خوبصورت عورت کو ہونی چاہئے"۔ وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "بہرحال، یہ نشست گاہ تمہارا کمرہ ہے۔ قالین پر گاؤ تکیے پڑے ہیں، کوچ اور صوفے موجود ہیں، کمبل اور چادریں دائیں طرف کی پہلی الماری میں ہیں۔ جہاں جی چاہے، لیٹ جاؤ۔۔۔"

میں نے ایک گوشہ اپنے لیے مخصوص کرلیا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ گرل کے پیچھے بڑا سا پردہ تھا جسے اس نے کھینچ کر برابر کردیا۔ پھر پردے کی دوسری طرف سے بولی۔

''تمہارے سامنے اٹیچ باتھ روم ہے اور ریفریجریٹر میں ہر چیز موجود ہے، پینے کا شوق ہے تو بوتلیں خانے میں ہیں۔ وہسکی، برانڈی، شمپئن، بیئر ہر چیز مل جائے گی۔۔۔''

''مجھے ان میں سے کسی چیز کی نہ عادت ہے، نہ ضرورت۔۔۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔

''پڑ جائے''۔ وہ پردے کے پیچھے سے کھلکھلائی۔

میں نے دو تین جمائیاں لیں، پھر لیٹ گیا لیکن آرام کرنے کو جی نہ چاہا۔۔۔ جی چاہتا تھا کہ گل بہار سے باتیں کی جائیں۔ میں نتائج سے بے پرواہ ہوکر بے تکلفی سے پردہ ہٹا کر اس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اندر مدھم روشنی کا سبز بلب جل رہا تھا اور وہ آرام دہ بیڈ پر لیٹی فون کو بستر پر رکھے بڑی مدھم آواز میں کسی سے باتیں کررہی تھی۔ اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا جو ستر پوشی کے لیے خاصا ناکافی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کھٹ سے فون بند کردیا، پھرتی سے کروٹ بدلی اور مچھلی کی طرح تڑپ کر بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔

''اندر کیوں آئے ہو؟'' وہ پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''باتیں کرنے۔۔۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

اس نے دانتوں سے ہونٹ کاٹے، چبھتے ہوئے انداز میں بولی۔ ''جتنی باتیں ہمارے درمیان ضروری تھیں، وہ ہم کرچکے ہیں۔ اب تم جاؤ۔۔۔''

میں اطمینان سے ایک گدے دار تپائی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ''میں نے اب تک کسی عورت سے شکست نہیں کھائی اور نہ اس کا حکم مانا ہے، یہ بات ذہن میں رکھو اور اطمینان سے اپنے بستر پر بیٹھ جاؤ ورنہ اتنا ماروں گا کہ ہڈیوں کے گھنگرو بجنے لگیں گے''۔

○

وہ میری طرف یوں جھپٹی جیسے ناخنوں سے میرا پورا وجود ادھیڑ کر رکھ دے گی، میں اگر اسے جھکائی دے کر الگ نہ ہٹ جاتا تو وہ میرا چہرہ لہولہان کردیتی۔ وہ اپنے زور میں دیوار سے ٹکرائی، تیزی سے پلٹی اور اپنی پشت دیوار سے لگا کر گہرے گہرے سانس لینے اور مجھے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگی۔ اس کا پورا جسم سانسوں کے زیر و بم میں اتھل پتھل ہو رہا تھا، ایک بھونچال تھا جو عورت کے وجود میں مجسم ہوگیا تھا۔ پھر یکایک جیسے آندھی اور طوفان کا زور ٹوٹ گیا، وہ آہستہ آہستہ ریت کی دیوار کی طرح بیڈ پر بیٹھ گئی اور تھکے تھکے سے لہجے میں اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں دوبارہ تپائی پر بیٹھ گیا۔

''پتہ نہیں، صمد خان نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔۔۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں نے زندگی میں بہت سی عورتیں دیکھی ہیں، اچھی بھی اور بُری بھی لیکن تمہارے جیسے تیور میں نے بہت کم دیکھے ہیں''۔

وہ بدستور تیکھے انداز میں مجھے گھورتی رہی، بولی تو اس کا لہجہ حد درجہ زہریلا تھا۔ ''دیکھو رحیم بخش!'' اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

''میں کوئی اچھی عورت نہیں ہوں لیکن میں مرد کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتی — مرد چاہے لاٹ صاحب کا بچہ ہی کیوں نہ ہو، میں مضبوط کردار کے مالک مرد کو پسند کرتی ہوں اور وہ اب تک مجھے بہت کم ملے ہیں''۔

''گل بہار —!'' میں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تمام مردوں کو ایک لاٹھی سے مت ہانکو۔ کم سے کم میرے بارے میں پہلے سے کوئی رائے قائم مت کرو۔ یہ تمہیں وقت ہی بتائے گا کہ میں مضبوط ہوں یا کمزور ہوں — میں یہاں بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ تمہارے کمرے میں کسی بری نیت سے نہیں آیا تھا — میں صرف اپنے دکھ اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا اور میرا کوئی مقصد نہیں تھا —''

''سوری —! وہ پُرسکون ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر اس نے سلگایا، دھیرے دھیرے دھوئیں کے چھلے اوپر پھینکتی رہی پھر بولی۔ ''پولیس تمہاری تلاش میں ہے، صمد خان کے ڈیرے پر کئی مرتبہ پولیس چکر لگا چکی ہے۔ وہ جگہ جگہ تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں —''

''مگر —'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''ایس ایچ او غلام قادر تو صمد خان کا دوست ہے —''

''معاملہ صرف ایس ایچ او لیول تک نہیں ہے''۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے پڑھتے ہوئے بولی۔ ''میرا اپنا آئیڈیا یہ ہے کہ کچھ بڑے لوگ اس معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں — ان کی تم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے اپنے طور پر غور ضرور کیا ہے اور اتنا بتا سکتی ہوں کہ تمہاری تصویر تمہارے والدین نے نہیں چھپوائی —''

اس طرف میرا ذہن نہیں گیا تھا — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''پھر کون ہو سکتا ہے — غالباً وڈیرہ جلال دین؟''

''ہونہہ!'' وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی۔ ''وڈیرے اپنے گمشدہ لوگوں کی گمشدگی کا اشتہار نہیں دیتے، انہیں خود ڈھونڈتے ہیں — یہ تصویر سیٹھ ادریس نے چھپوائی ہے''۔

میں بوکھلا گیا۔ ''سیٹھ ادریس سے اب میرا کیا تعلق ہے اور اس معاملے میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے —؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم —'' وہ سر ہلا کر بولی۔ ''بہر حال تم یہاں بالکل محفوظ ہو اور کوئی شخص تم تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ یہ فلیٹ باس کی ملکیت ہے اور باس کا نیٹ ورک بہت مضبوط ہے — جاؤ، اب آرام کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے''۔ وہ جمائیاں لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، مزید اس کمرے میں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''شب بخیر —!''

میں نے آہستہ سے کہا اور خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا — اس رات دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ حالات عجیب و غریب رخ اختیار کر رہے تھے۔ میرا ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور دل میں کئی وسوسے اور خدشات سر اٹھا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس ماحول سے یکلخت نکل جانا چاہیے یا پھر ہمیشہ کے لئے قبول کر لینا چاہئے، ہاں یا نہیں کی درمیانی کیفیت میں نہیں رہنا چاہیے — جانے کب مجھے نیند آ گئی اور نیند آئی تو میں گوٹھ صادق پہنچ گیا۔ میرا بوڑھا باپ گوٹھ کے شکستہ پل کے قریب لاٹھی کے سہارے کھڑا اس سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا

جس سے لاریاں اور کھٹارا بسیں آتی تھیں۔ اس کی آس بھری بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور چہرہ حد درجہ آزردہ تھا۔ میں نے چیخ کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا لیکن پتہ نہیں کیوں، کوشش کے باوجود آواز میرے حلق سے نہ نکل سکی۔ میں نے بھاگ کر اس کے قریب جانا چاہا، ہاتھ لہرا کر اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن جیسے میرے وجود کو کسی نے پتھرا کر رکھ دیا تھا— عجیب و غریب خواب تھا اور بڑی حیران کن بے بسی تھی۔ اسی جدوجہد میں میری آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ کوئی مجھ پر جھکا ہوا میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ یہ گل بہار تو ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ ایک اکھڑ اور بدمزاج عورت تھی، اس سے نرم رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی— میں نے پلکیں جھپکیں تو یقین نہیں آیا— واقعی، وہ گل بہار تھی مگر پہلے والی گل بہار سے بالکل مختلف— اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے— پتھر کی عورت رو رہی تھی!

O

میں بھونچکا ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

کمرے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور وہ میرے سرہانے بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، یہ گل بہار اس گل بہار سے بالکل مختلف تھی جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا— میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر میرے شانے پر ٹک گیا تھا، میں اس کا سر سہلاتا رہا کاندھے تھپکتا رہا۔ پھر وہ ایک دم مجھ سے الگ سی ہو کر بیٹھ گئی، اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بولی۔

''رحیم بخش! معاف کرنا میں نے تمہاری نیند خراب کر دی۔ گھر میں اگر دو افراد ہوں تو ایک کی نیند دوسرے کے آنسوؤں سے خراب نہیں ہونی چاہیے—''

''کوئی بات نہیں، گل بہار! مجھ پر اعتماد رکھو۔ میں اگر تمہارا اچھا دوست نہ بھی بن سکا تو دشمن کبھی نہیں بنوں گا۔ جو بوجھ تمہارے دل پر ہے، اسے ہلکا کر لو۔ میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو لو—'' میں نے کہا تو اس نے بے ساختہ آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

''رحیم بخش—!'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''تم بہت اچھے انسان ہو—''

''اچھی صرف اللہ کی ذات ہے''۔ میں نے کہا۔ ''میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں''۔

''نہیں—'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''تم معمولی نہیں، غیر معمولی آدمی ہو— معمولی تو میں ہوں کہ جس کے گھر آنگن کے سب خواب چکنا چور ہو چکے ہیں، جس سے نسائیت چھن چکی ہے اور جو محض جسم ہے، روح نہیں— میری روح تو حالات کے بھاری پتھروں نے کچل کر رکھ دی ہے۔ اب میں اس جسم کی پرورش کیلئے زندہ ہوں جو میرا ہو کر بھی میرا نہیں رہا— میں تمہیں اپنی مظلومیت کی کوئی لمبی کہانی سنانا نہیں چاہتی کیونکہ میں خود کو مظلوم نہیں سمجھتی۔ اپنے بگاڑ اور اپنی بربادی کی ایک حد تک میں خود ذمہ دار ہوں لیکن جہاں پہنچ چکی ہوں، وہاں سے میری واپسی ناممکن ہے۔ میں باس سے غداری نہیں کر سکتی اور گروہ کو چھوڑ نہیں سکتی لیکن تھک چکی ہوں— بہت تھک چکی ہوں—''

''تم باس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں—؟'' میں نے اچانک ایک بے تکا سا سوال پوچھا۔

''باس سے شادی—؟'' وہ چونک کر پرے ہٹ گئی اور پھر ایک پھیکا سا قہقہہ لگایا۔ ''اچھا خیال ہے رحیم بخش! مگر اس میں کوئی جان نہیں

ہے — بس اس شادی کا قائل نہیں ہے جو اخلاق اور قانون کی نظر میں دو افراد میں آبرومندانہ بندھن ہوتی ہے، وہ اس شادی کا قائل ہے جس کی گواہ صرف کمرے کی دیواریں ہوں اور دنیا کی کوئی بے وقوف سے بے وقوف لڑکی بھی ایسی شادی پر رضامند نہیں ہوسکتی — میں بھی مستقل اور دائمی سہارے کی آرزومند ہوں۔ میرا مسئلہ جسم نہیں، روح ہے"۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس قسم کی باتیں عموماً فلموں میں سنی اور دیکھتی جاتی ہیں۔ حقیقی زندگی میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایسے جرائم پیشہ ماحول میں رچنے بسنے والی کوئی ایسی عورت اپنے ماحول سے متنفر ہو — پھر گل بہار نے جب اپنے ماضی سے ذرا سا پردہ ہٹایا تو وہ مجھے دکھی اور مظلوم عورت نظر آئی۔ وہ لو میرج کے شوق میں اپنے آشنا قیوم کے ساتھ بھاگ کر کراچی آئی تھی اور کراچی آکر انہوں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ چند دن تک تو گل بہار کے لائے ہوئے زیور کام آتے رہے اور اس کے بعد قیوم اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے اسے پولیس کے حوالے کردیا۔ پھر علاقے کے ایک معزز آدمی نے اسے بیٹی بنا کر اپنی تحویل میں لے لیا۔ گل بہار کی ماں بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھی، کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا۔ باپ ایک معزز سرکاری ملازم تھا۔ گل بہار کے اس اقدام سے اسے ایسا صدمہ ہوا کہ فالج نے اس کی زبان بند کردی۔ تین روز بعد وہ اللہ کو پیارا ہوگیا — جن حاجی صاحب نے گل بہار کو اپنی بیٹی بنایا تھا ان کے تین شادی شدہ بیٹے تھے اور تینوں حد درجہ اوباش اور عیاش تھے۔ پہلے دن تو انہوں نے گل بہار کو کچھ نہیں کہا مگر اگلے دن سے باری باری اسے تنگ کرنا شروع کردیا، یہاں تک کہ وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس دفعہ جس شخص نے اسے پناہ دی وہ سماجی کارکن تھا۔ سماجی کارکن کردار کے اچھے لوگ ہوتے ہیں مگر یہ شخص انتہائی گھناؤنے کردار کا مالک تھا۔ وہ مختلف فلاحی تنظیموں کے نام پر اپنے گرد عورتوں کو جمع کرتا تھا اور پھر انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا لیکن جلد ہی گل بہار نے اس کی حقیقت جان لی، وہ ضروری کام کے سلسلے میں اسے ایک گیسٹ ہاؤس کے مالک کے پاس لے گیا اور خود اسے چھوڑ کر غائب ہوگیا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کا مالک نشے میں دھت تھا لیکن خلافِ توقع اس پر جھپٹنے کی بجائے خاموش اور الگ تھلگ بیٹھا پیتا رہا اور اپنے بارے میں ساری تفصیل سے گل بہار کو آگاہ کرتا رہا۔ گل بہار نے جب اسے اپنی آپ بیتی سنائی تو شرابی کو ترس آگیا، اس نے اسی وقت گواہوں کو جمع کرکے گل بہار سے خفیہ نکاح کرلیا۔ اگلی صبح جب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا، طلاق کی دھمکیاں دینے لگا لیکن طلاق دی نہیں — ڈھائی تین ماہ تک اسے اپنے پاس رکھا پھر اسے مجبور کرنے لگا کہ گیسٹ ہاؤس میں آنے والے مہمانوں کو خود اٹینڈ کیا کرے، یہ خاص وہ لوگ تھے جو اپنی نام نہاد عزت کے ڈر سے آبرو باختہ گلیوں کا رخ نہیں کرتے، پرائیویٹ ٹھکانے تلاش کرتے ہیں جہاں وہ اطمینان و سکون سے داد عیش دے سکیں۔ کالے پیلے دھندوں میں پیسہ بہت ہوتا ہے لہٰذا پیسہ کبھی ان کا مسئلہ نہیں بنتا، وہ منہ مانگے داموں "پرائیویسی" خریدتے ہیں — بیشک گل بہار گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی تھی لیکن وہ ہر بستر کی زینت بننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس کا انکار سخت سے سخت انداز اختیار کرتا گیا۔ دو چار "معزز مہمانوں" کے جب اس نے سر پھوڑے تو گیسٹ ہاؤس کے مالک کو احساس ہوا کہ اس نے تو اچھی بھلی ایک مصیبت مول لے لی ہے — چھٹکارہ آسان تھا، طلاق کے تین لفظ! لیکن وہ اتنی سہولت کے ساتھ یہ تین لفظ کہہ کر ایک خوبصورت لڑکی سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا — ایک رات وہ جام پر جام چڑھاتے ہوئے کہنے لگا کہ دیکھو گل بہار، میری جان! زندگی اور بھاری بینک بیلنس چاہتی ہو تو میرے ساتھ تعاون کرو۔ پھر اس نے تعاون کی جو تشریح کی اسے سن کر وہ کانپ اٹھی — گل بہار بتا رہی تھی اور

میں دم بخود سن رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہ خاموش ہو کر اپنی ہتھیلی دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''وہ شہر کے چند معززین کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا، طریقہ کار یہ تھا کہ انہیں مختلف لوگوں کے ذریعے پھانس کر گیسٹ ہاؤس میں بلایا جائے، یہاں ایسے کمروں میں ان کا سواگت کیا جائے جن میں خفیہ کیمرے نصب ہوں۔ اس کام میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی شامل رہنا تھا— میں نے انکار کیا تو شرابی نے چاقو نکال لیا، اس کے پالتو غنڈوں نے میری دھنائی شروع کر دی۔ ایک غنڈے کو مجھ پر رحم آ گیا تو مار پیٹ کر راتوں رات اس نے مجھے اس علاقے سے نکال کر برکت عرف ہلاکو کے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ برکت کئی قتل کر چکا تھا اور اپنے علاقے میں اس کی خاصی دہشت تھی۔ اس نے ابتدا میں مجھے متوسط درجے کے خاندان کے ساتھ رکھا پھر ٹریننگ دے کر اپنے گروہ میں شامل کر لیا— میں کسی طرح قیوم کو ڈھونڈ کر اسے ختم کرنا چاہتی تھی برکت نے اسے کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مجھے یہ موقع فراہم کر دیا اور اپنے سامنے کھڑے ہو کر قیوم کو گولی مروائی۔ میں نے پورا چیمبر اس مردود پر خالی کر دیا، یہ میرے ہاتھوں ہونے والا پہلا قتل تھا۔ میں اسے پہلا ہی رکھنا چاہتی تھی مگر برکت نے مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا، مزید قتل تو میں نے نہیں کئے لیکن بینک ڈکیتیوں اور کار چوریوں کی وارداتوں میں حصہ لینے پر مجبور کر دی گئی۔ یہ سلسلہ خاصا عرصہ چلتا رہا، کئی مرتبہ پولیس کے ہتھے بھی چڑھی۔ اسی اثناء میں اژدر سانپ یعنی صمد خان سے دوستی ہوئی اور میں برکت ہلاکو کے گروہ سے اژدر سانپ کے گروہ میں آ گئی اور اب تک اس گروہ میں ہوں''۔

○

گل بہار کی داستان خاصی لرزا خیز تھی، یہ خیر و شر کی داستان تھی۔ اس میں حاجی صاحب جیسے نیک انسان بھی تھے اور قیوم، سماجی ورکر اور گیسٹ ہاؤس کے مالک جیسے خبیث لوگ بھی، جنہوں نے ایک بے بس لڑکی کو کس طرح سے اپنے مقاصد اور بغاوت کی تکمیل کا ذریعہ بنانا چاہا تھا۔ برکت عرف بلا کو اور صمد خان عرف اژدن سانپ تو تھے ہی جرائم پیشہ لوگ، ان سے کسی خیر کی توقع نہیں تھی۔۔۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جب گل بہار ایک طویل عرصے سے اس گروہ میں موجود ہے تو پھر اچانک مجھے دیکھ کر پہلی ہی ملاقات میں اس نے اپنے ماحول سے بیزاری کا اظہار کیوں کیا، اپنے بارے میں ساری باتیں کیوں بتا دیں؟ جرائم پیشہ افراد کی دنیا میں ایک دوسرے پر اعتماد کیا جاتا ہے مگر اپنے بارے میں زیادہ باتیں نہیں بتائی جاتیں۔ میں نے اپنی اس الجھن کا صاف لفظوں میں گل بہار سے تذکرہ کیا تو وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔۔۔ میرے اندر لاوہ پک رہا تھا اور کبھی نہ کبھی اس لاوے کو پھوٹنا ہی تھا، اس آگ کو باہر نکلنا ہی تھا۔ تم نہ ہوتے تو میرے سامنے کوئی اور ہوتا۔۔۔''

''اب کیا ارادہ ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جو تم کہو۔۔۔'' اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ظاہر ہے کہ حالات ٹھیک ہونے تک مجھے اس فلیٹ میں رہنے کی ہدایت کی گئی ہے''۔ میں نے کہا۔

''یہ حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔۔۔'' گل بہار نے گہرے وثوق سے کہا۔ ''میں اور تم قدموں میں لڑھکنے والے پتھر تو نہیں ہیں کہ ایک گڑھے سے دوسرے گڑھے تک سفر ہی سفر کرتے رہیں۔ راستہ ہمیں نکالنا ہے۔۔۔''

یکا یک میرے اندر کا محتاط آدمی چونک کر بیدار ہو گیا، میں نے خود پر شگفتگی طاری کر لی اور اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے دباتے ہوئے بولا۔

''نکال لیں گے، راستہ بھی نکال لیں گے مگر اب زیادہ رات ہو چکی ہے۔ ہمیں فی الحال آرام کرنا چاہیے۔۔۔''

''ٹھیک ہے''۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کھینچ کر اس نے مجھے اٹھایا۔ ''ہم آرام کریں گے مگر تم اس فرش پر نہیں لیٹو گے، میرے بیڈ پر آرام کرو گے''۔

''۔۔۔اور تم؟''

میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو جواباً وہ کھلکھلا کر ہنسی۔۔۔ پھر وہ یوں ہو گئی جیسے بہت سے رنگ برنگے ننھے منے قمقمے جل بجھ رہے ہوں۔

O

اگلی صبح میری آنکھ دیر سے کھلی، فیکا آیا بیٹھا تھا اور گل بہار کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ میں رات کے جانے کس لمحے بیڈ سے اٹھ کر بڑے سے صوفے پر جا لیٹا تھا۔ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کب اٹھا، کیوں اٹھا مگر اچھا ہوا کہ فیکے نے مجھے بیڈ سے دور صوفے پر سوتے دیکھا۔۔۔ کچھ دیر تک میں یونہی پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ واپس آیا تو دونوں ناشتے سے فارغ ہو کر میرے منتظر تھے۔ میں نے اپنے ساتھ لایا ہوا دوسرا جوڑا غسل کے بعد تبدیل کیا اور ان کے پاس آ بیٹھا۔

''خبریں اچھی نہیں ہیں۔ رحیم بخش ---!'' فیکے نے بتایا۔ ''پولیس کو سیٹھ ادریس کے ڈرائیور کی لاش سے کچھ فاصلے پر تمہارا شناختی کارڈ ملا ہے جس پر اس کے خون کے دھبے ہیں اور کچھ ایسے کرنسی نوٹ بھی ملے ہیں جن پر خون میں بھیگی ہوئی تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں --- یہ سب کچھ ہم نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا ہے''۔

''نہیں ---'' میں بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ --- وہاں ہمارے پاس اتنی مہلت کہاں تھی کہ ہم نوٹ نکالتے اور پھر میں تو زخمی نہیں تھا، نہ میں نے ڈرائیور کی لاش کو ہاتھ لگایا تھا ---''

''بہرحال ---'' فیکا ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''پولیس سرگرمی سے تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ کل رات سے آج صبح تک ہمارے ڈیرے کے کئی چکر لگائے جا چکے ہیں۔ غلام قادر راتوں رات ٹرانسفر کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ جس آدمی کو لایا جا رہا ہے، اس سے ہمارا معاملہ طے نہیں ہوسکا اس لیے آج ہی تمہیں یہاں سے ایک اور جگہ شفٹ ہونا ہے، تیار رہو ---'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بس میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا --- ہوسکتا ہے، ہم تمہیں ایک آدھ گھنٹے بعد شفٹ کریں اور اگر دن کی روشنی میں یہ مناسب نہ ہوا تو پھر مغرب کے بعد ہی ادھر کا چکر لگے گا''۔

یہ کہہ کر وہ مصافحہ کر کے اور گل بہار سے سرگوشی میں کچھ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا --- یہ صورتحال میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سیٹھ ادریس مجھ سے چھینا ہوا شناختی کارڈ اس طرح استعمال کرے گا۔ اتنے بڑے آدمی سے اتنی چھوٹی حرکت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں سیٹھ ادریس کے کسی کام کا نہیں تھا، میں کوئی ایسا اہم آدمی نہیں تھا جسے پھنسانے کے لئے سماجی اور معاشی طور پر مضبوط سیٹھ ادریس کو ان ہتھکنڈوں کی ضرورت پیش آتی اور ویسے بھی میں اس کے لئے کسی بھی صورت میں کوئی کارآمد شخص نہیں ہوسکتا تھا، خدا جانے اس کے کیا مقاصد تھے اور معلوم نہیں صدیق عامر بازیاب ہوگیا تھا یا اسے ہلاک کر دیا گیا تھا؟ --- دونوں ہی صورتوں میں اس تمام معاملے میں میرا کوئی تعلق نہیں تھا تو پھر مجھے کیوں جال میں پھنسایا جا رہا تھا؟ --- بہرکیف، جو کچھ بھی تھا وہ میرے حق میں ٹھیک نہیں تھا۔ کوئی آواز میرے اندر گونج رہی تھی، مجھے اس پوری فضا سے بھاگ نکلنے پر اکسا رہی تھی مگر گل بہار رات سے میرے پاؤں میں زنجیر بن کر الجھ گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس کی مکمل خود سپردگی کے جواب میں کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا، خود کو پوری طرح قابو میں رکھا، اپنے حیوانی جذبات کو بھڑکنے اور مچلنے نہیں دیا۔ شاید نفس اور ضبط کی کشمکش کے انہی لمحوں میں کسی وقت میں اٹھ کر صوفے پر جا لیٹا تھا اور مجھے نیند آ گئی تھی --- عام اور نارمل حالات ہوتے تو شاید میں گل بہار کی مدد کرتا، اسے اپنا نہ سکتا تو اسے اس دلدل سے باہر نکالنے کی کوشش ضرور کرتا۔ لیکن جن حالات کا میں اسیر تھا اس میں تو خود میری جان پر بنی ہوئی تھی، میرا ہی بچ نکلنا مشکل تھا چہ جائیکہ گل بہار کے ساتھ نکلتا یا اسے کسی قسم کا تحفظ فراہم کرتا، میں کون سا محفوظ آدمی تھا؟ --- فیکے کے جاتے ہی گل بہار فون کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ کئی جگہ اس نے نمبر ڈائل کئے، کئی لوگوں سے بات کی۔ وہ گول مول لفظوں میں بات کر رہی تھی، کچھ مخصوص کوڈ تھے جن میں گھما پھرا کر بات ہو رہی تھی --- میں نے اندازہ لگایا کہ وہ فوری طور پر میرے اور اپنے لئے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ہے جہاں پہنچ کر آئندہ کے لائحہ عمل پر غور ہوسکے۔ اس کی عجلت اور پھرتی دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چند ہی لمحوں میں یہاں سے نکل جانا چاہتی ہے۔ پھر وہ ایک بیگ میں کچھ کپڑے پیک کر کے سیدھی میرے پاس آئی۔

''یہاں سے ہم نکل رہے ہیں۔۔۔''

''ابھی۔۔۔؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی اور اسی وقت۔۔۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔

''مگر فیکا اور صمد خان۔۔۔؟'' میں نے کہنا چاہا۔

''ہشت۔۔۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''کیسا فیکا اور کون صمد خان؟۔۔۔ ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ اس شہر میں سینکڑوں فیکے اور سینکڑوں صمد خان ہیں، کس کس کی فکر کریں گے؟۔۔۔''

مگر ہم جائیں گے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک محفوظ مقام پر۔۔۔'' اس نے بیگ میں استعمال کی کچھ اور چیزیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر اب یہ بحث مباحثے کا موقع نہیں ہے۔ تمہارے اور اپنے لیے ریوالور بھی میں نے رکھ لیا ہے، گولیاں بھی خاصی ہیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم ڈرائیور کو قابو کریں گے اور اسے گاڑی سے باہر پھینک کر اپنی مرضی کی جگہ جائیں گے۔۔۔ اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔۔۔''

یہ کہہ کر اس نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک ٹھنڈا، یخ بستہ، سیاہ، خوفناک ریوالور نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا، یہ ریوالور لوڈ تھا۔۔۔ حکمت عملی کے طور پر پہلے وہ فلیٹ سے نیچے گئی، سامنے کے شاپنگ سینٹر اور بیکری سے اس نے کھانے پینے کی خاصی چیزیں خریدیں۔ پھر دوسری دکانوں پر گھومتی پھرتی، حالات اور ماحول کا جائزہ لے کر میرے پاس آ گئی۔ جانے سے پہلے دروازہ اس نے باہر سے خود لاک کیا تھا۔ واپس آتے ہی کھٹا کھٹ اس نے فلیٹ کی تمام بتیاں جلا دیں، پنکھے چلا دیے۔ پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ طے شدہ پروگرام کے تحت ہم ایک دوسرے کی مخالف سمت چلے۔ وہ دائیں گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچی، میں بائیں گلی سے باہر نکلا۔ مجھے ٹیکسی روکنی تھی اور گل بہار کو قریب پہنچ کر کہنا تھا۔۔۔ ''اوہ رؤف تم!۔۔۔ کمال ہے، میں تو تمہاری طرف جا رہی تھی''۔۔۔ اور مجھے کہنا تھا۔۔۔ ''میں بھی تمہاری طرف آ رہا تھا، تمہاری بہن کی طبیعت خراب ہو گئی ہے، فوراً چلو''۔۔۔ گلی کے نکڑ پر ایک یلو کیب کھڑی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا، مخالف سمت سے گل بہار آئی۔ ہم نے طے شدہ مکالمے ادا کیے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

''سوسائٹی۔۔۔''

گل بہار نے کہا اور اونچی آواز میں پوچھنے لگی کہ باجی کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع آپ نے رات کو فون پر کیوں نہیں دی؟۔۔۔ میں معذرت کرنے لگا۔

جیسے ہی یلو کیب ایک پارک کے قریب سے گزری، گل بہار نے ریوالور نکال کر اس کی نال ڈرائیور کی گردن سے لگا دی۔

''گاڑی کھڑی کرو اور پیچھے دیکھے بغیر سامنے باغ کی ریلنگ پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔۔۔ مڑ کر نہیں دیکھنا ہے۔''

''م۔۔۔ مگر۔۔۔'' ڈرائیور کے ہاتھ سٹیئرنگ پر کانپنے لگے۔

''جس طرح کہا ہے، ویسا کرو۔۔۔'' گل بہار نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''جج، جی۔۔۔ ٹھیک ہے۔''

ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ وہ ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا آدمی تھا، بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور جا کر سٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا، گل بہار ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ذرا سی بھی مدافعت نہیں کی، چپ چاپ جا کر ریلنگ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس پر بے تحاشہ رحم آیا۔ میں نے گاڑی آگے نہیں بڑھائی گل بہار کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مجھے رحم آ رہا ہے اس بیچارے پر۔۔۔ گاڑی اس کے حوالے کرتے ہیں، دوسری گاڑی سہی۔۔۔''

''افوہ۔۔۔ پاگل آدمی۔۔۔!'' وہ جھنجھلا کر چیخی۔ ''دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟۔۔۔ پورے شہر میں پولیس تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے اور تمہیں ہمدردیاں سوجھ رہی ہیں۔۔۔ بڑھاؤ گاڑی آگے۔۔۔''

مَیں نے نیم دلی سے گاڑی آگے بڑھائی لیکن ڈرائیور کو مخاطب کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''گھبرانا نہیں دوست! تمہاری گاڑی تمہیں تھوڑی دیر بعد مل جائے گی۔۔۔''

''اونہہ۔۔۔!'' گل بہار نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''ہمدردیاں!۔۔۔ شاید تمہارے اندر کا مرد کبھی بیدار نہیں ہوگا۔۔۔ دائیں طرف موڑ کر سامنے گلی سے گزرتے ہوئے میدان تک پہنچو، جلدی۔۔۔ یہ علاقے دن میں اتنے رش والے نہیں ہوتے''۔

میں اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی کو مختلف گلیوں اور سڑکوں پر بھگاتا رہا، کبھی تیز تو کبھی مدھم۔

''دو گاڑیاں ہمارا پیچھا کر رہی ہیں''۔ گل بہار نے دزدیدہ نظروں سے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ تیزی سے موڑ کاٹ کر بائیں گلی میں داخل ہو جاؤ اس کے باہر ٹریفک کا خاصا رش ہے۔ اس میں داخل ہو کر انہیں ڈاج دو۔۔۔''

میں نے ایسا ہی کیا، بائیں گلی سے نکلتے ہی ٹریفک کی بھیڑ نظر آئی۔ موجیں مارتے دریا کی طرح کاریں، بسیں، چھوٹی بڑی گاڑیاں اور انسانوں کا ہجوم۔۔۔ میں نے پھرتی سے ایک بس اور ایک ٹرک کو اوورٹیک کیا۔ دائیں طرف ایک تنگ سی گلی تھی جو دور تک بل کھاتی چلی گئی تھی، اس میں داخل ہو کر میں نے رفتار آہستہ کر دی کیونکہ گلی کے اختتام پر ایک ریلوے کراسنگ تھی، شاید کوئی ٹرین آ رہی تھی اور پھاٹک والا پھاٹک بند کرنے کے لئے بڑھ رہا تھا۔ میں نے عقبی شیشے میں دیکھا تو ایک سرخ کار ہمارے پیچھے آ رہی تھی، گیٹ بند ہونے والا تھا۔ میں نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ دوسرے لمحے گاڑی اچھلتی ہوئی ریلوے لائن عبور کر رہی تھی اور ہمارے عقب میں آہنی پھاٹک بند ہو چکا تھا، پھر پھاٹک کے عقب میں رکی ہوئی سرخ کار ٹرین کے پیچھے چھپ گئی اور ہم تیزی سے آگے نکلتے گئے۔ پسینہ میری کنپٹیوں سے پھوٹ رہا تھا، ایک گہرا سانس لے کر مَیں نے گاڑی ایک چھوٹی سڑک پر ڈال دی جو آگے جا کر گھومتی ہوئی بڑی سڑک سے مل رہی تھی۔ چوک پر سرخ بتی روشن تھی۔

''گاڑی فٹ پاتھ کے کنارے روک دو۔۔۔''

گل بہار نے ایک بڑے شوروم کے کار پارک کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ایک وین اور کار کے درمیان خالی جگہ دیکھ کر ریلو کیب روک

دی، باہر آ کر ہم دونوں شوروم میں چلے گئے۔ یہ جاپانی موٹر سائیکلوں کا شوروم تھا، یہاں تھوڑی دیر رک کر ہم نے مختلف موٹر سائیکلوں کی قیمتیں پوچھیں اور پھر شوروم کے عقبی دروازے سے نکل کر سامنے شاپنگ پلازہ میں داخل ہو گئے۔ کئی دکانوں میں گھومتے پھرتے، چھوٹی موٹی چیزیں خریدتے ہم ایک صاف ستھرے رہائشی علاقے میں پہنچے۔ یہاں بیشتر مکانوں کے آگے تاڑ اور کیلے کے درختوں کے ساتھ ساتھ رات کی رانی کی شاخیں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ ہمیں گھومتے پھرتے سہ پہر ہو چکی تھی۔ اپنے تعاقب میں آنے والوں کو زیادہ سے زیادہ پیچھے چھوڑنے کیلئے ہم مختلف گلیوں اور بلاکوں میں ایک فرضی پتہ ڈھونڈتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ جہاں پولیس کا کوئی سپاہی یا گاڑی نظر آتی، ہم قریبی بنگلے کی طرف بڑھ کر کال بیل پہ انگلی رکھ دیتے اور فرضی پتہ پوچھتے۔ مجھے اس وقت شدید کوفت اور الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران ہم نے درختوں سے گھرے ہوئے ایک دو منزلہ بنگلے کی کال بیل بجائی۔ یہ علاقہ زیادہ تر نئی کوٹھیوں اور نو تعمیر شدہ بنگلوں پر مشتمل تھا لیکن کہیں کہیں پرانی عمارتیں بھی موجود تھیں۔ اس وقت جس بنگلے کی کال بیل بجائی تھی وہ بھی خاصا پرانا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک شخص گیٹ کھول کر باہر آیا، اس کے کندھے سے کلاشنکوف لٹک رہی تھی اور سر پر گول سرخ ٹوپی تھی۔ گل بہار مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور رٹے رٹائے انداز میں اس نے کہا۔

''یہاں ایک ٹھیکیدار شرافت علی کا بنگلہ ہے ہم بڑی دیر سے ڈھونڈ رہے ہیں۔۔۔''

''میں بھی آپ کو واچ ٹاور سے دیکھ رہا ہوں۔۔۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میرے مالک کا نام بھی شرافت علی ہے، وہ ٹھیکیدار ہیں۔۔۔ کوٹھی کا نمبر کیا بتایا آپ نے؟''

''ستائیس بی۔۔۔'' بے ساختہ گل بہار کے منہ سے نکلا۔

''یہی ہے۔۔۔'' دربان مسکرایا۔۔۔ ''صاحب موجود ہیں، آپ ان سے مل لیں۔''

گل بہار نے تیزی سے کوٹھی کا نمبر پڑھا، دھندلایا ہوا نمبر تھا اور نیم پلیٹ بھی ٹھیک طرح سے پڑھی نہیں جا سکتی تھی لیکن یہ ستائیس بی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ساتھ والی نئی کوٹھی پر پیتل کی چمکتی ہوئی پلیٹ پر ایک سو اٹھائیس بی تحریر تھا۔

''کوئی غلطی ہو گئی ہے شاید۔۔۔'' گل بہار زیر لب بڑبڑائی۔ ''ستائیس بی جانا تھا ہمیں اور یہ تو ایک سو ستائیس بی ہے، پورے ایک سو کا فرق ہے۔۔۔''

ایک اور لمبا تڑنگا آدمی گیٹ سے باہر نکلا، اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ گیٹ والے نے اشارے سے اسے کچھ بتایا پھر دونوں کے ہتھیار سیدھے ہو گئے۔

''اندر۔۔۔''

انہوں نے کلاشنکوف اور رائفل کی نالیں لہرائیں۔ ہم ان کی زد پر تھے اور ان کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہاں ذرا سی بھی بے احتیاطی ہمارا کام تمام کر سکتی تھی لہٰذا خاموشی سے اندر جانے میں ہی عافیت تھی۔ ہم بڑے گیٹ میں بنے ہوئے سائڈ ڈور سے اندر داخل ہوئے تو ہمارے عقب میں گیٹ پھرتی سے بند کیا گیا۔ کہیں قریب ہی بندھے ہوئے کتے خونخوار انداز میں بھونکے لیکن نظر نہیں آئے۔ پھر عمارت کے اندر سے ایک آدمی نکلا

اور ٹیرس سے چلتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔ جب وہ قریب پہنچا تو کلاشنکوف والے نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہا۔ وہ معنی خیز انداز میں ہماری طرف دیکھ کر سر ہلاتا رہا پھر تیزی سے عمارت کی طرف لوٹ گیا اور ہم ٹیرس پر کھڑے رہے۔ دونوں محافظ بے حد چوکس اور مستعد تھے۔۔۔ میں نے جھلا کر کہا۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔۔۔ کیوں اندر لائے ہیں ہمیں؟''

''سب پتہ چل جائے گا۔۔۔''

وہ تیز نظروں سے ہماری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ اس کی نظریں زیادہ تر گل بہار کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں بلکہ جائزہ کا لفظ عمل کے لیے بہت معمولی ہے، وہ نظروں سے گل بہار کا جسم چھید رہا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز برا لگا، حد درجہ گستاخ اور گھناؤنا۔۔۔ عین ممکن تھا کہ میں کلاشنکوف کی پروا کیے بغیر اس سے الجھ پڑتا لیکن گل بہار نے میرے تیور دیکھ کر آہستہ سے میرا بازو پکڑ کر سرگوشی کی۔

''ہمیں سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔۔۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ جہاں ہمیں جانا تھا اس جگہ کا پتہ ہم بھول چکے ہیں۔۔۔ بس!''

چند لمحوں بعد وہی شخص باہر نکلا اور اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اشارے سے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ بڑے سے قدیم گول برآمدے کے جس بغلی کمرے میں ہمیں پہنچایا گیا وہ باہر سے تو بہت خستہ اور قدیم نظر آ رہا تھا لیکن اندر سے جدید انداز میں سجا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر بہت بڑی بڑی خوبصورت پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ فرنیچر جدید اور قیمتی تھا۔ قالین بیحد دبیز اور خوبصورت تھا۔ بھورے بالوں والا ایک بھاری تن و توش کا آدمی سفید سلک کے شلوار کرتے میں ملبوس بڑے شاہانہ کروفر سے فلٹر میں قیمتی سگریٹ لگائے بیٹھا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے کش لگا رہا تھا۔ ہمیں اندر آتے دیکھ کر اس نے اپنی نشست میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی، بدستور ٹانگ پر ٹانگ رکھے اسی انداز میں سگریٹ پیتا رہا اور دزدیدہ نظروں سے ہمارے سراپے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے سگریٹ کا فلٹر پائپ بڑے قرینے سے ایک بڑی سی آرائشی ایش ٹرے میں رکھا اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہمارے ساتھ آنے والوں کو کمرے سے نکل جانے کا حکم آنکھ کی جنبش سے دیا۔

''کون لوگ ہیں آپ۔۔۔؟''

اس نے نہایت باوقار اور شائستہ لہجے میں کہا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ ایسے بارعب آدمی کے لہجے میں اتنی مٹھاس اور نرمی ہوگی۔۔۔ بے ساختہ میں پھٹ پڑا۔

''اتنے اچھے انسان کے نوکر کتنے بدتمیز ہیں۔ ہم ان سے پتہ پوچھ رہے تھے، یہ ہمیں گن پوائنٹ پر اندر لے آئے۔۔۔ یہ کون سی شرافت ہے؟''

''آئی ایم سوری۔۔۔!'' اس شخص نے گہرے ملال اور مٹھاس کے ساتھ کہا۔ ''جاہل ہیں، انہیں تمیز واقعی نہیں ہے اور کبھی کبھی تو بالکل وحشی ہو جاتے ہیں۔۔۔ بہرحال، بتایا نہیں آپ لوگ نے کہ آپ کون ہیں، کہاں سے تشریف لائے ہیں اور ملنا کس سے تھا؟''

''جی میرے ہسبنڈ کے دوست ہیں ٹھیکیدار شرافت علی صاحب۔۔۔'' گل بہار آگے بڑھ کر الجھن اور معصومیت کی ملی جلی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ ''ان کا پتہ ڈھونڈ رہے ہیں کئی گھنٹوں سے۔۔۔''

''شرافت علی ٹھیکیدار۔۔۔'' وہ شخص مسکرایا۔ ''آپ کے سامنے موجود ہے فرمایئے؟''

ہم دونوں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔۔۔ ''بنگلے کے نمبر میں غلطی ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ ہمارے مطلوبہ شرافت علی آپ نہیں ہیں۔۔۔''

''آل رائٹ۔۔۔'' وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا۔۔۔ ''میں نہ سہی، کوئی اور سہی لیکن اب آپ اندر آ گئے ہیں تو چائے پیئے بغیر نہیں جا سکتے''۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا کھسہ قالین پر ایک ابھری ہوئی جگہ رکھا۔ غالباً اس کے نیچے گھنٹی کا بٹن تھا، دوسرے ہی لمحے دو مختلف دروازوں سے وہی لوگ داخل ہوئے۔

''بابا۔۔۔!'' شرافت علی نے ہاتھ اٹھا کر ہماری طرف اشارہ کیا۔ ''چائے وائے لاؤ، یہ ہمارے مہمان ہیں۔۔۔ جاؤ شاباش، جلدی۔۔۔'' وہ لوگ چلے گئے تو باوقار شخصیت والے شرافت علی نے بتایا۔ ''اس شہر کی بہت سی عمارتیں میں نے بنائی ہیں لیکن اب عرصے سے میں نے ٹھیکیداری چھوڑ کر امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا ہے، روئی کی گانٹھیں اور کاٹن کی مصنوعات ایکسپورٹ کرتا ہوں، سرجری کے آلات امپورٹ کرتا ہوں۔۔۔ بیوی بچے گوٹھ میں ہوتے ہیں، کبھی یہاں آ جاتے ہیں''۔

''کتنے بچے ہیں آپ کے۔۔۔؟'' گل بہار نے نسائی تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔

''دو۔۔۔'' شرافت علی نے بتایا۔ ''لیکن بس اللہ کا مال ہیں۔۔۔ دونوں ماشاءاللہ خاصے بڑے ہیں لیکن معذور ہیں، وہیل چیئر کے بغیر ہل جل نہیں سکتے۔۔۔''

''علاج۔۔۔'' وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ''کوئی مہنگے سے مہنگا علاج ایسا نہیں ہے جو میں نے اپنے بچوں کیلئے نہ کیا ہو، کوئی جتن ایسا نہیں ہے جو میں نے چھوڑ دیا ہو۔ ڈاکٹر خود حیران ہیں کیونکہ نہ تو میرے بچوں کا نچلا دھڑ مفلوج ہے، نہ انہیں پولیو جیسی کوئی بیماری ہے۔ ان کے نچلے دھڑ عام بچوں کی طرح تندرست ہیں لیکن ہڈیوں کے گودے میں کوئی ایسا نقص ہے کہ وہ کھڑے نہیں ہو سکتے، اپنے طور پر بیٹھ بھی نہیں سکتے۔۔۔ خیر، یہ باتیں تو یونہی شروع ہو گئیں۔ آپ دونوں نے اپنا تعارف اب تک نہیں کروایا؟''

''میں رحیم بخش ہوں''۔ میں نے اٹھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور یہ میری۔۔۔'' میں گل بہار کو بیوی کہتے کہتے جھجکا، گل بہار نے مسکرا کر میری بات اچک لی اور بولی۔

''مجھے بیوی کہتے ہوئے یہ ہمیشہ جھجکتے ہیں حالانکہ اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ ان کے ماں باپ، عزیز و اقارب اور پہلی بیوی کو بھی پتہ چل چکا ہے، اب تو چھپانے والی کوئی بات نہیں رہی۔۔۔''

میں نے جھینپ کر مسکرانا چاہا لیکن بھینچ کر رہ گئے۔

''بہرحال، یہ تو آپ کے ذاتی معاملات ہیں''۔ شرافت علی نے خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اچھی بات یہ ہے کہ ان دنوں گوٹھ سے میری بیوی بچے آئے ہیں۔۔۔ آئیں خاتون! میں آپ کو ان سے ملاتا ہوں۔ میری بیوی ایک سادہ دیہاتی عورت ہے لیکن آپ اس سے مل کر خوش ہوں گی۔۔۔'' شرافت علی کھڑا ہوا۔ گل بہار اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھی۔ ''آپ جب تک اخبار پڑھیں۔۔۔'' شرافت علی نے مجھ سے

مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں خاتون کو اندر پہنچا کر آتا ہوں---''

مجھے کچھ تذبذب سا ہوا۔ یہ ملاقات جس طرح ہوئی تھی وہ مجھے الجھن میں ڈال رہی تھی، کوئی بات تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی لیکن شرافت علی نے اپنے نام کی طرح جس شائستگی اور متانت کے ساتھ گل بہار کو اپنی بیوی سے ملانے کی خواہش ظاہر کی تھی اسے دیکھ کر میں اس اجنبی سے انکار کی جرأت نہ کر سکا۔ وہ گل بہار کے ساتھ کوٹھی کے اندر چلا گیا اور میں یونہی اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ یہ تازہ اخبار تھا اور اس کے اندرونی صفحے پر میری تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں تھوڑا بہت پڑھ تو لیتا تھا، روانی سے لکھ نہیں سکتا تھا۔ تصویر کے نیچے چھپی ہوئی عبارت پڑھنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔

''یہ شخص سنگین جرائم کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب ہے۔ فوری طور پر اپنے قریبی پولیس اسٹیشن سے اس کے بارے میں رابطہ کیجئے، گرفتاری میں مدد دینے والے کو نقد انعام کے علاوہ تعریفی سند بھی دی جائے گی۔''

نیچے چند فون نمبر درج تھے۔ یہ تصویر بھی ان تصویروں میں سے ایک تھی جو سیٹھ ادریس کے گیسٹ روم میں کھینچی گئی تھیں۔ میں نے فوری طور پر اخبار کو تیزی سے تہہ کر لیا اسے قمیض کی داہنی جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ یکا یک شرافت علی کمرے میں داخل ہوا۔

''دونوں عورتیں گپ شپ کر رہی ہیں''۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ ''اور ان کے جلد اٹھنے کا کوئی امکان نہیں۔ ہمیں تھوڑا سا اطمینان سے بیٹھنے کا موقع مل جائے گا---''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں---''

میں نے ہوشیاری سے اخبار کے کاغذ کی کڑکڑاہٹ کو ہتھیلی سے دبا کر کہا۔ پھر یکا یک جیسے کمرے میں چھت پڑا، شرافت علی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''نبی بخش جنگی --- ایک اخبار چھپانے سے کیا بنے گا۔ یہ تو ہزاروں کی تعداد میں چھپتا ہے، کس کس کو چھپاؤ گے؟''

زمین میرے پیروں تلے سے سرکنے لگی لیکن میں نے سنبھلتے ہوئے اپنے لہجے کو پُر اعتماد بناتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں، ٹھیکیدار صاحب---؟''

''تم سب کچھ سمجھ چکے ہو نبی بخش جنگی! بس ایک بات نہیں سمجھے کہ میں تمہارا دشمن نہیں، دوست ہوں۔ میں اس اتفاق پر حیران ہوں کہ یوں اچانک تم سے ملاقات ہو رہی ہے --- ذرا اپنے پیچھے دیکھو---''

میں نے تیزی سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ میرے پیچھے صوفے اور دیوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دیوار پر ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی، یہ کسی وڈیرے کی قلمی تصویر تھی جیسی عام طور پر بعض روایتی گھرانوں کے بزرگوں کی ہوتی ہیں، اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہارا تعلق گوٹھ صادق علی کے جلال دین کی حویلی سے ہے---'' شرافت علی نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اس کے مفرور ملازم ہو اور اس کی حویلی سے قیمتی زیورات اور خاندانی نوادرات چرا کر بھاگے ہو جس کی اس نے اپنے

علاقے میں باقاعدہ ایف آئی آر درج کرا رکھی ہے۔۔۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ شرافت علی کیا کہہ رہا تھا اور میں کیا سن رہا تھا، توقع بھی نہیں تھی کہ میں یوں اتفاقاً علمی میں ایک ایسے شخص سے جا ٹکراؤں گا جو میرے ماضی سے پوری طرح سے واقف ہوگا مگر میرے ماضی سے واقف ہونے والا یہ شخص خود کون تھا؟۔۔۔ میں نے حیرت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"اس تصویر کو پہچانو۔۔۔" شرافت علی بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "اسی کی پہچان میں تمہاری نجات مضمر ہے۔۔۔"

میں نے پلکیں جھپک جھپک کر تصویر کے خدوخال پہچاننے کی کوشش کی مگر پہچان نہ سکا۔ ایک تو یہ قلمی تصویر تھی، دوم اس شخص سے میں کبھی نہیں ملا تھا اسے کبھی دیکھا نہیں تھا تو پہچانتا کیسے؟

"نہیں پہچانے؟" شرافت علی میرے چہرے سے الجھن پڑھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں۔۔۔ یہ گوٹھ محمد بخش کے رئیس مرحوم وڈیرا خان بہادر ہیں، وڈیرا سردار محمد خان کے والد۔۔۔"

"اوہ۔۔۔!"

میں چونک پڑا۔۔۔ گوٹھ محمد بخش کے رئیس مرحوم اور ان کے بیٹے وڈیرا سردار محمد خان کو کون نہیں جانتا تھا، وہ جلال دین کا مدمقابل تھا۔ اس کا چچازاد بھائی ہونے کے باوجود ہر طرح اسے نیچا دکھانے کا آرزومند۔۔۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نادانستگی میں ایسی جگہ آ گیا تھا جو میرے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔

"لیکن۔۔۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں۔۔۔" شرافت علی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "سردار محمد خان کا عزیز ہوں۔ تم مجھے اس کا قریب ترین عزیز کہہ سکتے ہو کیونکہ میں اس کا بہنوئی ہوں۔۔۔"

"وڈیرا سردار محمد کی ہمشیرہ آپ کی بیگم ہیں۔۔۔؟" میں نے پلکیں جھپک کر پوچھا۔

"الحمدللہ۔۔۔!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمی رہی۔ "سردار محمد اکثر کراچی آتا رہتا ہے، یہاں سوسائٹی میں اس کا بنگلہ بھی ہے۔ وہ اس مرتبہ جلال دین کی ضد میں الیکشن بھی لڑنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کی آمدورفت کراچی میں زیادہ رہتی ہے، اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ جلال الدین کا کوئی ملازم چوری کر کے بھاگ نکلا ہے مگر اس کے فرار کے چند ہی دنوں بعد پولیس اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں کی مدد سے پہلی مرتبہ حویلی کی تلاشی لی گئی، شہر کراچی کے کسی بارسوخ آدمی نے اس تلاشی کے لئے نیچے سے لے کر اوپر تک انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔۔۔ تمہارے بارے میں مجھے کچھ روز قبل شائع ہونے والے اشتہار گمشدہ کے ذریعے معلوم ہوا تھا پھر تازہ ترین تصویر اور سرکاری اعلان نے پوری کہانی واضح کر دی۔ بہرحال۔۔۔" وہ سگریٹ سلگائے ہوئے بولا۔ "اب میں پوری کہانی تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ میری دلچسپی اس معاملے سے صرف اتنی ہے کہ سردار محمد، وڈیرا جلال دین کا انتخابی حریف ہے اور جلال دین کے خلاف چھوٹی سے چھوٹی شہادت بھی اس کے کام آ سکتی ہے۔"

میں ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا— معاملات جو رخ اختیار کر رہے تھے اب اس میں میرا عمل دخل خود میرے لیے دشواریاں اور الجھنیں پیدا کر سکتا تھا۔ میں گوٹھ محمد صادق کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور حالات اور واقعات نے میری بے گناہی کو گناہ گاری میں بدل دیا تھا، میرے شفاف چہرے پر کالک جم چکی تھی، حالات کی کالک— اب میں گوٹھ محمد صادق یا گوٹھ محمد بخش کے کسی منظر میں نمودار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دنیا مجھ سے چھوٹ چکی تھی۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کر شرافت علی نے تحمل سے کہا۔

''ٹھیک ہے، نبی بخش جنگی! اگر تم تفصیل سے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے تو مت بتاؤ، صرف اتنا بتاؤ کہ زیورات اور خاندانی نوادرات کی چوری کا کیا قصہ ہے؟''

''کوئی قصہ نہیں—'' میں نے فوراً قطعیت سے کہا۔ ''میں اس معاملے سے قطعی لاعلم ہوں— کیسی چوری؟''

''کیا تم نے چوری نہیں کی جس کی ایف آئی آر وڈیرا جلال دین نے درج کرائی ہے''۔

اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور مضبوط لہجے میں کہا۔

''ٹھیکیدار صاحب! یہ معاملہ چوری کا نہیں ہے، بات کچھ اور ہے۔ آپ سردار محمد خان کے بہنوئی ہیں، آپ کو وڈیروں کے مزاج کا اچھی طرح اندازہ ہوگا''۔

''بہت اچھی طرح—'' وہ مسکرایا۔ ''لیکن تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ میں سردار محمد خان کا بہنوئی ہی نہیں، اس کا سپورٹر بھی ہوں۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اپنے تمام وسائل کام میں لا کر اسے کامیاب کرانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ کیونکہ اب معاملہ آن اور عزت کا ہے، جلال دین کو کسی صورت میں کامیاب نہیں ہونا چاہیے''۔

اس کے اصرار پر میں نے جھجکتے ہوئے اسے مختصر الفاظ میں اپنے فرار کی داستان سنا دی لیکن نفیسہ کا ذکر نہیں کیا اور اژدن سانپ اور گل بہار سے تعلق کا معاملہ بھی گول کر گیا البتہ میں نے حاکم نیاز و پر حملے تک کے واقعات بلا کم و کاست بیان کر دیئے— میں بول رہا تھا اور شرافت علی کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا جیسے اس کے اندر آندھیاں چل رہی ہوں، سینہ کسی اندرونی جوش سے پھول اور پچک رہا تھا۔ یکا یک وہ پُرجوش انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ویل ڈن—'' اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نبی بخش جنگی! تم ہمارے لیے بیحد قیمتی ہو، بیحد قیمتی—'' اس کے ساتھ ہی اس نے قالین پر پاؤں دبا کر گھنٹی بجائی تو تین ملازم حاضر ہو گئے۔ میرے مہمان کے لئے اوپر آخری کمرہ تیار کرو''۔ اس نے حکم دیا۔ اللہ دین کے جن کی طرح ملازم تعمیل کیلئے بھاگے۔ ''اب—'' شرافت علی نے دونوں بازو میرے کاندھوں پر رکھ دیئے۔ ''اب تم یہاں رہو گے، اور تمہاری بیوی بھی— تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری ہم کروائیں گے''۔

ایک ملازم ٹیلی فون سیٹ لیے ہوئے اندر آیا۔ ''سیٹھ سائیں، آپ کا فون—''

شرافت علی نے ریسیور کان سے لگا لیا، کچھ دیر بات چیت کی اور پھر سلسلۂ گفتگو منقطع ہونے پر ریسیور ملازم کو پکڑا دیا۔

''بابا گوٹھ میں سردار محمد سے ملاؤ۔۔۔ فوراً۔۔۔''

ملازم نمبر ڈائل کرنے لگا اور رابطہ قائم ہونے پر ریسیور اس نے ادب سے شرافت علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ وڈیرا سائیں خود لائن پر ہیں۔ شرافت علی نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر وڈیرے سے بات کی، دو ایک مرتبہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور میں صرف اتنا سن سکا۔

''ہاں، اب وہ میرا مہمان رہے گا۔ میں اسے بیل آوٹ کراؤں گا۔۔۔ بے فکر رہو۔''

بات ختم ہونے پر ملازم ٹیلی فون سیٹ لے کر چلا گیا۔ شرافت علی نے اسے کھانا لگانے کا کہہ دیا تھا۔ ہم پھر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں گفتگو میں خاصا محتاط تھا لیکن شرافت علی کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے میرے ذاتی فعل سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں اس کے ہاتھ میں ایک ایسا قیمتی مہرہ ہوں جسے وہ جلال دین کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔۔۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے کھانے کا وقت ہو گیا۔ ہم دونوں نے ایک خوبصورت ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا، کافی پینے کے دوران اس نے دو ایک جگہ فون پر بات کی غالباً اپنے وکیلوں سے میری ضمانت کے سلسلے میں۔۔۔ پھر ادھر سے مطمئن ہو کر اس نے کہا۔

''صبح میرے وکیل میرے پاس آئیں گے۔ کل ہی تمہاری ضمانت کیلئے کاغذات بھی تیار ہو جائیں گے اور انشاء اللہ ہم تمہاری ضمانت کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ایک خبر تمہارے علم میں شاید نہیں ہے ورنہ تم اپنی داستان میں اس کا تذکرہ بھی کرتے۔۔۔''

''کیسی خبر۔۔۔؟'' مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''تمہارا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔۔۔'' شرافت علی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ کتوں کی نگہداشت پر مامور تھا۔ ایک رات ڈاگ ہاؤس کے قریب مردہ پایا گیا، اس کی پنڈلی کسی پاگل کتے نے کاٹ کھائی تھی۔''

''نہیں۔۔۔'' میں چیخ پڑا۔ ''خدا کیلئے ایسا نہ کہیں، ایسا نہ کہیں شرافت علی صاحب!''

''صبر کرو، جنگی۔۔۔!'' اس نے میرے کاندھے پر تھپکی دی۔ ''حوصلہ کرو، صبر کرو۔۔۔''

''میرے والد کو قتل کیا گیا ہے۔۔۔'' میں نے مٹھیاں بھینچ کر چیختے ہوئے کہا۔ ''میرے والد کو صریحاً قتل کیا گیا ہے۔ کتے کے کاٹنے سے آدمی نہیں مرتا، اسے مارا گیا ہے اور مارنے کے بعد ڈاگ ہاؤس کے قریب پھینکا گیا ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے سیٹھ صاحب۔۔۔!'' میں نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''میں گوٹھ صادق علی نہیں جانا چاہتا تھا مگر اب جاؤں گا، اب میں انتقام کی آگ بن کر جاؤں گا۔۔۔ مجھے جانے دیں''۔

''ضرور جاؤ۔۔۔'' شرافت علی نے میرے ہاتھ پر تھپکی دے کر کہا۔ ''میں تمہیں جانے سے نہیں روکتا مگر تمہیں ایک محفوظ اور مضبوط آدمی کی حیثیت سے وہاں جانا چاہئے۔ اس کیلئے سب سے پہلے ضمانت ضروری ہے''۔

میرے اندر کا اکھڑ وحشی بیدار ہو چکا تھا، میں نے چیخ کر کہا۔ ''سیٹھ شرافت علی! میں کسی ضمانت کو نہیں مانتا، میں آندھی طوفان بن کر گوٹھ پہنچوں گا اور اس کمینے آدمی کے سینے میں گولیاں اتار دوں گا۔ پھر بیشک مجھے پھانسی پر لٹکنا پڑ جائے، مجھے کوئی ملال نہیں ہوگا''۔

''اچھا، میری بات سنو!'' شرافت علی میرے کاندھے دبا کر مجھے بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری دلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن نبی بخش جنگی! یہاں جذبات سے کام مت لو۔ یہ جذباتی ہونے کا مرحلہ نہیں ہے، بہت ٹھنڈے طریقے سے سوچ بچار کرنے کے بعد تمہیں ایسا قدم اٹھانا ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے — ابھی تم اوپر جاؤ، بھابی کے ساتھ ہنسی خوشی رات گزارو۔ صبح ہم ضمانت کا معاملہ دیکھیں گے۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارے لیے کون سا راستہ مناسب رہے گا — تم جو اتنے جذباتی ہو رہے ہو تو اپنے جوشیلے خون کو کنٹرول میں رکھو، کوئی ایسا راستہ مت اختیار کرو جو تمہیں سیدھا پھانسی گھاٹ لے جائے — آؤ، میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھاؤں —''

پھر وہ بل کھاتے ہوئے قدیم زینوں کے ذریعے مجھے کوٹھی کی بالائی منزل پر لے گیا جہاں ایک کونے میں ایک محفوظ، آرام دہ اور خوشبودار کمرہ میرا منتظر تھا۔ ایک ملازم گرد و غبار صاف کرنے کے بعد فریشنر سے کمرے میں اسپرے کر چکا تھا اور اب ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا۔

''جاؤ، بابا —'' شرافت علی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''بھابی صاحب کو بول دو کہ صاحب کمرے میں پہنچ گیا ہے''۔

کچھ دیر تک وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر سنگھار میز کے قریب کھڑا ہو گیا اور گردن موڑے بغیر آئینے میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''نبی بخش جنگی! ایک بات اچھی طرح اپنے دل میں بٹھا لو کہ تم میرے مہمان ہو، میرے قیدی نہیں ہو۔ پورا شہر بھی تمہارا دشمن بن جائے تب بھی شرافت علی کا گھر تمہیں پناہ دے گا۔ مجھ سے مردوں والا ہاتھ ملاؤ اور وعدہ کرو کہ تم جذباتی ہو کر کام نہیں بگاڑو گے، عقل استعمال کرو گے اور کوئی قدم میرے مشورے کے بغیر نہیں اٹھاؤ گے —''

اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر بھینچا، اپنائیت اور دوستی کے اظہار کیلئے محبت بھرے جھٹکے دیئے۔ اتنے میں گل بہار ملازم کے ساتھ اندر آ گئی۔ وہ خوش تھی، اس کے چہرے پر قہقہے سے جلتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ آتے ہی کہنے لگی۔

''بھابی اور بچے بہت اچھے ہیں، برسوں بعد میں نے گھر داری کی فضا دیکھی ہے۔ میں یہاں پہنچ کر ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے اسی گھر کی ایک فرد تھی جو کہیں چلی گئی تھی اور برسوں بعد لوٹی ہوں تو در و دیوار میں وہی اپنائیت اور مکینوں میں وہی محبت ہے''۔

شرافت علی شائستگی سے مسکرایا اور بولا۔ ''یہ آپ کا اپنا گھر ہے — آپ کے شوہر سے کچھ قریبی تعلق بھی نکل آیا ہے۔ اب آپ لوگ ہمارے مہمان نہیں، آج سے اس گھر کے فرد ہیں''۔

اس کے جانے کے بعد بے ساختہ گل بہار مجھ سے لپٹ گئی، کہنے لگی۔ ''رحیم بخش! ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں چلتے پھرتے اتنے اچھے لوگ اور اتنی محفوظ پناہ گاہ مل جائے گی لیکن شرافت علی نے تم سے قریبی تعلق کا جو حوالہ دیا ہے وہ مجھے الجھن میں مبتلا کر رہا ہے — بات کیا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں —'' میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ ''میرا ایک دوست ہے جس کے حوالے سے ایک طرح قریبی تعلق بن گیا ہے''۔

''دوست کون ہے —؟''

گل بہار نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا لیکن میں ہنس کر ٹال گیا اور کہا۔

''بس ہے کوئی، کیا کرو گی پوچھ کر — بے شمار لوگ میرے دوست ہیں''۔

O

کئی دنوں کے بعد مجھے پُرسکون نیند آرہی تھی لیکن بابا کی موت کی خبر نے نیند میری آنکھوں میں پسی ہوئی سرخ مرچ کا پوڈر بنا دی تھی۔۔۔ عجیب صورتحال تھی۔ گل بہار میرے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ میری طرف کروٹ بدلے کہنی کے سہارے سر اونچا کیے مجھ سے باتیں کر رہی تھی مگر میں گہرے دکھ کے دبیز بادلوں میں ڈوبا ہوا تھا، اس سے بہت قریب ہو کر بھی میں بہت دور تھا۔ میں اسے دل کی اندرونی کیفیات سے کھل کر آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ بہت کچھ میں نے اس سے چھپا رکھا تھا اور بہت کچھ چھپانے کا خواہاں تھا۔ دو ایک مرتبہ اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن میری کھلی ہوئی آنکھیں چھت کے نقش و نگار اور چھاڑ فانوس میں اٹکی ہوئی تھیں اور میرے دل میں آریاں چل رہی تھیں۔ شرافت علی نے میرے باپ کی موت کے بارے میں مجھے آگاہ کیا تھا لیکن میرے پوچھنے کے باوجود میری ماں کے بارے میں مجھے کچھ نہ بتا سکا تھا، یقیناً میری بوڑھی ماں میرے کسی دور افتادہ غریب رشتے دار کے پاس چلی گئی ہوگی۔۔۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے لیکن میں اپنے دل کو یہی سوچ کر تسلی دینا چاہتا تھا کہ میری ماں میرے کسی عزیز کے گھر چلی گئی ہوگی۔۔۔ وہ رات عجیب و غریب کیفیت میں گزاری اور دوسری رات بھی اسی طرح گزاری۔ تیسرے دن صبح ہی صبح شرافت علی نے میری ضمانت قبل از گرفتاری کا بندوبست کر دیا۔ میں قانون کی باریکیوں کو نہیں سمجھتا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری ضمانت کن کن مقدمات میں ہوئی تھی۔ یہ کب تک مؤثر ہے اور میری قانونی پوزیشن کیا ہے لیکن شرافت علی کے تعلقات چوٹی کے وکیلوں سے تھے اور چند ایک اس کے خاندانی وکیل تھے۔ لہٰذا یہ معاملہ دو تین دن میں سہولت سے نمٹ گیا۔ میری ضمانت کی خبر اس نے خود اوپر پہنچ کر سنائی تھی اور گہری اپنائیت سے ہمیں مبارک باد دی تھی۔ عین اسی وقت گوٹھ سے فون آ گیا اور وہ ہم سے رخصت ہو کر فون سننے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد گل بہار نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر دیے۔

''رحیم بخش۔۔۔!'' اس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خدا نے تمہیں ایک بڑی مشکل سے تو نکال لیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ ہم کب تک محفوظ ہیں۔۔۔ تم میری ایک بات مان لو۔۔۔''

''کہو۔۔۔'' میں نے آہستگی سے اس کے ہاتھ الگ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔۔'' وہ جدوجہد کر کے پھر اپنے بازو میرے گرد حمائل کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ بازو اسی طرح اپنے وجود کے ساتھ بندھے رہنے دو ہمیشہ کے لیے۔۔۔ رحیم بخش! مجھے سچ مچ اپنا لو، مجھ سے نکاح کر لو۔۔۔''

''مگر شرافت علی کو تو ہم نے اپنا تعارف میاں بیوی کی حیثیت سے کرایا ہے۔۔۔''

''شرافت اچھا انسان ہے مگر ہم نے اس کے ساتھ ہمیشہ رہنے کا کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے''۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''کوئی ضروری نہیں کہ ہم یہاں رہیں، ہم کسی بھی وقت یہاں سے جا سکتے ہیں۔۔۔ تمہاری ضمانت ہو چکی ہے۔''

''مگر۔۔۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ضمانت کے کاغذات تو شرافت علی کے پاس ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم جائیں گے کہاں اور تم بھی تو اس جگہ مجھے لے کر نہیں گئیں جہاں جانے کا پروگرام تھا۔۔۔؟''

''ہم اس علاقے سے تقریباً بیس بائیس کلومیٹر مخالف سمت میں نکل آئے ہیں''۔ گل بہار نے بتایا۔ ''اور وہاں تک پہنچنے کیلئے ہمیں شہر کی ان

معروف سڑکوں سے گزرنا پڑے گا جہاں ہم دونوں کے شکاری ہماری تاک میں ہوں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہے ---" میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر یکا یک خود پر طاری فکر کو دور کرنے کیلئے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "نکاح ہو تو سکتا ہے لیکن ابھی میں کسی کی زندگی کو اپنے ساتھ باندھنا نہیں چاہتا لہٰذا کچھ عرصے کیلئے یہ خیال اپنے دل سے نکال دو ---"

گل بہار کے چہرے پر جیسے کئی پرچھائیاں آ کر گزر گئیں، آنکھیں نم ہو گئیں اور ان میں آنسوؤں کی چمک اجاگر ہو گئی۔ اس نے عقب سے آ کر میرے شانے پر ٹھوڑی رکھ دی۔

"رحیم بخش ---!" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اپنی بیوی نہیں بنانا چاہتے، دوست بھی نہیں رکھنا چاہتے کیونکہ مجھ جیسی عورت کو زندگی بھر کیلئے کوئی اپنے دل کا روگ نہیں بنا سکتا۔ سب وقتی طور پر دل بہلاوے کی باتیں کر کے غائب ہو جاتے ہیں، زندگی بھر نبھانے کی سکت کسی میں نہیں لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم ایسے آدمی نہیں ہو۔ تم میری تمام آلودگیوں کے باوجود مجھے اپنا لو گے، مجھے دربدر کی ٹھوکروں سے بچا لو گے --- خدا کی قسم! میں کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں جا کر، کھلے آسمان کے نیچے گارے مٹی کے چولہے پر تمہارے لیے روٹی پکانے میں خوشی محسوس کروں گی، میں تمہاری میلی جرابیں دھونے اور بوٹ پالش کرنے میں فخر محسوس کروں گی۔ اب میں اپنی اس بے مقصد اور بیہودہ زندگی سے تنگ آ چکی ہوں رحیم بخش! تھک چکی ہوں، بہت تھک چکی ہوں۔ اس سے پہلے کہ زمین مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لے، تم مجھے سنبھال لو۔ مجھے مزید بھٹکنے، مزید تباہ ہونے سے بچا لو"۔

وہ یہ سب کہتے کہتے رو پڑی، روتے روتے اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا اور آنسوؤں سے میری قمیض بھگو دی۔ جس گہرے کرب اور حقیقی سوز کے ساتھ وہ رو رہی تھی اس نے مجھ پر بھی رقت طاری کر دی تھی لیکن اتنی مختصر سی رفاقت میں اتنا بڑا فیصلہ یوں فی الفور کیسے ممکن تھا؟ --- وہ میری کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھی، وہ ہر حال میں مجھ سے ہاں کہلوانا چاہتی تھی۔ اسے ٹالنے اور خوبصورتی سے ٹالنے کیلئے میں نے پینترا بدل کر اپنا لہجہ سخت کر لیا۔

"دیکھو، گل بہار ---!" میں نے اکتائے ہوئے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "تمہاری ساری باتیں جذباتی ہیں اور معاف کرنا، زندگی جذبات سے نہیں بلکہ سمجھداری سے بسر کی جاتی ہے۔ نہ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہو اور نہ میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں۔ ابھی کچھ وقت گزرنے دو، ہم ایک دوسرے کو مزید دیکھ اور پرکھ لیں تو پھر آپس میں سنجیدگی سے کوئی فیصلہ کریں گے --- ٹھیک! --- بس آئندہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہونی چاہیے"۔

وہ آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر واش بیسن کی طرف منہ دھونے چلی گئی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اس نے دیوار گیر آئینے میں مجھے دیکھا اور گلوگیر لہجے میں بولی۔

"جب میرے جیسی عورتوں کے اندر سوئی ہوئی عورت بیدار ہوتی ہے تو وہ سر سے پاؤں تک بدل جاتی ہیں، میں بھی خود کو بدلتے ہوئے محسوس کر رہی ہوں۔ اب ہم اس وقت تک ایک کمرے میں نہیں سو سکتے جب تک نکاح نہ کر لیں --- میں آج رات سے بیگم شرافت سے علی کو کہہ کر

نیچے بچوں کے کمرے میں اپنا بیڈ لگوالوں گی۔۔۔"

"مگر یہ لوگ کیا سوچیں گے۔۔۔ ہم خود کو میاں بیوی ظاہر کر چکے ہیں۔۔۔؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "کیا میاں بیوی کبھی الگ نہیں سوتے؟۔۔۔ میں کہہ دوں گی کہ بچوں کے پاس میرا دل لگتا ہے۔ بچوں کی گورنس بھی اسی کمرے میں ہوتی ہے، خاصا بڑا ہال نما کمرہ ہے۔ اس میں خوبصورت پارٹیشن بنے ہوئے ہیں"۔

میں نے زچ ہو کر کہا: "بلاوجہ ان لوگوں کو مشکوک مت کرو، یہ اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔۔۔"

"میں وہی کروں گی جو میں کہہ چکی ہوں"۔

وہ ضد پر اڑ گئی واقعی اس نے اپنے کہے کو عملی شکل دے دی، خدا جانے بیگم شرافت نے کیا کہا کہ شرافت علی کو خود مجھ سے کہنا پڑا۔

"میرے بچے تمہاری بیوی سے بہت مانوس ہو گئے ہیں، اگر تم برا نہ محسوس کرو تو رات کو وہ ان کے پاس سو جایا کرے"۔

ظاہر ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن شوہر والا جھوٹ نبھانے کی خاطر مجھے تھوڑی سی ناگواری ظاہر کرنی پڑی۔۔۔ ایک لمحے کیلئے میرا جی چاہا کہ اسے حقیقت حال سے آگاہ کر دوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے یہ خیال سختی سے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ گل بہار جیسی بھی تھی، بہرحال ہم ایک ہی کشتی کے سوار بن چکے تھے اور صحیح بات بتا کر میں شرافت علی کو کسی امتحان میں اور گل بہار کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح خود میرے لیے بہت سی دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔۔۔ باپ کی اندوہناک موت کی خبر نے بھی مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میں مسلسل شرافت علی سے اصرار کرتا رہا کہ وہ وڈیرا سردار محمد کے ذریعے مجھے میری ماں کی خیریت سے آگاہ کرے۔ شرافت علی فون پر سردار محمد خاں سے مسلسل رابطے میں تھا لیکن میری ماں کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اتنا البتہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ گوٹھ چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی۔۔۔ کہاں گئی تھی؟ یہ معلوم کرنا ابھی باقی تھا۔ وہ ضعیف اور بیمار تھی، اسے علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ اس عمر میں اس کا جوان بیٹا گھر سے غائب ہو گیا، شوہر نے زندگی بھر کی رفاقت اور ساتھ چھوڑ دیا تو یہ کوئی معمولی دکھ نہیں تھے۔

چار دن بیت گئے۔۔۔ گل بہار نیچے سوتی رہی۔ پانچویں دن شرافت علی نے بتایا۔ "تمہاری ماں تمہارے رشتے کے ماموں کے پاس گوٹھ سجاول خان میں خیریت سے ہے"۔

یہ خبر سن کر میری جان میں جان آئی۔۔۔ گوٹھ سجاول خان ہمارے گوٹھ صادق علی سے بیس بائیس کلومیٹر دور ایک نہر کنارے آباد نسبتاً خوشحال بستی تھی اور گوٹھ محمد بخش کی عملداری میں آتی تھی، یہاں وڈیرا جلال دین کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

"تمہاری ماں خیریت سے ہے مگر شاید مسلسل رونے سے اس کی بینائی پر اثر پڑا ہے۔۔۔" شرافت علی نے بتایا۔ "تاہم دوا دارو کیلئے سردار محمد نے تمہارے ماموں کو نقد رقم، گندم اور چینی بھجوا دی ہے۔ تم بالکل مطمئن رہو، اب اس کا علاج اور کفالت ہمارے ذمے ہے اسے تمہاری خیریت سے آگاہ کر دیا گیا ہے اور وہ تمہاری خیریت جان کر بہت خوش ہوئی ہے لیکن اسے تمہارے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ تم کہاں ہو۔۔۔"

پھر وہ جانے کیلئے اٹھا لیکن کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک گیا۔

''نبی بخش جنگی ---!'' وہ آہستہ سے میری طرف مڑا۔ ''دو تین روز سے میرے ملازم مجھے چند مشکوک گاڑیوں کے بارے میں بتا رہے ہیں جو اکثر میری کوٹھی کا طواف کرتی ہیں، شاید وہ لوگ تمہاری تلاش میں ہیں لیکن وہ تم تک خواب میں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ میرے ملازم بہترین نشانے باز ہیں اور میرے قدیمی نمک خوار ہیں---''

''وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں---؟'' میں نے لہجے سے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو کوئی اندازہ ہے؟''

''ایک خاص گاڑی میں نے چیک کی ہے''۔ شرافت علی نے کہا۔ ''وہ سرخ رنگ کی ڈاٹسن ہے''۔

''سرخ کار---'' میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ''ایک سرخ کار ہمارے تعاقب میں خاصی دور تک آئی تھی، غالباً یہ وہی کار ہوگی''۔

شرافت علی کو جہاں تک میں سمجھ سکا تھا، وہ ایسا آدمی تھا جو بہت گہرے ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی گہرائی کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ میری ہر بات کے جواب میں اس کے چہرے پر ایک پُراعتماد مسکراہٹ چمکتی تھی اور بس!--- یہ پھیکی مسکراہٹ نہیں ہوتی تھی، بےحد پُرکشش، گہری اور قدرتی تھی اور لگتا تھا کہ زندگی نے اسے ہر قسم کے حالات میں پُرسکون رہنے کی تربیت دی ہے۔ ایسے لوگ مضبوط دل گردے اور آہنی اعصاب کے مالک ہوتے ہیں۔ اس مشاہدے کا مزید احساس اس کے پاس کچھ اور روز رہ کر ہوا--- ایک رات ہم دونوں کھانے کی میز پر کھانے کے بعد قہوہ پی رہے تھے کہ اچانک ایک ملازم سنبل تیزی سے اندر داخل ہوا، پھرتی سے جھک کر اس نے شرافت علی کے کان میں کچھ کہا اور کوئی ہدایت پاتے ہی تیزی سے پیچھے لپکا۔ ان کے جاتے ہی اچانک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ان گولیوں کا کوئی خاص ہدف نہیں تھا مگر ان کا رخ عمارت کی طرف تھا جیسے اچانک ٹین پر اولے برسنے لگیں۔ تڑتڑتڑ، دھائیں دھائیں--- عمارت کے بیرونی حصے کی کھڑکیوں کے شیشے چھنا چھن ٹوٹ رہے تھے۔ میں نے لپک کر اپنے پردے جوڑے سے ریوالور نکالا، حملہ آور جو بھی تھے اب معاملہ سوچ بچار کا نہیں تھا۔ اس دوران سڑک کی طرف سے ایک اور برسٹ فائر ہوا۔ شرافت علی نے بڑے اطمینان سے کُرتے کے نیچے ہاتھ ڈالا، تب پہلی بار میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لباس کے نیچے مستقل طور پر ہولسٹر رکھتا ہے۔ اس نے پھرتی سے پستول نکال کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم گھوم کر جھکے جھکے عمارت کے زینے کی طرف بڑھنے لگے۔ اب کوٹھی کے تمام ملازموں نے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے کر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ان کی جوابی فائرنگ اتنی بھرپور اور منظم تھی کہ باہر سے برستی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ میں پہلے تو کچھ انسانی چیخیں شامل ہوئیں پھر گاڑیوں کے ریورس ہونے اور پہیوں کی رگڑ سے اٹھنے والی چرچراہٹ کا شور ہر طرف پھیل گیا۔ حملہ آور اکا دکا فائر کرتے ہوئے تیزی سے واپس پلٹ گئے۔ اتنی دیر میں آس پاس کے بنگلوں کی کھڑکیاں کھلنے اور لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شرافت علی پھرتی سے نیچے اترا اور سب سے پہلے وہ زنان خانے میں گیا۔ وہاں سب خیریت تھی۔ پھر وہ ٹیرس پر آیا تو سب ملازم اتر کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ لان اور ٹیرس کے کئی بلب گولیوں کا نشانہ بنے تھے، آہنی گیٹ پر بری طرح فائرنگ ہوئی تھی اور جگہ جگہ سے چھلنی ہو چکا تھا--- شرافت علی بڑے اطمینان سے ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔

''معمولی بات ہے بابا---'' وہ بار بار ملازموں سے کہہ رہا تھا۔ ''دشمن داریوں میں سب کچھ چلتا ہے بابا---''

''سیٹھ سائیں---!'' ایک بوڑھے ملازم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''صداقت منزل میں ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا۔ آپ ڈی آئی جی صاحب سے بات کریں''۔

''کرلیں گے بابا، کرلیں گے ---'' شرافت علی نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''کتے بند تھے نا---؟''

''جی، سیٹھ سائیں---!'' پستہ قد کتوں کا رکھوالا آگے آ کر بولا۔ ''میں بس انہیں کھولنے ہی جارہا تھا کہ گیٹ کی طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی''۔

''کوئی بات نہیں بابا---'' شرافت علی اس کے کندھے پر تھپکی دے کر بولا۔ ''کتے کھول دو--- غنی کدھر ہے؟''

واچ ٹاور کا محافظ اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔

''جی سیٹھ سائیں---!''

شرافت علی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر لائٹر کا شعلہ اس کے چہرے کے قریب لے گیا۔

''عبدل غنی---!'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''جب پہلا برسٹ فائر ہوا تو فوراً تم نے جوابی فائر کیوں نہیں کیا---؟''

''سیٹھ سائیں---!'' وہ جھینپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس وقت میں باتھ روم میں تھا۔ پھر میری گن واچ ٹاور میں تھی، اسے لوڈ کرنے میں دیر لگ گئی--- معافی چاہتا ہوں---''

''کوئی بات نہیں---'' شرافت علی نے تحمل سے کہا۔ ''آئندہ ہر وقت اسے لوڈ رکھو، کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے---''

''جی بہتر، سیٹھ سائیں---!'' غنی کی جان میں جان آئی۔ ''آئندہ شکایت نہیں ہوگی---''

''آؤ چلیں---'' شرافت علی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''قہوہ پیتے ہیں، لطف ادھورا رہ گیا---''

O

ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ملازم نے تازہ خوشبودار قہوہ تیار کر کے ہمارے آگے رکھ دیا مگر دوسرے ہی لمحے ملازم فون سیٹ اٹھائے اندر آ گیا۔

''سیٹھ سائیں، آپ کا فون---''

شرافت علی میز کی مرکزی کرسی پر بیٹھا تھا، میں اس کے دائیں طرف تھا، ہم دونوں کے درمیان صرف ایک کرسی جتنا فاصلہ تھا اور فون پر ہونے والی گفتگو آسانی سے سنی جا سکتی تھی۔

''ہیلو---''

شرافت علی نے ریسیور لیتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات یکلخت بدل گئے، شفاف پیشانی پر ایک جلالی شکن نمودار ہوئی۔

''میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا''۔ اس نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں جاننے کا شوق تھا تو بھاگے کیوں، ٹھہر جاتے۔ میرے نشانچیوں کے بھی ارمان پورے ہو جاتے--- بہرحال، تم سے ٹوٹ پھوٹ کی رقم وصول کی جائے گی---''

یہ کہہ کر اس نے حقارت سے ریسیور کریڈل میں پٹخ دیا۔

''کون تھا---؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''حملہ آور---'' اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ ''وہ ایک مفرور ملزم کی تلاش میں آئے تھے، فائرنگ کا مقصد اپنی آمد سے ہمیں مطلع کرنا تھا جو انہوں نے کر دیا''۔

''آپ نے اب تک پولیس کو مطلع نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس---؟'' شرافت علی اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ''پولیس کو خود اطلاع دینے کی بابت سوچ رہا ہوں لیکن رپٹ درج نہیں کراؤں گا''۔

''کیوں---؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

شرافت علی مسکرایا۔ ''میرا اپنا ایک اسٹائل ہے، میں معاملات کو سطحی نظر سے دیکھ کر فیصلے نہیں کرتا---''

اپنی طرف سے اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی مگر میرا تجسس ابھی برقرار تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ رپٹ درج نہ کرانے میں کیا مصلحت ہے اور پولیس کو مطلع کرنے کی کیا منطق ہے؟--- فیکے کے آنے تک میں گل بہار کے فلیٹ میں صمد خاں کا آدمی تھا، میری حفاظت اور میرے جملہ اخراجات اس کے ذمہ تھے مگر گل بہار کے ساتھ وہاں سے فرار ہو کر اژن سانپ کے گروہ کو بھی اپنا کھلا دشمن بنا لیا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ صمد خاں ایسا نہیں کر سکتا کہ اپنے آدمیوں سے اس گھر پر فائرنگ کروائے جہاں مَیں نے پناہ لے رکھی ہو، اس واقعے کے پیچھے صمد خاں نہیں ہو سکتا--- پھر کون ہو سکتا ہے؟ یہ خیال بار بار میرے ذہن میں چکر لگا رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر گل بہار بھی اوپر میرے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت شرافت علی میرے پاس بیٹھا بڑے پُرسکون اور مطمئن انداز میں مجھے آرام سے، بے فکر ہو کر سو جانے کی تاکید کر رہا تھا گل بہار کو دیکھ کر وہ ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''بہت اچھا کیا آپ نے کہ اوپر چلی آئیں، میں خود آپ کو بلانے والا تھا--- آئیں اور اپنے شوہر کو سمجھائیں''۔ یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا نیچے چلا گیا۔

''میں سمجھانے نہیں آئی ہوں---'' گل بہار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کمرے میں سونے آئی ہوں---''

''مگر تم نے تو اسے مشروط کر دیا تھا---'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''صرف ایک ہی فائرنگ نے فیصلہ بدل دیا؟''

''ہاں---'' وہ کُچھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم اسے میری مجبوری سمجھو یا کمزوری کہ اس واقعے کے بعد میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ اب میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے۔ تم مجھے دھتکار دو یا دھوکہ دو، میں بہر حال تمہیں چھوڑ نہیں سکتی--- کبھی نہیں''۔

یہ کہتے کہتے وہ اٹھی اور دونوں بازو پھیلا کر مجھ سے لپٹ گئی--- اس رات میں نے اس کے اور اپنے درمیان ایک بڑا سا تکیہ رکھ کر ایک طرح سے دیوار کھینچ دی۔

''گل بہار---!'' میں نے اس کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ جب تک ہمارا نکاح نہیں ہو جاتا تم اس کمرے میں سونے کیلئے نہیں آؤ گی اور تم آ گئیں۔ اب میں نے علامتی انداز میں ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ جب تک ہمارا شرعی

اور قانونی تعلق قائم نہیں ہو جاتا، میں اس فاصلے کو ختم نہیں کروں گا۔ یہ دیوار قائم رہے گی اور تم اسے قائم رکھنے میں میری مدد کرو گی۔۔۔"

جواب میں وہ کچھ بولی نہیں لیکن رات بھیگنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ عورت اوپر سے خواہ کتنی مضبوط، کتنی مستحکم کیوں نہ دکھائی دے وہ اندر سے کمزور ہوتی ہے چاہے وہ گل بہار جیسی مرد مار عورت ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ رات کے جانے کس لمحے میری آنکھ کھل گئی تو وہ میرے پاؤں کے تلوؤں سے اپنے گال لگائے بیڈ پر آڑھی ترچھی سو رہی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹنے چاہے مگر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے پیروں پر رکھ دیئے۔

"تم نہیں جانتے رحیم بخش۔۔۔!" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "عورت کوئی بھی ہو، کیسی بھی ہو مگر اس کے اندر سے پاکیزگی اور محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہی عورت کی پہچان اور اس کا اصلی زیور ہے۔ ہم جیسی بدنصیب عورتوں کی مثال ان قیمتی موتیوں جیسی ہوتی ہے جو کیچڑ یا گندگی میں گر پڑیں تو گہنائے ہوئے لگتے ہیں لیکن جو شخص ان کی قدر و قیمت پہچان کر، انہیں دھو یا مانجھ کر چمکا دے، محفوظ جگہ رکھ دے تو دنیا بدل جاتی ہے۔ پھر ہم جیسی عورتوں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں لیکن مردوں کے اس سماج میں عورت کا احترام ابھی تک دلوں میں پیدا نہیں ہوا، مرد کی ہوس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ قدم قدم پر مرد کے نام کی تہمت اوڑھے ہوئے بھیڑیے عورت کے تعاقب میں ہیں۔ اس غیر محفوظ اور غیر یقینی ماحول میں اگر میری جیسی گندی عورت بھی گھٹن اور بیزاری محسوس کرتی ہے اور ایک گھر، ایک آنگن کی آرزو کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی عورت میں حیا، شرم، وفا اور ایمانداری باقی ہے لیکن اس چراغ کو تمہاری مضبوط ہتھیلیوں کی پناہ کی ضرورت ہے۔ مجھے اس دنیا کے طوفانی تھپیڑوں سے بچا لو رحیم بخش! مجھے ان ہواؤں میں بجھنے سے بچا لو۔ میں تمہاری مضبوط ہتھیلیوں کی پناہ چاہتی ہوں۔۔۔ مجھے بجھنے مت دو رحیم بخش! میں بجھ گئی تو خدا کی قسم، عورت کا اعتماد مٹ جائے گا اور نسوانیت کی لاج مٹ جائے گی اس نیک آرزو کا خواب کرچی کرچی ہو جائے گا"۔

اس نے مضبوطی سے میرے پاؤں تھام لیے، آنسو اس کی آنکھوں سے ساون کے بادلوں کی طرح برس رہے تھے، میرے پاؤں کے تلوے اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے اور وہ بے آواز جھٹکوں سے رو رہی تھی، کوئی ہچکی، کوئی سسکی، کوئی چیخ نہیں آنسو تھے کہ بھل بھل بہتے جا رہے تھے جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔۔۔ یکا یک میرے اندر کا سچا، کھرا اور مخلص دیہاتی نبی بخش جنگی چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ایک عورت اپنے گناہوں کے تمام تر اعتراف اور عجز کے ساتھ میری پناہ چاہتی تھی۔ اس نے جرائم کی گناہ آلود زندگی کو ترک کر کے ایک عام سے آدمی کو اپنی زندگی کی منزل بنا لیا تھا، اب اسے تحفظ فراہم کرنا میری ذمہ داری تھی۔۔۔ میں نے اس کا سر اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"دیکھو، گل بہار۔۔۔!" میں نے گمبھیر لہجے کہا۔ "میں تمہارا پورا ماضی اچھی طرح نہیں جانتا اور نہ ہی جاننا چاہتا ہوں۔ جو کچھ تم نے بتایا تھا، میں نے خاموشی سے سن لیا تھا۔ میں نے اپنے بارے میں جو الٹی سیدھی باتیں تمہیں بتائی تھیں وہ شاید تم نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی تھیں، شاید سنی ہی نہیں تھیں یا شاید سن لی تھیں۔ مجھے بھی کچھ یاد نہیں کہ میں نے تمہیں اپنے بارے میں کیا بتایا البتہ آج بتانا چاہتا ہوں"۔ یہ کہہ کر میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اس نے خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "گل بہار۔۔۔!" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام رحیم بخش نہیں، نبی بخش جنگی ہے اور میں گوٹھ صادق علی کے وڈیرا جلال دین کا خاندانی ملازم ہوں اور چند واقعات کی وجہ سے

عتاب کا شکار ہو چکا ہوں۔۔۔"

"میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔۔۔" گل بہار نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔ "جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ تم میرے لیے نبی بخش جنگی نہیں، رحیم بخش ہو۔۔۔ تھے اور رہو گے۔۔۔ صبح ہم دونوں کو اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرافت علی کو صاف بتا دینا چاہیے کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں اور اگر وہ ہمیں دوست رکھنا چاہتا ہے تو فوری طور پر ہمارے نکاح کا بندوبست کر دے"۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ جیسا تم کہتی ہو، ویسا ہی کریں گے"۔ میں نے مدافعت ختم کر دی۔

O

صبح ناشتہ ہم دونوں نے اوپری منزل کے ڈائننگ روم میں شرافت علی کے ساتھ کیا۔ ناشتے کے دوران جتنی دیر مستعد ملازم ہمارے اردگرد رہے، ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور جیسے ہی ناشتے کے برتن سمیٹ کر ملازموں نے چائے رکھی، میں نے شرافت علی کے قریب کرسی کھینچ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"کچھ باتیں آپ سے کرنی ہیں، بہت ضروری۔۔۔"

"ضرور بابا۔ ضرور۔۔۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "یہیں یا کہیں اور۔۔۔؟"

"جیسے جی چاہے۔۔۔"

میں نے ملازموں کی طرف دیکھا تو شرافت علی نے آنکھ کے اشارے سے انہیں آناً فاناً چلتا کیا۔ گل بہار نئی نویلی لڑکیوں کی طرح اپنی کرسی پر بیٹھی کسمسا رہی تھی۔

"ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔" میں نے لمبی چوڑی تمہید میں پڑے بغیر براہِ راست کہا۔ "اور فوری طور پر نکاح کرنا چاہتے ہیں"۔

شرافت علی نے مسکرا کر سر ہلایا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ "مجھے اندازہ تھا۔۔۔"

"کیسے۔۔۔؟" بے ساختہ گل بہار نے پوچھا۔

"ہو جاتا ہے اندازہ۔۔۔" شرافت علی اسی انداز سے بولا۔ "اصلی میاں بیوی کی حرکات و سکنات غیر شادی شدہ جوڑوں سے بہت الگ اور مختلف ہوتی ہیں۔۔۔ بہرحال فوری نکاح کی ضرورت میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔۔۔؟"

"ہے ضرورت۔۔۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" شرافت علی نے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہو جائے گا انتظام ابھی مجھے ذرا پولیس کے کچھ افسروں سے ملنا ہے، کچھ انتظامیہ کے آدمیوں سے ملنا ہے اور پھر رات والے حملہ آوروں کے ذرا مزاج درست کرنے ہیں۔ اس کے بعد شام کو ملاقات ہو گی۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گل بہار سے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"گل بہار! نکاح کے بعد میں تمہیں لے کر گوٹھ صادق علی جانا چاہتا ہوں۔۔۔ چلو گی؟"

''کیوں نہیں چلوں گی ---؟'' وہ آنکھیں موند کر بولی۔ ''شاعر لوگ کہتے ہیں کہ جو تیری ڈگر، وہ میری ڈگر اور جو تیرا نگر، وہ میرا نگر، جو تیری گلی، وہ میری گلی ---''

مجھے شاہ لطیف بھٹائی m کا ایک دوہڑا یاد آیا جس میں وہ رانجھن کی گلی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی گلی مجھے ساری گلیو ں سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ اس کے در و بام میں اس کی خوشبو رچی ہوئی ہے --- ہم خاصی دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتے رہے پھر یکا یک مجھے ملازموں کے بھاگنے، دوڑنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں بلند ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں، میں نے باتیں کرتے کرتے کان نیچے کی آوازوں کی طرف لگا دیے، گل بہار بھی چپ ہو کر سن گن لینے لگی۔ دوسرے ہی لمحے ایک ملازم بھاگتا ہوا اوپر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور چہرہ غیض و غضب سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ اونچے لہجے میں بولا۔

''سیٹھ سائیں کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اس وقت وہ ہسپتال میں ہیں۔ آپ کیلئے بولا ہے کہ گھر پر ٹھہریں اور ان کے فون کا انتظار کریں ---''

یہ کہہ کر وہ جانے کیلئے مڑا --- میں اور گل بہار یہ خبر سن کر بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے --- شرافت علی ہمارا محسن تھا۔ اس نے ہمیں پناہ دی تھی اور ہماری ہی وجہ سے اس کی کوٹھی پر فائرنگ ہوئی تھی۔ ہم اسے کسی مشکل میں تنہا کیسے چھوڑ سکتے تھے؟

''ٹھہرو ---'' میں نے ملازم کو روک لیا۔ ''ہمیں ہسپتال بتاؤ --- کون سا ہسپتال اور کون سا وارڈ ہے ---؟''

گل بہار اتنے میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر زنان خانے میں جا چکی تھی --- ملازم کو ہسپتال کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا نیچے چلا گیا۔ پھر گل بہار تیزی سے اوپر آئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''خدا کا شکر ہے ---'' وہ اندر آ کر بولی۔ ''کچھ زیادہ خطرناک بات نہیں ہے، معمولی ایکسیڈنٹ تھا۔ شرافت علی اور ڈرائیور بچ گئے ہیں --- بیگم شرافت علی بڑی گاڑی نکلوا رہی ہیں، ہم سب انہیں دیکھنے جائیں گے ---''

''لیکن شرافت علی نے تو گھر پر ٹھہرنے اور فون کا انتظار کرنے کی تاکید کہلوائی ہے ---''

گل بہار نے بات کاٹ دی۔ ''ہم قطعاً انتظار نہیں کریں گے --- ہمارا محسن ہسپتال میں ہے اور ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کے پاس پہنچیں جتنی جلد ممکن ہو --- آؤ نیچے، میرے ساتھ ---''

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ زینے اترنے لگی۔ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے لباس کے اوپر ایک بڑی سی ایرانی چادر لی تھی اور اس سے نصف چہرہ چھپا لیا تھا۔ بیگم شرافت بھی ایک بڑی سفید ریشمی چادر میں سر سے پاؤں تک ملفوف تھی۔ وہ ایک قد آور خاتون تھی اور اس کی پیشانی دور سے چمک رہی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی والی سیٹ پر بندوق بردار ملازم کے پاس مجھے جگہ ملی، خواتین اور دوسرا مسلح ملازم پیچھے بیٹھ گئے۔ یہ سیاہ رنگ کی چمکدار پجارو تھی۔ گاڑی تیزی سے کوٹھیوں کے علاقے سے نکلی اور فراٹے بھرتی ہوئی شہر کے ٹریفک کے ریلے میں داخل ہو گئی۔ کمرے سے نکلتے وقت گل بہار نے ایک پیلی کیپ میرے سر پر رکھ دی تھی اور میں نے اٹھتے اٹھتے شلوار قمیض اور واسکٹ پر ایک چادر ڈال لی تھی، اس طرح مجھے فوری طور پر پہچاننا

مشکل تھا۔ ریوالور میری جیب میں تھا۔۔۔ ہم ایک دو منزلہ پرائیویٹ ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں پہنچے۔ کمرے کے بالائی حصے میں شرافت علی کے دو ملازم اور کچھ دوست بیٹھے تھے، اندر ڈاکٹر اسے چیک کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر شرافت علی مسکرایا، وہی مخصوص دلکش اور تیکھا انداز۔۔۔ بیگم شرافت آگے بڑھ کر اس سے باتیں کرنے لگی اور ہم کچھ فاصلے پر پیچھے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک اپنی بیگم سے باتیں کرنے کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہوا تو اس کی بیگم کونے کے ایک پارٹیشن کی طرف چلی گئی۔

''آؤ بیٹھو۔۔۔'' اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بس تمہیں فون کرنے ہی والا تھا لیکن تم نے آنے میں جلدی کی۔۔۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں بابا بھلا چنگا ہوں بس تھوڑی سی رگڑ ہے، خراشیں آئی ہیں۔۔۔ شکر ہے، ڈرائیور کی عقل مندی نے ہمیں بچا لیا ورنہ ٹرک نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔۔۔''

''ہوا کیا تھا؟'' میں نے اس کے بیڈ کے سرہانے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

''میں پولیس ہیڈ کوارٹرز سے ہو کر اپنی فرم جانے کے لئے جونہی بڑی سڑک پر پہنچا، ایک سرخ کار ہمیں اوورٹیک کرتی ہوئی ٹریفک کے رش میں غائب ہو گئی۔ اپنی فرم کے دفتر پہنچنے کے لئے ڈرائیور نے دو بلاک طے کئے تھے کہ مخالف سمت سے اچانک ایک تیز رفتار خالی ٹرک نمودار ہوا، یہ ون وے تھا اور مخالف سمت سے ٹرک یا کسی بھی گاڑی کے آنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم ساٹھ ستر کی اسپیڈ پر تھے لیکن ٹرک آندھی طوفان کی طرح ہم پر چڑھا آ رہا تھا۔ اگر ہمارے ڈرائیور نے فوری پر ٹرک سے بچنے کیلئے گاڑی کو بائیں طرف موڑ کے ایک گلی کی سیڑھیوں پر نہ ڈال دیا ہوتا تو ہمارے پرخچے اڑ جاتے۔۔۔'' شرافت علی نے ٹھہر ٹھہر کے ہمیں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ''بہر حال۔۔۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''سرخ کار اب جہاں بھی ہو گی، ہم سے بچ نہیں سکتی۔۔۔ بس تم اب چلو، میں تھوڑی دیر میں بیگم کے ساتھ پہنچ رہا ہوں''۔

''اکٹھے ہی کیوں نہ چلیں۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔'' شرافت علی نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ آفیسر یہاں پہنچ رہے ہیں، ان سے مجھے ہسپتال کے اسی کمرے میں ملنا ہے۔۔۔ ڈرائیور اور ایک گن مین تم لوگوں کو چھوڑنے جائے گا۔۔۔''

میں اور گل بہار گن مین کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نیچے اترے۔ ابھی ہم کوریڈور میں داخل ہوئے تھے کہ ایک لمبے قد کا گنجے سر والا تیز رفتار شخص ہم سے ٹکرا گیا۔

''معاف کرنا۔۔۔'' وہ سنبھل کر بغور ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرا بھائی ایمرجنسی وارڈ میں ہے اسی لیے میں اس وقت۔۔۔''

''کوئی بات نہیں۔۔۔'' میں نے گل بہار کا بازو پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہو جاتا ہے ایسا۔۔۔''

وہ مڑ مڑ کر ہمیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تو گن مین نے گھوم کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ایک سفید ٹویوٹا کرولا کی پچھلی نشست پر ہم دونوں بیٹھ گئے، گن مین نے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھالی اور گاڑی چل پڑی۔ جیسے ہی ہم ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر آئے ایک موٹر سائیکل

سوار ہمارے پیچھے لگ گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ تنہا نہیں تھا، ایک اور شخص اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ وہ گھوم کر اس کھڑکی کی طرف آئے جہاں گل بہار بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں موٹر سائیکل سواروں کے چہرے ہلمٹ میں گردن تک چھپے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن پتہ نہیں کیوں میری چھٹی حس نے شدید خطرے کا احساس دلایا۔ میں نے فوری طور پر گل بہار کے سر پر ہاتھ کا دباؤ دے کر اسے نیچے جھکایا، خود بھی نیچے جھک کر چیخا۔

''ڈرائیور — ہوشیار —!''

O

بروقت انتباہ نے ڈرائیور اور گن مین کو چوکنا کر دیا، ڈرائیور نے فوراً بریک لگائی اور گن مین چھلانگ لگا کر باہر نکل آیا۔ موٹر سائیکل سوار گھوم کر دائیں طرف سے آگے نکل گیا لیکن پھرتی سے گھوم کر پوری رفتار سے واپس آیا، صاف ظاہر تھا کہ وہ گن مین سے موٹر سائیکل ٹکرا دینا چاہتا ہے لیکن کیوں؟ — ابھی میرا ذہن اس کیوں میں الجھا ہوا تھا کہ موٹر سائیکل تیزی سے آگے آئی۔ اسی وقت گن مین نے پلٹ کر فائر کھول دیا لیکن سب گولیاں زمین پر لگیں، موٹر سائیکل سوار بالکل محفوظ رہے۔ انہوں نے کچھ فاصلے پر پہنچ کر موٹر سائیکل کو ایک لمحے کے لیے روکا اور پھر تیزی سے آگے آئے۔ اب پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے جیبوں سے ہاتھ نکال لیے تھے۔ ماؤزر اس کے ہاتھ میں تھا، پے در پے اس نے کئی فائر کیے۔ یہ فائر اس نے گن مین کی ٹانگوں اور بازوؤں پر کیے تھے، گن مین چیخ مار کر خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ ڈرائیور اس تمام عرصے میں تذبذب کا شکار رہا۔ وہ گاڑی گھما کر سائیڈ سے موٹر سائیکل سوار کو ٹکر مار سکتا تھا، گاڑی بھگا کر آگے لے جا سکتا تھا لیکن یہ سب کچھ اچانک ہوا تھا اور وہ ہکا بکا رہ گیا۔ جیسے ہی گن مین سڑک پر گرا، ڈرائیور یکا یک ہوش میں آ گیا اور پوری ہوشمندی سے اس نے گاڑی ریورس کی۔ ہسپتال کے ایمرجنسی گیٹ پر ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ اس واردات کے وقت وہ تیزی سے حرکت میں آئی، دو پولیس والے بندوقیں سنبھال کر باہر نکل آئے۔ موٹر سائیکل سواروں کو اس مداخلت کی توقع نہیں تھی، وہ گھبرائے میں آ کر بوکھلا گئے اور اندھا دھند گولیا برسانے لگے۔ میں گل بہار پر جھک گیا تھا لیکن اس کے باوجود اندھی گولیوں نے اس کا سراغ لگا لیا، دو دھماکے ہوئے اور ایک دلدوز چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ یہ ایسی کربناک، ایسی اذیت ناک چیخ تھی کہ میرا رواں رواں لرز گیا۔ ایک گولی اس کے دائیں پہلو میں لگی تھی دوسری کندھے پر، خون کا ایک فوارہ اس کے جسم سے پھوٹ پڑا۔ میں نے دونوں بازوؤں میں اسے سمیٹ لیا۔ اس کا چہرہ دم نزع کی اذیت کی مکمل تصویر بنا ہوا تھا۔

''ہسپتال — ہسپتال —'' میں گلا پھاڑ کر چلایا۔ ''خدا کیلئے گاڑی موڑ کر کمپاؤنڈ کے اندر چلو — فوراً —''

موٹر سائیکل سوار کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح پولیس کو جُل دے کر نکل جائے لیکن موبائل اسکواڈ کے چاق و چوبند جوانوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر موٹر سائیکل سوار نے تیزی سے ایک ٹھیلے والے کو ٹکر ماری، ٹھیلا ایک طرف ہونے سے جو راستہ بنا اس پر اس نے موٹر سائیکل کو ریس دے دی۔ وہ ہر صورت میں موقع سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کا پیچھے بیٹھا ہوا ساتھی ماؤزر لوڈ کرتے کرتے دو ایک بار ڈگمگایا، جھول کر گرنے لگا لیکن پھر سنبھل گیا۔ وہ اپنی حرکات و سکنات سے ایسے افراد نظر آتے تھے جنہیں ہر حال میں جان پر کھیل کر اپنا ٹارگٹ پورا کرنے کی

تربیت دی جاتی ہے۔ پولیس کا ایک جوان اچھل کر گاڑی کی طرف آ گیا۔ گل بہار کی طرف کا دروازہ پھرتی سے کھول کر اس نے مجھے اور زخمی گل بہار کو مدد دی۔ پھر چوکس ہو کر بندوق سنبھال لی۔ میں نے تیزی سے جھک کر بڑی مشکل سے گل بہار کو اٹھایا۔ اس کے زخموں سے خون بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا جس نے اس کا لباس رنگین کر دیا تھا۔ میں اسے اٹھا کر تیزی سے ایمرجنسی گیٹ کی طرف بھاگا اور اسی لمحے یکا یک ایک دھماکہ اور ہوا۔ اب کے مجھے گولی ماری گئی تھی، درد کی ایک تیز چبھتی ہوئی لہر میرے پیٹ سے اٹھی جیسے کسی نے بارود میرے پیٹ میں رکھ کر اسے آگ دکھا دی ہو۔ میں گل بہار کو سنبھالے بے ساختہ گیٹ کے اندر گر پڑا۔ عین اسی لمحے میں نے آواز سنی۔

''ماردو ..... '' کسی نے چیخ کر کہا۔ ''اُڑا دو ..... ''

دوسرے ہی لمحے فضا پے در پے دھماکوں اور چیخوں سے گونج اٹھی، کئی گولیاں ہمارے قریب سے گزر کر آہنی گیٹ کی جالیوں پر پڑیں۔

''نہیں — نہیں — ''

گل بہار کی چیختی، ڈوبتی، سسکتی آواز اُبھری۔ یہ آخری آواز تھی جو میں نے سنی، پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا — ہر طرف اندھیرا تھا — گہرا، گاڑھا اور دم گھونٹ دینے والا اندھیرا اور میرے پیٹ میں شعلے بھڑک رہے تھے، بارود کی بو میری سانسوں میں اترتی جا رہی تھی۔ پھر جیسے میرا دم گھٹنے لگا، میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے منہ کھول دیا لیکن ہوا کہیں بھی نہیں تھی۔ میری روح میرے بے بس جسم کا بھاری لبادہ اتار کر آزاد ہونے کیلئے میرے اندر پھڑپھڑا رہی تھی۔

O

میری روح میرے جسم کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہی تھی اور میری سانسوں میں خون اور بارود کی ملی جلی بو اترتی جا رہی تھی۔ زندگی اور موت میں کشمکش جاری تھی، موت کا پلہ بھاری پڑ رہا تھا اور زندگی ہار رہی تھی، دھند اور بے ہوشی کی ایک چادر تھی جو میرے اعصاب پر پھیلتی جا رہی تھی۔ میری آنکھیں بند ہو چکی تھیں، اردگرد کا سارا شور معدوم ہو چکا تھا۔ پھر میں مکمل طور پر بے سدھ ہو گیا، دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا اور جانے کب تک دھند اور تاریکی کی چادر میرے اعصاب پر پڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اس دبیز چادر کے کنارے سرکنے اور سمٹنے لگے، ہلکی روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ پہلے یہ روشنی گہرے سرخ سیال اندھیروں میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوئی پھر دودھیا سفید روشنی میں بدل گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک سفید چھت اور چھت کے اندر لگی ہوئی چوڑی ٹیوب لائٹس میری آنکھوں کے سامنے تھیں، کئی چہرے مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ میرا جسم باریک اور موٹی تاروں سے بندھا ہوا تھا۔ مجھے خون، گلوکوز اور زندگی بچانے والی دوائیں دی جا چکی تھیں۔ گولی پیٹ میں لگی ضرور تھی لیکن آنتوں میں گھسنے کی بجائے **چھچھلتی** ہوئی پیٹ کی موٹی جلد کو گہرائی سے پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اگر وہ ذرا سی ترچھی ہوتی تو میری زندگی کیلئے بدترین خطرہ بن سکتی تھی۔ بروقت طبی امداد، معمولی سے آپریشن اور خون کی فوری فراہمی کی وجہ سے میری جان بچ گئی تھی — یہ شہر کا ایک مہنگا ہسپتال تھا۔ ڈرائیور اپنی جان بچا کر تیزی سے شرافت علی کے ہسپتال تک پہنچا تھا اور وہاں سے ان کو اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ شرافت علی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے فوری طور پر ایک اسپیشل وارڈ اور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کا بندوبست ہو گیا تھا اور اب شرافت علی مجھ پر جھکا ہوا تھا، اس کے اردگرد اس کے محافظ اور چند معزز دوست کھڑے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

''شکر ہے، بابا—!'' وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''تم زندہ ہو۔ تمہیں زندہ دیکھ کر میں تندرست ہو گیا ہوں، ایک دم فریش ہو گیا ہوں—''

میں چند لمحے تک پلکیں جھپکتا رہا۔ پھر میری خشک زبان میرے خشک ہونٹوں پر گھومی، پہلی بات جو میرے منہ سے نکلی وہ یہ تھی کہ گل بہار کہاں ہے؟— شرافت علی نے تحمل مزاجی سے کہا۔

''اطمینان رکھو، وہ بالکل ٹھیک ہے— اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کے جسم سے گولیاں نکالی جا رہی ہیں''۔

میں نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی تو جسم سے لگی ہوئی پلاسٹک کی ٹیوب تاریں جھنجھنائیں اور کمرے میں موجود ہسپتال کا عملہ گھبرا گیا۔ ایک نرس اور ایک ڈاکٹر نے لپک کر مجھے لٹا دیا۔

''لیٹے رہئے جناب—!'' ڈاکٹر نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''آپ کے یوں اچانک ہلنے سے زخم کے ٹانکے ٹوٹ سکتے ہیں— ابھی دو تین دن تک آپ اسی بیڈ پر آرام کرنا ہے''۔

''نہیں ڈاکٹر—!'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا کیلئے مجھے اٹھنے کی اجازت دو، میں فوری طور پر گل بہار کو دیکھنا چاہتا ہوں''۔

شرافت علی نے میرے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں کہہ رہا ہوں نا، کہ وہ ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو— جیسے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک ہو گی، ہم یہاں سے شفٹ ہونے میں ایک منٹ بھی تاخیر نہیں کریں گے۔ پھر تم جی بھر کے ایک دوسرے کو دیکھنا—''

لیکن میرے دل کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ میں بہر صورت گل بہار سے ملنا چاہتا تھا، فوری طور پر اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی بانہوں میں لے کر یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں اسے زندگی کے اس طویل سفر میں شریکِ سفر بنا کر دلی راحت محسوس کروں گا۔ پہلے وہ شادی کے لئے اصرار کر رہی تھی اور اب میرا دل بے تاب تھا، اب میں اسے جلد از جلد اپنی شریکِ حیات بنانے کا آرزومند تھا۔ ایک خوفناک حملے سے گزر کر، موت کی وادی سے باہر آ کر اب مجھ پر زندگی کی قدر و قیمت پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ اب میں ایک لمحے کی تاخیر بھی اس معاملے میں نہیں چاہتا تھا کہ خدا جانے تاخیر کا ایک بھی لمحہ کیا مصائب پیدا کر سکتا تھا۔ اب میں مزید کسی آزمائش میں پڑے بغیر اسے اپنا لینا چاہتا تھا— شرافت علی میرے اضطراب کو جوشِ جوانی کا ابال سمجھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے پیار سے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''صبر اور حوصلہ، بس انہی دو چیزوں کی تمہیں اس وقت ضرورت ہے اور تیسری کوئی چیز تمہارے ذہن میں نہیں آنی چاہیے۔ تم آرام کرو اور ذہن سے ہر خیال جھٹک دو— اب میں گھر جا رہا ہوں۔ یہاں میرے ملازم تمہاری دیکھ بھال کیلئے موجود ہیں۔ تمہیں دیکھنے کیلئے کل آؤں گا— تمہیں اپنی ضرورت کی ہر چیز اسی کمرے، اسی بیڈ پر مل جائے گی، سرہانے لگی کال بیل دباؤ گے تو میرے ملازم تمہارے پاس پہنچیں گے اور دائیں طرف والی بیل دباؤ گے تو ہسپتال کا ڈیوٹی اسٹاف تمہارے پاس آ جائے گا— اچھا خدا حافظ—!''

اس نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا، میرے گال تھپتھپائے۔ پھر اس کے دوستوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ان کے جانے کے بعد شرافت علی کا ایک چاق و چوبند گن مین اندر آیا۔

''سائیں—!'' اس نے جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں باہر آپ کی خدمت کیلئے بیٹھا ہوں۔ جس وقت کال بیل بجے گی، سیدھا اندر آ جاؤں گا۔ دروازہ باہر سے بند رہے گا، یہ سائیں کا حکم ہے، کوئی چیز چاہئے تو بولو— میرا نام غلام علی ہے''۔

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے بس اتنا بتا دو کہ جو بی بی میرے ساتھ تھی وہ کس حال میں ہے، کس وارڈ میں ہے—؟ بس اس کا پتا کر کے مجھے بتاؤ''۔

غلام علی سر کھجانے لگا۔ پھر بولا۔ ''سائیں! خدا خبر، کہاں ہے۔ میرے کو تو کچھ پتہ نہیں— اور کوئی خدمت ہے تو بولو؟''

''نہیں!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اور کوئی کام نہیں ہے اور جب تک مجھے معلوم نہیں ہوگا، مجھے نیند نہیں آئے گی''۔

غلام علی مؤدب انداز میں سر ہلاتا ہوا الٹے پاؤں باہر نکل گیا— میں نے اس سے کہا تھا کہ جب تک گل بہار کے بارے میں مجھے معلوم نہیں ہوگا، مجھے نیند نہیں آئے گی لیکن مجھے نہ صرف نیند آ گئی بلکہ گہری نیند آ گئی۔ ڈاکٹروں نے رات کو خوراک میں اعصاب کو سکون پہنچانے والی دوائیں بھی شامل کی تھیں جن کے زیر اثر ساری رات سکون سے سوتا رہا۔ درمیان میں ہسپتال کا عملہ وقفے وقفے سے مجھے دیکھنے آتا رہا، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں کئی مرتبہ میرے کانوں میں آئیں لیکن غنودگی اس قدر تھی کہ میں ایک مرتبہ بھی آنکھ کھول کر نہ دیکھ سکا کہ کمرے میں کون آیا اور کون گیا؟— صبح کو خاصی دیر سے میری آنکھ کھلی، دو نرسیں گن مین کے ساتھ میرا ناشتہ لے کر آئی تھیں اور مجھے جگا رہی تھیں۔ میرے اعصاب اگرچہ قدرے پُرسکون تھے لیکن جسم میں اور خاص طور پر پیٹ کے اس حصے میں شدید تکلیف تھی جہاں گولی لگی تھی— گن مین غلام علی نے بتایا کہ

شرافت علی بھی تھوڑی دیر مجھے دیکھنے آئے انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں بے خبر سو رہا ہوں تو وہ ڈاکٹروں سے مل کر واپس چلے گئے۔

''تم نے مجھے جگا لیا ہوتا---'' میں نے غلام علی سے کہا۔

''سائیں! آپ گہری نیند میں تھے---'' غلام علی آہستہ سے بولا۔ ''ڈیوٹی اسٹاف نے مجھے بول دیا تھا کہ جب آپ نیند میں ہوں تو کوئی آپ کو نہ جگائے''۔

نرسوں نے فولڈنگ ٹیبل بیڈ پر فکس کر کے ناشتہ لگانا شروع کیا۔ اس ناشتے میں بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جن کا عام ہسپتال میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً شہد، پنیر، تازہ اور نج جوس، خالص دودھ اور پھل---- مگر ناشتے کی اتنی ڈھیر ساری چیزیں سامنے موجود ہونے کے باوجود میرا جی نہ چاہا کہ کسی بھی چیز کو ہاتھ لگاؤں، ذہن میں صرف گل بہار تھی۔ اس کی خیریت مل جاتی تو پھر میں اطمینان سے کھا پی سکتا تھا--- میں نے ناشتے کی ٹرے کی بجائے غلام علی کے طرف دیکھا۔

''تم نے پتہ نہیں کیا غلام علی؟''

''سائیں---!'' وہ شرمندہ سا ہو کر بولا۔ ''آپ کے کمرے کے دروازے کو چھوڑنے کا مجھے آرڈر نہیں ہے۔ سائیں نے بولا ہے کہ ایک منٹ کیلئے بھی اِدھر اُدھر نہ جاؤں، باتھ روم بھی جانا ہو تو آپ کے کمرے میں آتا ہوں اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرتا ہوں۔''

غلام علی کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے ڈیوٹی نرسوں کو مخاطب کیا۔

''آپ بتا سکتی ہیں کہ جو عورت میرے ساتھ تھی، وہ کس وارڈ میں ہے؟''

دونوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

''سوری سر! ہمیں کچھ نہیں پتا---''

''پتہ تو کریں---'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''پوچھیں تو سہی کسی سے---اچھا، ڈیوٹی ڈاکٹر سے جا کر پوچھیں۔ انہیں تو معلوم ہوگا---''

وہ اثبات میں سر ہلا کر مجھے ناشتے کے لئے مجبور کرنے لگیں۔ طوہاً و کرہاً میں نے تھوڑا سا ناشتہ زہر مار کیا۔ جب وہ برتن سمیٹ کر باہر نکلنے لگیں تو میں نے ایک بار پھر انہیں یاد دلایا کہ ڈیوٹی ڈاکٹر سے پوچھ کر مجھے بتائیں کہ گل بہار کہاں اور کس حال میں ہے لیکن کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود ان میں سے ایک بھی نرس واپس نہیں آئی۔ ان کی جگہ دوسری نرسیں آئیں اور انہوں نے بتایا کہ ان کی ڈیوٹی تبدیل ہوگئی ہے۔ ان سے بھی میں نے گل بہار کی بابت دریافت کیا لیکن انہیں بھی معلوم نہیں تھا--- پورا ایک دن بیت گیا، ایک رات بیت گئی لیکن کچھ معلوم نہیں ہوا۔ دوسرے دن سہ پہر کو البتہ شرافت علی کا چہرہ نظر آیا، وہ خاصا تھکا تھکا دکھائی دے رہا تھا اور پہلی مرتبہ اس کے ہشاش بشاش چہرے پر الجھن کے آثار نظر آ رہے تھے تاہم وہ کوشش کر رہا تھا کہ حسب سابق خوش و خرم مطمئن اور پرسکون دکھائی دے۔

''بس صرف ایک دن اور---'' اس نے میرے کاندھے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ تم میڈیکلی فٹ ہو چکے ہو لیکن ایک اور دن کا آرام اور علاج مزید بہتر ہوگا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آرام سے ایک اور دن گزار لو---''

''مگر مجھے گل بہار کی خبر چاہیے ---'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''میں ہر حال میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور ---'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ایک دن کے بعد، کیونکہ آپریشن کے بعد اس پر غشی سی طاری ہے، وہ آنکھیں نہیں کھول رہی --- پہلے تم خیریت سے گھر آجاؤ پھر ہم اس کے پاس چلیں گے --- ٹھیک؟''

''ٹھیک ---'' میں نے نیم دلی سے کہا۔

گل بہار کی مسلسل بے ہوشی کی خبر نے مجھے پریشان کر دیا تھا، یوں لگا جیسے میرے دل سے درد کی ٹیسیں اُٹھ کر میری رگوں میں پھیل رہی ہوں --- شرافت علی کچھ دیر میرے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سرسری انداز میں میرے سرہانے لگا ہوا چارٹ دیکھا، اس کو الٹ پلٹ کر رپورٹیں پڑھیں اور مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اب تک کی تمام رپورٹیں خدا کی مہربانی سے بالکل ٹھیک ہیں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں، پرسوں تک انشاء اللہ تم تندرست ہو کر واپس آجاؤ گے --- اب میں چلتا ہوں، مجھے گل بہار کے ڈاکٹروں سے بھی ملنا ہے --- تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ ---؟''

''گل بہار کے علاوہ اب مجھے کسی بھی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ---'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''او، کے ---!'' شرافت علی نے گرم جوشی سے رخصتی مصافحہ کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

O

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے، آپ اسے وقتی مجبوریوں یا مصلحتوں کی وجہ سے دبا دیتے ہیں اور اپنی طرف سے اس خواہش کے سر پر زور سے ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر اسے دل کے فرش پر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن وہ خواہش جھکتی نہیں، دبتی نہیں بلکہ پنپتی رہتی ہے، پروان چڑھتی رہتی ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی شاخیں، باریک باریک ٹہنیاں دل کی تہوں میں اترتی چلی جاتی ہیں اور تب ایک دن آپ کا دل بری طرح اس خواہش کی گرفت میں آجاتا ہے کہ آپ چاہیں بھی تو ان باریک باریک ٹہنیوں کو دل کی رگوں سے نہیں نکال پاتے۔ گل بہار کے معاملے میں میرا بھی حال اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ جب اس نے اپنی چاہت، اپنی خواہش اور اپنی تمنا کا اظہار کیا تھا تو میرا ردِ عمل بیزاری کا تھا۔ میں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملانے سے گریز کیا تھا، پتہ نہیں اس میں میری کیا منطق اور کیا مصلحت تھی یا شاید میں جن حالات کے گرداب میں غوطہ زن تھا اس میں کسی ازدواجی ذمہ داری کو سنبھالنے کی گنجائش نہیں تھی، اسی لیے میرا فوری ردِ عمل انکار اور فرار سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن جب موت نے ہم دونوں پر اکٹھے جھپٹا مارا تو رائیگانی کے احساس نے یکا یک میری سوئی ہوئی چاہت کو اُجاگر کر دیا اور گل بہار میری دھڑکنوں میں گونجنے لگی --- ہسپتال میں گزرے ہوئے تین دن اور تین راتیں میرے لیے تین جلتی، سلگتی صدیوں کے برابر تھیں۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھ کر جیسے میرے اعصاب سن ہو کر رہ گئے تھے، دل سے بار بار ایک ہی صدا اُبھرتی تھی --- گل بہار! لیکن گل بہار کہاں اور کس حال میں تھی، یہ خدا کو پتا تھا یا ان ڈاکٹروں کو جو اس کا علاج کر رہے تھے۔

تیسرے دن شام ڈھلے میں شرافت علی کے ساتھ بنگلے میں لوٹ آیا۔ ڈاکٹروں نے کچھ انجکشن اور دوائیں لکھی تھیں جس کے لیے شرافت علی نے ایک میل اٹینڈینٹ کا بندوبست کر لیا تھا۔ واپسی کے سفر میں وہ خاموش تھا۔ گاڑی میں دو مستعد گن مین ہماری حفاظت کیلئے موجود تھے،

ڈرائیور بھی مسلح تھا۔ گاڑی ٹریفک کے ہجوم میں بہتی مختلف سڑکوں سے گزرتی چنبیلی کی جھاڑیوں سے گھرے ہوئے بنگلے میں داخل ہوگئی۔ شرافت علی میرے ساتھ میرے کمرے میں آیا، کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔

''یقیناً تم بار بار گل بہار کے بارے میں پوچھ پوچھ کر تھک چکے ہوگے — بہر حال، کھانے کے بعد ہم دیر تک بیٹھ کر باتیں کریں گے''۔

اس کے جانے کے بعد مجھے یکا یک کمرے میں گہری تنہائی، ویرانی اور سناٹے کا احساس ہوا، اب تک مجھے اس کمرے میں کبھی ایسی تنہائی اور ویرانی کا احساس نہیں ہوا تھا، ان دنوں بھی نہیں جب گل بہار نیچے جا کر سوتی تھی۔ میں نے عقبی کھڑکی کھول کر گہرے گہرے سانس لیے، فضا میں چمپا اور چنبیلی کی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے آکر نیچے ڈائننگ ہال میں کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ میری طبیعت بوجھل تھی، کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن کمرے کی وحشت ناک تنہائی سے وقتی طور پر چھٹکارا پانے کیلئے میں نیچے اُتر آیا۔ ڈائننگ ہال میں بڑی سی میز پر کھانا چن دیا گیا تھا اور شرافت علی اکیلا بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں واش بیسن سے ہاتھ منہ دھو کر تھکے تھکے انداز میں کھانے کی میز پر آ بیٹھا۔ میرے لیے خصوصی طور پر پرہیزی کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں نے اس کے اصرار پر بے دلی سے کھانا شروع کیا مگر پتہ نہیں کیوں، مجھ پر یاسیت طاری تھی۔ ایک عجیب سا اضمحلال تھا جو دل و جان پر طاری تھا، ایک عجیب سی بے کلی اور بے کیفی تھی جو رگوں میں تیرتی پھر رہی تھی — کھانے کے بعد جب ملازم برتن سمیٹنے لگے تو شرافت علی انہیں بالائی منزل پر قہوہ لانے کا حکم دیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم اوپر آئے۔ ہم کرسیاں نکلوا کر ٹیرس پر آ بیٹھے، جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں خوبصورت سی ایک پرچھتی بنی ہوئی تھی جو سنگِ مرمر کے چار خوبصورت ستونوں پر قائم کی گئی تھی، آگے بنگلے کی طویل جھالردار دیوار تھی۔ چاند عین اس دیوار کے اوپر تھا اور اس کے نیچے تاڑ کے پتے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ ملازم نے قہوہ لا کر درمیانی تپائی پر رکھا اور پھر ہمارے لیے قہوہ تیار کرنے لگا۔ ہماری پیالیاں ہمیں پکڑا کر وہ احتراماً تھوڑا سا جھکا اور الٹے قدموں پلٹ گیا۔ ہم دونوں اپنی اپنی پیالیاں لے کر ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے قہوہ پینے لگے، ٹہلتے ٹہلتے شرافت علی نے اپنی پیالی منڈیر پر رکھ دی۔ پھر دونوں ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیئے، زرد اور اداس چاندنی میں اس کا چہرہ سنگِ مرمر کے مجسمے کی طرح خاموش اور پُرسکون تھا۔ چند لمحوں تک وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

''نبی بخش جنگی! میری بات بڑے حوصلے سے سننا، جذباتی نہ ہونا۔ میرے ذہن میں تمہارا جو خاکہ ہے وہ بڑے دل گُردے والے جوان کا خاکہ ہے۔ اس خاکے میں آنسو کی ایک بوند نظر نہیں آنی چاہیے کیونکہ پھر خاکے کی وجاہت اور خوبصورتی ختم ہو جائے گی۔ میں تمہیں بڑا باحوصلہ، باہمت اور مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں —''

مجھے شرافت علی کی اس تمہید سے اُلجھن سی ہونے لگی۔ میں نے پریشانی کے عالم میں سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''آپ کے الفاظ تو میری سمجھ میں آ رہے ہیں لیکن آپ کی بات میری سمجھ نہیں آ رہی ہے — خدا کیلئے کھل کر بتایئے کہ کیا بات ہے، گل بہار کی کیسی طبیعت ہے، ہوش آیا کہ نہیں —؟''

''نہیں —'' شرافت علی کی انگلیاں جیسے میرے کاندھوں میں گڑ گئیں۔ ''افسوس — اسے ہوش نہیں آیا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہمیں چھوڑ گئی۔''

O

نہیں --- نہیں --- ''میں دلدوز انداز میں چیخا۔ زمین، آسمان، پیڑ اور چاند سب کچھ اتھل پتھل ہو کر رہ گئے۔ سب کچھ الٹ پلٹ گیا، سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ میں نے درد سے چٹختی ہوئی کنپٹیوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ میں یہ خبر، یہ منحوس خبر سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ ایک پل کیلئے بھی اس بات کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا، میں تو سمجھتا تھا کہ وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ماہر اور قابل ڈاکٹروں کی زیر نگرانی علاج کے مراحل سے گزر رہی تھی --- یہ کیسے ہو سکتا تھا، یہ کیسے ممکن تھا؟

''نہیں --- نہیں --- نہیں --- ''میں نے اپنا سر دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔''ایسا نہیں ہو سکتا --- خدا کی قسم، ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب جھوٹ ہے --- یہ سب جھوٹ ہے۔''

میں نے عالم دیوانگی میں اس کا گریبان تھام کر اسے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ شرافت علی سر جھکائے خاموشی سے مجھے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر جب اس کا گریبان جھرجھراہٹ کے ساتھ پھٹ گیا تو اس نے آہستگی اور محبت سے میرے دونوں ہاتھ اپنے گریبان سے الگ کر کے اپنے دونوں بازو میرے گلے میں حمائل کر دیے۔ اسی اثناء میں ٹیرس کے نیم تاریک گوشوں میں دو تین گن مین خاموشی سے آ کھڑے ہوئے۔ شرافت علی نے کن اکھیوں سے انہیں ہاتھ کے اشارے سے جانے کا حکم دیا۔

''نبی بخش جنگی --- میرے دوست --- میرے بھائی!'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔''زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ بعض خبریں اتنی بھاری ہوتی ہیں کہ جسم و جان کی پوری قوت لگا کر بھی زبان تک نہیں آ پاتیں، آتی ہیں تو زبان گنگ کر دیتی ہیں۔ اور آدمی کچھ کہنے کے لائق ہی نہیں رہ جاتا۔ میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں مگر یہی کہہ سکتا ہوں میرے بھائی! صبر کرو --- صبر کرو --- ''

یکا یک جیسے میری آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے، میں دھاڑیں مار مار کر رو پڑا۔ زندگی میں کبھی میں اس طرح نہیں رویا تھا۔ اتنی شدت سے کبھی مجھ پر رقت طاری نہیں ہوئی تھی اور پھر گوٹھ صادق علی سے کراچی آنے کے بعد میں جتنے مشکل اور سخت حالات سے دوچار ہوا تھا اس نے نہ صرف جسمانی طور پر مجھے مضبوط بنا دیا تھا بلکہ قلبی اور اعصابی طور پر بھی میں پتھر کا آدمی بن گیا تھا لیکن گل بہار کی موت کی ناگہانی اطلاع نے میرے اعصاب اتھل پتھل کر کے رکھ دیے تھے، برسوں کے رکے ہوئے آنسو یوں پھوٹ بہے تھے جیسے سمندر ابل پڑا ہو۔ اس طرح تو میں اپنے باپ کی موت کی خبر سن کر بھی نہیں رویا تھا، جانے گل بہار کی رحلت کا غم میرے کتنے ہی غموں کو اپنے اندر سمو کر میری ذات کا سب سے بڑا غم بن گیا تھا --- خدا جانے میں کھلی چھت پر زرد اداس چاندنی میں شرافت علی کے پاس بیٹھا کتنی دیر تک زار و قطار روتا رہا۔ چاند کی زرد ٹکیا میرے آنسوؤں میں گھل گئی، میری زبان میرے آنسوؤں کے نمکین ذائقے سے تر ہو گئی۔ شرافت علی میرے کندھے اور گال تھپکتا رہا، مجھے صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کرتا رہا لیکن اب صبر کہاں تھا میرے پاس، اب میرے پاس حوصلہ کہاں تھا؟ --- ایک راہ سے بھٹکی ہوئی عورت میری قربت میں راہ راست پر آ رہی تھی۔ اپنا ماضی بھول کر میری بانہوں میں آ کر، قانون اور مذہب کی پناہوں میں آنا چاہتی ہوں لیکن ظالموں نے اسے مجھ سے چھین لیا۔

''کون تھے وہ ظالم --- ؟'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال سے وہ گل بہار کو مارنا نہیں چاہتے تھے --- ''شرافت علی نے سوچتے ہوئے کہا۔''وہ اسے اغوا کرنا چاہتے تھے مگر وہ آخری

لمحے تک اپنا دفاع اور جدوجہد کرتی رہی، جھنجھلا کرانہوں نے اسے گولی مار دی کیونکہ موقع پر موجود عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق حملہ آوروں میں سے کسی ایک نے بھی تم پر توجہ نہیں دی، ان کا واحد ٹارگٹ گل بہار تھی۔ وہ دو موٹر سوار تھے اور تعداد میں چار تھے، سب کے سب مسلح تھے اور بڑی دیر سے ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں موجود تھے۔ میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ ان میں سے دو اشخاص تم لوگوں کے پیچھے بھی آئے تھے، ایک شخص نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر جیب سے کوئی تصویر نکال کر تم لوگوں سے اس کا موازنہ اس انداز میں کیا تھا کہ میرے آدمی اسے گرفت میں نہ لے سکیں۔ یہ اطلاعات مجھے بھی مل گئی تھیں کہ کچھ مشکوک افراد نیچے کمپاؤنڈ میں موجود ہیں اور میں نے اپنا ایک آدمی ان کی نگرانی کے لئے بھی مقرر کیا تھا لیکن وہ واپس نہیں آیا اور اب تک اس کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ بہرحال—" وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "مجھے شبہ سا ہے کہ حملہ آور صرف ایک گروہ کے افراد نہیں تھے، یہ مختلف گروہ کے افراد تھے اور تم دونوں الگ الگ ان کا ٹارگٹ تھے۔ خدا نے تمہیں بچا لیا لیکن گل بہار ان کی بہیمیت کی بھینٹ چڑھ گئی— یقین جانو، جب تم دونوں میرے کمرے سے نکل کر باہر گئے تو میں اسی وقت سوچ رہا تھا اور بعد میں اس کا اظہار میں نے اپنی بیگم سے بھی کیا کہ ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی نکاح خواں کو اپنے ساتھ لے کر تم دونوں کے پاس آؤں گا۔ میں نے سوچا تھا کہ بنگلے پر تمہارے ولیمہ کی شاندار دعوت کا اہتمام کروں گا—"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پہلی بار اس کی آنکھوں میں مجھے آنسو نظر آئے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ سمندر کی طرح گہرا آدمی ہے، جن باتوں پر عام لوگ چیخ مار کر رو پڑتے ہیں اس کا ذرا سا بھی اثر اس پر نہیں ہوتا لیکن میرے دکھ کی شدت نے اس کی آنکھیں بھی نم کر دی تھیں۔ اس نے یہ بتا کر مجھے ایک بار پھر زار و قطار رونے پر مجبور کر دیا کہ گل بہار کو فوری طور پر ایمرجنسی وارڈ میں اٹھا کر لایا گیا تو اس نے انتہائی تکلیف اور اذیت کے باوجود خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مسلسل میرا نام پکارا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے تک اس کے ہونٹوں پر میرا نام تھا۔ یہ بتاتے بتاتے وہ پھر رو پڑا۔

○

اس رات میرے اصرار پر اس نے میرا کمرہ تبدیل کر دیا۔ مجھے اپنے کمرے سے وحشت ہو رہی تھی اور وہاں جا کر سونا تو درکنار، میں وہاں جا کر چند لمحوں کے لئے بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ کمرہ چھت کے انتہائی مشرقی گوشے میں تھا وہ خاصا کشادہ، ہوادار اور پُرسکون تھا۔ شرافت علی نے دو تین دن کیلئے اپنا بیڈ بھی اسی کمرے میں لگوالیا۔ وہ میری ذہنی کیفیت دیکھ چکا تھا اور مجھے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ رات میری زندگی کی بدترین رات تھی۔ تنہا، ویران، ہولناک، سنسان اور سناٹوں سے بھری ہوئی رات!۔۔۔ رات کے کھانے کے بعد قہوہ پینے کے دوران جس کربناک حقیقت کا مجھ پر انکشاف ہوا تھا اس نے مجھ سے میرا سکون، میرا چین اور میرا قرار چھین لیا تھا۔ نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا لیکن کمرے میں شرافت علی کی موجودگی کے باوجود باتیں کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ شرافت علی ایک موٹی سی کتاب لے کر مدھم روشنی اور پھولدار شیڈ والے ٹیبل لیمپ کے قریب بچھے ہوئے آرام دہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے اصرار کر کے نیند کی گولیاں کھلا کر اور دودھ کا ایک بڑا گلاس پلا کر اس نے بیڈ پر لٹا دیا تھا لیکن خواب آور گولیوں کے باوجود مجھے نیند نہ آئی۔ میری پلکیں جلتی رہیں، کنپٹیاں سلگتی رہیں، آنکھوں میں آنسو اُمڈتے رہے اور گل بہار کی ایک ایک بات یاد آتی رہی۔ اس کا چلنا، پھرنا، باتیں کرنا، ہنسنا، روٹھنا، مسکرانا گردن گھما کے والہانہ چاہت سے مجھے دیکھنا اور پھر اس رات اس کے الفاظ جب اس نے میرے شانے پر ٹھوڑی رکھ کر بڑے دکھ، بڑے چاؤ سے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اپنی بیوی نہیں بنانا چاہتے کیونکہ میں جیسی عورت ہوں اس کو زندگی بھر کے لیے کوئی مرد اپنے دل کا روگ نہیں بنا سکتا۔ سب وقتی طور پر دل بہلاوے کی باتیں کر کے غائب ہو جاتے ہیں، زندگی بھر نبھانے کی سکت کسی میں نہیں لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے تم ایسے آدمی نہیں ہو۔ تم میری تمام آلودگیوں کے باوجود مجھے اپنا لو گے، مجھے در بدر کی ٹھوکروں سے بچا لو گے۔۔۔ خدا کی قسم! میں کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں جا کر کھلے آسمان کے نیچے، گارے مٹی کے چولہے پر تمہارے لیے روٹی پکانے میں خوشی محسوس کروں گی۔ میں تمہاری میلی جرابیں دھونے اور بوٹ پالش کرنے میں فخر محسوس کروں گی کیونکہ اب میں اپنی اس بے مقصد اور بیہودہ زندگی سے تنگ آ چکی ہوں، تھک چکی ہوں۔۔۔ اس سے پہلے کہ زمین مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لے، تم مجھے سنبھالو۔ مجھے مزید بھٹکنے، مزید تباہ ہونے سے بچا لو۔۔۔''

لیکن اس کی التجائیں، اس کی آہیں اور میرے آنسو اسے بچا نہیں سکے، موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے ہمیشہ کیلئے ان تمام آلام و مصائب سے نجات دلا دی جن سے اس کی زندگی بھری پڑی تھی اور جو مصائب آنے والے تھے ان سے بھی وہ محفوظ ہو گئی تھی۔۔۔ میں شرافت علی سے مسلسل اصرار کرتا رہا کہ وہ مجھے اس کی قبر پر لے کر چلے۔ میں وہاں بیٹھ کے، جی کھول کر رونا چاہتا تھا، اس مٹی کو اپنے آنسوؤں سے بھگونا چاہتا تھا جس میں گل بہار دفن تھی لیکن شرافت علی مجھے صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کرتا رہا۔

''ہم اس کی قبر پر بھی جائیں گے۔۔۔'' وہ مجھے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ابھی نہیں۔۔۔ جانے والی چلی گئی ہے اور ہم پر بڑا قرض چھوڑ کر گئی ہے۔ پہلے مجھے اس کے اور تمہارے قرض چکانے ہیں''۔

''لیکن میرا تو کوئی قرض نہیں آپ پر۔۔۔'' میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بہت قرض ہے''۔ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میرے بھائی، نبی بخش جنگی!۔۔۔ یہاں بہت بوجھ ہے، اسے ہلکا ہونا اور اس طرح

ہونا ہے کہ تمہارے والد اور گل بہار کی روحوں کو سکون ملے۔ جب تک ان کی روحوں کو سکون نہیں ملے گا میں خود کو مجرم سمجھتا رہوں گا۔۔۔ کل سارا دن تم آرام کرو گے، پرسوں تمہاری ملاقات ایک اہم شخص سے کرائی جائے گی اور اسی ملاقات میں اصلی صورتحال واضح ہو جائے گی۔۔۔''

میرے بار بار پوچھنے کے باوجود اس نے اس اہم شخصیت کا نام نہیں بتایا، مسکرا کر ٹالتا رہا اور یہی کہتا رہا ایک ہی دن کی تو بات ہے، تم آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ لو گے۔۔۔ اگلا دن گزارنا میرے لیے بڑا اذیت ناک تھا لیکن شرافت علی کے ملازموں نے ناشتے کے بعد لان میں مجھے کتوں کی لڑائی کے ذریعے بہلانے کی کوشش کی، خاصا بڑا اور خوبصورت لان تھا، کتے حد درجہ خونخوار اور طاقتور تھے۔ ان میں سے بعض پر چرمی بکس لگے ہوئے تھے۔ ان کو سدھانے والا ایک انتہائی پھرتیلا ملازم تھا جس کی آنکھیں بیحد سرخ تھیں اور اس نے سرمہ بھی لگا رکھا تھا۔۔۔ کتوں کی لڑائی میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گوٹھ صادق علی میں بے شمار ایسے کھیل تماشے میں دیکھ چکا تھا، نئی بات یہ تھی کہ کتے آپس میں لڑنے کے علاوہ کپڑے کی بنی ہوئی انسانی ڈمی کو ایک اشارے پر چیر پھاڑ کر ہواؤں میں بکھیر دیتے تھے۔ کتوں کو سدھانے والے کا قد چھوٹا تھا لیکن چھلاوے کی طرح اس میں بجلیاں سی بھری ہوئی تھیں۔ وہ کتوں کو مخاطب کرنے کے لئے مزاحیہ جملے اتنی سنجیدگی سے بولتا تھا کہ ہنسی آ جاتی تھی۔۔۔ شرافت علی اپنے محافظوں کے ساتھ صبح سویرے ہی نکل گیا تھا۔ دوپہر کو واپس آ کر اس نے کھانا میرے ساتھ کھایا پھر قیلولے کیلئے زنان خانے میں چلا گیا۔ میں رات بھر جاگا ہوا تھا، دل و دماغ کی عجیب حالت تھی اور جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر گل بہار کی قبر پر جاؤں اور اس کی مٹی کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روؤں، پھر اسٹین گن لے کر ان قاتلوں کی تلاش میں نکل جاؤں جنہوں نے گل بہار کو مجھ سے چھین لیا تھا۔۔۔ تھکن، پژمردگی، غصے اور اضمحلال کی ملی جلی کیفیت کا اثر تھا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد خیالوں میں بھٹکتے بھٹکتے مجھے نیند آ گئی، میں سویا تو پھر دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی اور ملازم نے میرے بیڈ کے ساتھ چائے کی ٹرالی لگا دی تھی۔ شرافت علی سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اب وہ قدرے بحال اور تروتازہ نظر آ رہا تھا، کلف لگا ہلکے سبز رنگ کا لباس اس پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ وہ کہنے لگا۔

''دیکھو، جنگی! دنیا میں جینے کے تین طریقے ہیں۔ ایک طریقہ نارمل ہے، اسے گزارے لائق جینا کہنا چاہیے یعنی آدمی ماحول اور حالات سے سمجھوتے کرتا ہے اور انہی سمجھوتوں کے تحت زندگی گزار دیتا ہے جیسے بہاؤ کے رخ لکڑی کا کوئی ٹکڑا بہتا چلا جا رہا ہو، دوسرا طریقہ بزدلانہ ہے۔ آدمی ہر مشکل کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ ہر مصیبت پر گھبرا جاتا ہے، ہر جگہ مفاہمت میں پہل کرتا ہے۔ اس کی ساری زندگی لوگوں سے وضاحتیں کرتے اور صفائیاں پیش کرتے گزر جاتی ہے''۔ اس نے ایک لمحے کیلئے توقف کیا اور بولا۔ ''تیسرا طریقہ آبرومندانہ باوقار طرز حیات ہے۔۔۔ اس میں آدمی مشکلات ڈھونڈتا ہے اور انہیں حل کرتا ہے، مصائب ڈھونڈتا ہے اور انہیں پچھاڑ کر اپنے لیے راستہ بناتا ہے۔ میں زندگی کے اسی طریقے کو پسند کرتا ہوں کیونکہ اس طریقے میں زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے توانائی بھی ہے، حرارت بھی ہے اور حوصلہ بھی۔۔۔ اسی لیے میں نے تمہیں پناہ دی تھی، تمہاری ضمانت کروائی تھی اور تمہیں اپنے گھر کا ایک فرد بنا لیا تھا کیونکہ جس طریق حیات کا آئیڈیا میرے ذہن میں ہے اس میں صرف اور صرف تم فٹ ہو سکتے ہو۔۔۔''

O

میں سمجھ نہیں سکا کہ اس نے میرے لیے کس راستے کا انتخاب کیا ہے اور صرف میری ذات ہی سے اسے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ — میرا اس سے کوئی ایسا تعلق تو نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ میری ذات پر توجہ دیتا اور میری مزید رفاقت کا خواہاں ہوتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ گل بہار کی موت کی اطلاع دینے کے بعد اس کا رویہ ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ میرا حقیقی بڑا بھائی یا سرپرست ہو — ویسے بھی وہ ایک مشفق اور مہربان شخص تھا۔ اس کی پیشانی کشادہ اور روشن تھی اور آنکھیں صاف شفاف اور ہر قسم کے مکر و فریب سے پاک تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جو بھی سوچ رہا ہے، میرے حق میں بہتر ہی سوچ رہا ہے۔

اس رات خلافِ امید مجھے جلد نیند آ گئی۔ نیند کی گولیاں تو میں نے کل بھی کھائی تھیں لیکن کل رات نیند نہیں آئی تھی۔ آج رات گولیوں نے فوری اثر دکھایا اور میں شرافت علی سے باتیں کرتا کرتا گہری نیند کے گدیلوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ صبح گیارہ بجے مجھے ملازم نے جگایا۔ شرافت علی نیچے ڈرائنگ روم میں منتظر تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے قریبی صوفے پر ایک بھاری بھرکم نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے اوپر اٹھے ہوئے کنارے، کندھے پر پڑی ہوئی ریشمی قیمتی چادر، کارتوس کی پیٹی اور ماتھے پر پڑے ہوئے بل دور ہی سے اعلان کر رہے تھے کہ گوٹھ محمد بخش کے وڈیرے سردار محمد خاں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا — وڈیرا سردار محمد خاں گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر وڈیروں کے مخصوص انداز میں اٹھا، ایک قدم آگے آیا اور میری طرف مضبوط انداز میں مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھا کر بولا۔

''مجھے جانتے ہو —؟''

''جانتا ہوں، سائیں —!'' میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اسے گوٹھ محمد بخش میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔

''مجھے بڑا افسوس ہے جنگی! کہ تیرا باپ فوت ہو گیا —'' وہ وڈیروں کے مخصوص لہجے میں تم سے تُو پر آ گیا۔ ''شرافت سائیں نے مجھے بتایا کہ تُو نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تیری منگیتر بھی ہلاک ہو گئی، تجھ پر بڑے ظلم ہوئے — آہ، ہا''۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔

مجھے اس کا اندازِ تخاطب بہت برا لگا بلکہ اندازِ تخاطب نہیں، ہر انداز بُرا لگا۔ وہ ان روایتی وڈیروں کی طرح بات کر رہا تھا جو مخاطب کو اپنا جدی پشتی غلام سمجھتے ہیں۔ اسی وڈیرا شاہی انداز پر میں نے جلال دین کے سامنے باغیانہ رویہ اپنایا تھا اور اس عتاب کا شکار ہوا تھا، حالانکہ میں اس کا خاندانی ملازم تھا لیکن اس کے باوجود میں نے روایتی ملازموں جیسے ادب آداب بالائے طاق رکھ دیئے تھے۔ پھر وڈیرا محمد خاں سے تو میرا تعلق آقا اور ملازم والا بھی نہیں تھا، آخر وہ کیوں مجھ سے اس لہجے میں بات کر رہا تھا — میری پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ وڈیرا سردار محمد مجھ سے مصافحہ کر کے بیٹھ گیا تھا، بیٹھے بیٹھے باتیں کر رہا تھا۔ ایک بار بھی اس نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ شرافت علی نے جلد ہی اس بات کو محسوس کر لیا جلدی سے بولا۔

''بیٹھو، بیٹھو نبی بخش جنگی! — اطمینان سے باتیں کرو''۔

میں برا سا منہ بنا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا، دانستہ صوفے پر نہیں بیٹھا۔ میں چاہتا تھا کہ وڈیرا سردار محمد مجھ سے صوفے پر بیٹھنے کو کہے لیکن اس نے نہیں کہا۔ اس نے طلائی سگریٹ کیس سے قیمتی سگریٹ نکال کر سلگایا، ایک کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرا کزن جلال ٹھیک آدمی نہیں ہے لیکن میں تیرے منہ سے اصل بات سننا چاہتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تُو

کس وجہ سے وہاں سے نکل کر بھاگا۔۔۔"

"آپ کو شرافت سائیں نے بتا دیا ہوگا۔۔۔" میں نے بیزار کن انداز میں کہا۔

"میں ان سے نہیں، تجھ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔۔۔" وہ زور دے کر بولا۔ "ساری بات تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔۔۔"

میں نے بھی تفصیل میں جانے کی بجائے اکھڑ لہجے میں دوٹوک بات کی۔

"سائیں! اتفاق سے میں حویلی کے تہہ خانے میں چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک قیدی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ عامر صدیق تھا، سیٹھ ادریس کا بیٹا۔۔۔ اس نے اپنے باپ کے نام ایک پیغام دیا تھا، یہی پیغام لے کر میں کراچی آیا تھا لیکن سیٹھ ادریس نے مجھے قید کر لیا۔ وہاں سے چھوٹا تو اور الجھنوں میں پڑ گیا۔ آخر اپنی ایک ساتھی کے ساتھ پناہ لینے یہاں آ گیا۔۔۔ بس یہ کل کہانی ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا"۔

"وہ عورت کون تھی، تیری ساتھی۔۔۔؟" سردار محمد نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بتا تو چکا ہوں کہ وہ میری ساتھی۔۔۔" میں نے کہنا چاہا۔

سردار محمد نے میری بات کاٹ دی، بولا۔ "میری اطلاعات یہ ہیں کہ وہ عورت ہمارے دشمنوں کی ایجنٹ تھی اور تیرے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت اس بنگلے میں آئی تھی۔۔۔ اس علاقے میں بے شمار بنگلے ہیں۔ آخر وہ تجھے کہیں اور لے کر کیوں نہیں گئی۔۔۔؟"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "سائیں! آپ شرافت سائیں سے پہلے پوری بات معلوم کریں، پھر مجھ سے بات کریں۔۔۔ بنگلے میں ہم اپنی مرضی سے نہیں آئے تھے۔ ہم تو ایک جاننے والے کا پتہ پوچھنے آئے تھے۔ یہاں گن مین جو ڈیوٹی پر تھے زبردستی ہمیں اندر لے آئے۔ پھر بعد کے سارے حالات سائیں شرافت نے آپ کو بتا ہی دیئے ہوں گے۔۔۔"

"بتا تو دیئے ہیں۔۔۔" سردار محمد گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن تیرے منہ سے سننے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ حویلی کی جب تلاشی لی گئی تو جلال دین کی کیا حالت تھی، زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا لیکن سیٹھ ادریس کا اثر و رسوخ اتنا مضبوط تھا کہ جلال دین کی کچھ پیش نہ گئی۔ میں انکوائری افسروں سے فرداً فرداً مل چکا ہوں، انہیں حویلی یا اس سے ملحقہ مکانوں میں کوئی ایسی قابلِ اعتراض چیز نہیں ملی جسے بنیاد بنا کر جلال دین کے خلاف مزید کوئی کارروائی کی جا سکتی۔ وہ اغواء کے کیس میں اپنی ضمانت کروا چکا ہے۔"

"اغواء۔۔۔؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔" سردار محمد نے اطمینان سے کہا۔ "اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟۔۔۔ سیٹھ ادریس نے اس کے خلاف اپنے بیٹے کو اغوا کرنے، یرغمال بنانے اور زرتاوان طلب کرنے کا مقدمہ بنوانے کے بعد ہی حویلی کے سرچ وارنٹ نکلوائے تھے لیکن جلال دین تیرے غائب ہونے کے بعد چوکنا ہو گیا تھا، اس نے عقلمندی سے کام لے کر کراچی پہنچ کر اپنی ضمانت کروا لی تھی۔۔۔ بہرحال۔۔۔" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں، مجھے بتا کہ تُو ہمارے لیے کر سکتا ہے۔۔۔؟"

مجھے عرصے سے تُو تڑاک سننے کی عادت نہیں رہی تھی اور اب کانوں کیلئے اس قسم کا لہجہ زیادہ تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت تھا، بڑی دیر

سے میں سردار محمد کا یہ لہجہ برداشت کر رہا تھا لیکن اب ٹوکنا ضروری تھا لہٰذا میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''سائیں! آپ کے بولنے کا طریقہ ٹھیک نہیں ہے، اس طرح تُو تُو کر کے مجھ سے بات مت کریں۔ میں نہ ہی آپ کا غلام ہوں، نہ آپ سے غلامی کا میرا کوئی معاملہ ہے''۔

سردار محمد کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے سے ناچنے لگے، مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ اس نے ایک دم اٹھنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ بیٹھ گیا۔ اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش میں اس کے چہرے کے خطوط بننے اور بگڑنے لگے۔ چند لمحوں تک بھونچال کی سی یہ کیفیت طاری رہی پھر اس نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا:

''نبی بخش جنگی! ہمارے غلام جدی پشتی ہوتے ہیں چاہے وہ ہمارے چچازاد بھائی کے ہوں یا خالہ زاد بھائی کے، غلام بہرحال غلام ہوتا ہے۔ یہ بات تجھے یاد رکھنی چاہیے — تُو ہمارے ساتھ مخلص ہے اور ہمارے کام کا آدمی ہے، تیری سفارش سائیں شرافت نے کر رکھی ہے اور ان کی ہر بات میرے لیے حکم ہے لہٰذا تیری اس گستاخی کو معاف کرنا میرا فرض ہے، کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ کچل کے اسے کتوں کے آگے ڈال دیتا—''

شرافت علی ماحول کے تناؤ کو بڑی دیر سے محسوس کر رہا تھا، ایک دم اٹھ کر ہمارے درمیان آ گیا۔ ایک ہاتھ سردار محمد کے کاندھے پر رکھا، دوسرے سے میرا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگا۔

''ادا سردار محمد، ہوش کرو بابا! یہ تمہارا ملازم نہیں، میرا مہمان ہے۔ یہ ٹھیک کہتا ہے کہ اس پر تمہارا کوئی ایسا حق نہیں کہ اس طرح بات کرو۔ میں نے ٹیلی فون پر بھی کئی مرتبہ تمہیں سمجھایا ہے کہ بابا، اب تم سیاسی لیڈر بننے والے ہو، یہ وڈیروں والی ٹائیں فائیں بند کرو۔ تمہیں عوام کا نمائندہ بننا ہے، عوام کیلئے آواز اٹھانی ہے اپنا دماغ ٹھنڈا نہیں رکھو گے تو یہ بازی ہار جاؤ گے۔ ہمیں بھی ذلیل کرو گے اور خود بھی علاقے میں سر اٹھا کر نہیں گھوم سکو گے۔ آئی سمجھ بابا— آرام سے بیٹھو اور تحمل سے بات کرو—''

شرافت علی کی باتوں کا فوری اثر ہوا۔ سردار محمد کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے پیشانی پر ابھر آنے والی شکنیں دور ہو گئیں، چہرے پر خجالت اور ندامت کے آثار جھلکنے لگے۔

''آئی ایم سوری، ادا—!'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں، مجھے اس طرح نہیں بولنا چاہیے—'' پھر اس نے میری طرف مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اب کے اس کے ہاتھ بڑھانے کے انداز میں حقارت نہیں مفاہمت تھی۔ ''نبی بخش جنگی، برا مت ماننا دوست—! میرا خاندانی خون کبھی کبھی میرے اندر جوش مارنے لگتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے میرا باپ اور میرا دادا، میرا پڑدادا جلالی مزاج والے لوگ تھے۔ میرے خون میں بھی اسی گرمی کا اثر ہے۔ اس گرمی کو انگلینڈ کی برف بھی دور نہیں کر سکی یہ تو پھر اپنا ملک ہے، گرم اور مرطوب—''

یہ کہہ کر وہ مسکرایا تو مجھے اس کا بدلا ہوا انداز اچھا لگا، کم از کم جلال دین کے مقابلے میں وہ مجھے ایک بہتر شخص نظر آیا۔ جلال دین ایک مرتبہ بھڑک اٹھتا تو اسے نارمل ہوتے ہوتے خاصی دیر لگ جاتی تھی اور کبھی ہفتوں، کبھی مہینوں تک اس کے مزاج نہیں ملتے تھے۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا، ایک مرتبہ جس سے بگڑ جاتا تھا پھر ہمیشہ کیلئے اس کی صورت سے بیزار ہو جاتا تھا لیکن وڈیرا سردار محمد قدرے سلجھے ہوئے مزاج کا

آدمی نظر آ رہا تھا--- ایک ایسا شخص جو مخصوص جاگیردارانہ معاشرے میں طاقت اور اقتدار کے سائے میں بلکہ آغوش میں پروان چڑھا ہو، جس نے زندگی بھر صرف حکم دینا سیکھا ہو اس کے لہو میں یہ کلچر رچ بس جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے---؟ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اس کے اندر اپنے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت موجود تھی اور وہ موقع کی نزاکت کو تھوڑا بہت سمجھنے کا شعور رکھتا تھا--- شرافت علی کی بروقت مداخلت نے ماحول کو تلخ ہونے سے بچا لیا تھا۔ اب کمرے کا تناؤ ختم ہو چکا تھا اور فضا خاصی حد تک خوشگوار ہو گئی تھی۔

''جنگی دوست---!'' سردار محمد خوش خلقی سے بولا۔ ''اب میں تمہیں اسی نام سے پکارا کروں گا کیونکہ یہ الیکشن میرے لیے جنگ ہے۔ غیرت، آن اور انا کی جنگ اور اس میں تم میرے دوست ہو جنگی دوست!--- ٹھیک؟--- ایک بار پھر ہاتھ ملاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے شروع میں اچھے الفاظ نہیں بولے---''

''ٹھیک ہے، سائیں---!'' میں نے دوبارہ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے کوئی ناراضگی نہیں--- آپ خاندانی آدمی ہیں، اچھے انسان ہیں۔ آپ سے مجھے ہمیشہ اچھائی کی امید رہے گی---''

سردار محمد اپنی تعریف پر بچوں کی طرح خوش ہو گیا، ایک دم اپنی ایک انگلی سے سونے کی قیمتی نگینے والی بھاری انگوٹھی اتار کر میری طرف بڑھا دی۔

''جنگی دوست! یہ میری طرف سے دوستی کا پہلا تحفہ ہے---''

''نہیں، سائیں---!'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت قیمتی ہے اور میں بہت معمولی انسان ہوں---''

''تم بہت قیمتی ہو جنگی دوست---!'' سردار محمد بھاری لہجے میں بولا۔ ''تم جتنے قیمتی ہو اس کا تمہیں نہیں، ہمیں اندازہ ہے--- یہ انگوٹھی پہن لو، یہ ہماری دوستی کی نشانی ہے---''

میں نے تھوڑی دیر تک سوچا اور پھر شرافت علی کی طرف دیکھا--- وہ اشارے سے مجھے انگوٹھی پہننے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ انگوٹھی لے کر دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہن لی۔ میرا خالی خالی سا ہاتھ یکایک بھرا بھرا، چمکیلا چمکیلا اور قیمتی قیمتی معلوم ہونے لگا، بیک وقت میری اور سردار محمد کی نظریں ملیں اور ہم مسکرا دیے۔ یہ مسکراہٹ کچھ دیر پہلے کے تلخ ماحول کے ردعمل کے طور پر تھی۔

''پروگرام یہ ہے---'' سردار محمد بتانے لگا۔ ''ہم کھانے کے بعد گوٹھ محمد بخش کیلئے روانہ ہو رہے ہیں، وہاں تمہاری رہائش اور حفاظت کا بندوبست موجود ہے۔ تمہاری والدہ کو بھی تمہارے پاس بلا لوں گا--- آج چوبیس تاریخ ہے، ستائیس کو مجھے کاغذات نامزدگی داخل کرنے ہیں۔ تم میری الیکشن کمپین کے انچارج ہو گے''۔

میں نے حیرت سے سردار محمد کی طرف دیکھا تو وہ میری حیرانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

''جنگی دوست! اس میں شک وشبہ والی کوئی بات نہیں، شروع سے سائیں شرافت کا یہ آئیڈیا تھا اور اب اس پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے--- بتاؤ، تم اس کیلئے تیار ہو؟--- سچ سچ کہنا---''

میں تو خود گوٹھ جا کر ماں سے ملنے کیلئے بے چین تھا لیکن سردار محمد کے کیمپ میں جا کر اس کا پولنگ ایجنٹ یا الیکشن کمپین انچارج بن کر

سامنے آنا میرے لیے کم از کم گوٹھ کی فضا کیلئے دشوار تھا۔ ان دو وڈیروں، دو قریبی عزیزوں کی جنگ میں میری شمولیت ایسی تھی جیسی ہاتھیوں یا سانڈوں کی جنگ میں مینڈکوں کی شرکت — میرے چہرے سے میری الجھن پڑھ کے شرافت علی نے اس کا حل پہلے ہی بتا دیا۔

''کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا، ہر وقت مسلح محافظ تمہارے ساتھ رہیں گے۔ تم گوٹھ صادق علی کے علاوہ ہر گوٹھ میں جانے کیلئے آزاد ہو بلکہ یہ جہاں جہاں اپنی الیکشن کمپین کے سلسلے میں جائیں گے، تم ان کے ساتھ رہو گے — گوٹھ محمد بخش میں ہمارا پہلا انتخابی جلسہ ہوگا جبکہ گوٹھ صادق علی میں جلال دین اپنا انتخابی جلسہ کرے گا، ظاہری بات ہے کہ اپنی طرف سے دونوں پارٹیاں زور لگائیں گی کہ زیادہ سے زیادہ کامیابی ہو۔ اس جنگ میں ہم اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں۔ یہ ہماری انا اور آن کا مسئلہ ہے —''

''ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ ہوں —'' میں نے پُر جوش اور مضبوط لہجے میں کہا۔

''ویل ڈن —!''

شرافت علی نے اٹھ کر میرے کاندھے پر تھپکی دی — سردار محمد ہم سے رخصتی کر کے زنان خانے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شرافت علی نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''نبی بخش جنگی! سردار محمد کی کسی بات کا برا مت ماننا۔ وہ پیدائشی وڈیرا ہے، تعلیم اور انگلینڈ کی آب و ہوا اس پر اثر انداز نہیں ہوئی اور اسی لیے جلال دین کی طرح انگلینڈ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر بھاگ آیا لیکن اتنا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تمہارے حق میں برا آدمی نہیں۔ اس کے لب و لہجے پر مت جاؤ۔ وہ اب تمہارا دوست بن چکا ہے اور ہمیشہ دوست رہے گا — اب میں سردار محمد اور اپنے بچوں کے ساتھ اندر کھانا کھانے جا رہا ہوں۔ میرے بچے بھی سردار محمد کے ساتھ گوٹھ جانا چاہتے ہیں۔ تمہارا کھانا اوپر پہنچ جائے گا۔ کھانے کے بعد تیار رہنا، تمہیں جلد روانہ ہونا ہے —''

''آپ نہیں جائیں گے —؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں —'' شرافت علی نے کہا۔ ''دوست، مجھے یہاں بہت سے کام سنبھالنے ہیں — سب سے پہلے مجھے اپنے بنگلے کو انتخابی دفتر بنانے پر توجہ دینی ہے۔ اس میں کچھ تبدیلیاں کرنی ہیں، الیکشن مہم کیلئے خاصے لوگوں کی خدمات حاصل کرنی ہیں۔ میں انشاء اللہ پہلے انتخابی جلسے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا''۔

یہ کہہ کر وہ تو زنان خانے میں چلا گیا اور میں اوپر اپنے نئے کمرے میں آ گیا، وہاں پہنچا تو ملازم ایک بڑے سوٹ کیس میں میرے کپڑے رکھ رہا تھا۔ یہ ریڈی میڈ ملبوسات شرافت علی نے غالباً ایک دو روز پہلے میرے لیے خریدے تھے۔ اس میں عمدہ سلکی واسکٹیں بھی تھیں اور قیمتی کپڑوں کے کئی جوڑے بھی — ایک ملازم نے مجھے نئی گھڑی اور گلے کی طلائی زنجیر لا کر دی۔ یہ انکشاف بھی میرے لیے باعثِ حیرت تھا کہ شرافت علی نے میرے لیے پستول کا لائسنس بنوا دیا تھا۔

O

سہ پہر کو ہم دو گاڑیوں میں گوٹھ صادق علی کیلئے روانہ ہوئے۔ مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ اگلی گاڑی میں سردار محمد اپنی ہمشیرہ اور دونوں بچوں اور محافظوں کے ہمراہ تھا، میں دوسری گاڑی میں تین محافظوں کے ساتھ سوار تھا۔ راستہ لمبا تھا اور میرا دل عجیب و غریب جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے دنوں بعد گوٹھ کی ہوا میں سانس لینے کی ساعت آئی تھی، ماں سے ملنے کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ جس علاقے میں ایک غلام، ایک مسکین ملازم کی حیثیت سے اتنے برس گزارے تھے اب اس کی فضائیں ایک نئی حیثیت سے میرا استقبال کرنے والی تھیں۔

''مگر نبی بخش جنگی! تمہاری حیثیت کیا ہے، یہ بتاؤ—؟'' میرے اندر میرا ہمزاد مجھ سے الجھنے لگا۔ ''اب تک کون سا لمحہ تمہارا اپنا لمحہ رہا؟ تم تو دوسروں کے ہاتھوں میں جھولنے والی ڈوریوں سے بندھی ہوئی کٹھ پتلی کی طرح پیہم رقصاں تھے، حالات نے جب اور جس طرح چاہا تمہیں گھما دیا۔ تمہارا اپنا تو کوئی قدم نہیں تھا، اپنا تو کوئی لمحہ نہیں تھا، اپنا تو کوئی فیصلہ نہیں تھا''۔

میری کنپٹیاں بجنے لگیں۔ ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں— میں نے چیخ کر کہا۔

''سب میرے فیصلے تھے، سب میرے لمحے تھے اور ہر قدم میرا اپنا قدم تھا۔ میں کسی کا مہرہ نہیں ہوں، کسی کی کٹھ پتلی نہیں ہوں— نہیں ہوں— نہیں ہوں''۔

بے ساختہ میری آواز بلند ہوگئی تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے محافظ چونک پڑے اور پھر ہنس دیئے، میں بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا— گاڑی اب ہائی وے کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے جنگلوں اور ویرانوں سے گزر رہی تھی، اکا دکا گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس روشن نظر آرہی تھیں۔ شرافت علی نے میرے اصرار سے مجبور ہو کر روانگی سے قبل میرے حال پر یہ مہربانی کی تھی کہ گارڈز کے ہمراہ مجھے چند لمحوں کے لیے گل بہار کی قبر پر لے گیا تھا۔ یہ ایک گنجان قبرستان تھا اور شمالی علاقے کے بلاکوں، فلیٹوں اور پلازوں کے پیچھے بنا ہوا تھا۔ بلکہ بنا کیا تھا، بگڑ رہا تھا۔ تیزی سے پھیلتی ہوئی آبادی قبرستان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ ایک پرانے پیڑ کے نیچے گل بہار کی تازہ تازہ قبر میرے سامنے تھی۔ اس پر ڈالے گئے پھول سوکھ چکے تھے اور اردگرد بڑی وحشت ناک تنہائی تھی۔ میں بے ساختہ اس کی قبر سے لپٹ گیا تھا۔ شرافت علی نے پھول اور ہار نکالے تو ملازموں نے قبر کے اردگرد کا جھاڑ جھنکار اور خشک پتے صاف کرنے شروع کیے لیکن میں نے یہ کہہ کر انہیں پرے ہٹا دیا کہ یہ کام میں کروں گا۔ میں نے اس کی قبر پر پڑے ہوئے سوکھے پھول اور خشک پتے چن کر ایک طرف ڈالے۔ اگر بتیاں جلائیں، نئے پھول اور ہار چڑھائے۔ اس کیلئے فاتحہ پڑھی اور فاتحہ پڑھتے پڑھتے اتنا بے قابو ہوا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شرافت علی میرے ساتھ بیٹھا تھا، اس نے جی بھر کے مجھے رونے دیا اور مداخلت نہیں کی، صبر کی نصیحت نہیں کی۔ جی بھر کے رو لیا تو میرے دل کا بوجھ جیسے ہلکا ہوگیا۔ میں نے اس کی قبر پر قسم کھائی کہ میں اس کے قاتلوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا، کبھی آمنا سامنا ہوگیا تو اپنی زندگی کی بازی لگا کر بھی انہیں جہنم واصل کر دوں گا۔ وہاں سے ہم جلد ہی بنگلے پر لوٹ آئے، گاڑیاں تیار تھیں۔ یہاں سے گوٹھ محمد بخش کا سفر شروع ہوا اور اب رات کے سناٹے میں دونوں گاڑیاں سبک رفتاری سے کراچی کو پیچھے چھوڑ کر گوٹھ محمد بخش کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ چاندنی رات ہونے کی وجہ سے دائیں بائیں کے مناظر میں عجب سی یاسیت، وسعت اور ہولناکی کا احساس ہو رہا تھا۔ چاند کبھی درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی گاڑی کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگتا۔ یہ آنکھ مچولی خاصی دیر جاری رہی پھر مجھے نیند آنے لگی، آنکھ کھلی تو گاڑیاں ایک سفری چائے خانے

کے قریب رکی ہوئی تھیں اور ہوٹل کے ملازم بھاگ بھاگ کر ہمارے لیے چائے اور اُبلے ہوئے انڈے لا رہے تھے۔ ایک گارڈ نے مجھے ایک بڑی سی پلیٹ پکڑائی جس میں اُبلے ہوئے انڈے، لوبیے کے بیج اور چائے کا ایک مگ رکھا ہوا تھا۔ چائے کے بعد گاڑیاں پھر اسٹارٹ ہو گئیں۔ سردار محمد کا پروگرام یہ تھا کہ ہم راتوں رات گوٹھ محمد بخش پہنچ جائیں اور ان راستوں سے پہنچیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، وہ کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے دو تین دن بعد مجھے منظرِ عام پر لانا چاہتا تھا— جیسے جیسے گوٹھ محمد بخش قریب آ رہا تھا، میری ہیجانی کیفیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اگرچہ یہ میرا گوٹھ نہیں تھا لیکن تقریباً ہر گوٹھ کی فضا ایک جیسی تھی اور مجموعی طور پر تمام گوٹھ ایک لڑی میں پروئے ہوئے دانوں کی طرح تھے۔ سب کی زمینیں، مکانات، حویلیاں، پل، باغات، شکارگاہیں، چھوٹی چھوٹی دکانیں اور عوام ایک جیسے تھے بس ناموں اور فاصلوں کا فرق تھا۔ ہم ڈھلتی رات کے ملگجے اندھیروں میں جب گوٹھ محمد بخش پہنچے تو چاند ڈوب چکا تھا اور گوٹھ کی گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ سردار محمد تو سیدھا اپنی حویلی کی طرف چلا گیا تھا اور ہماری گاڑی اس حویلی کے احاطے میں آ کر رک گئی جہاں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس کے بیرونی حصے میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے جن کے باہر بڑے بڑے انتخابی بینرز اور پوسٹرز آویزاں تھے، صحن خاصا کشادہ تھا اور زنان خانے میں بھی لوگ کام کر رہے تھے۔ ایک گارڈ نے مجھے زنان خانے کی ڈیوڑھی سے گزار کر ایک بڑے سے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس کمرے کے دروازے پر میرے رشتے کا ماموں سبزل کھڑا تھا، یہ گوٹھ سجاول خان میں رہنے والا میرا وہی ماموں تھا جس کے پاس ماں نے پناہ لی تھی اور وہ اس کا علاج کروا رہا تھا۔

''میرے بیٹے— وہ دونوں بازو پھیلا کر میری طرف لپکا۔ ''میرے شیر—!''

ماموں کے گلے لگ کر مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ میری عدم موجودگی میں میرا مہربان و محسن ثابت ہوا تھا۔ اس نے انتہائی ناسازگار حالات میں میری ماں کو پناہ دی تھی وہ میرے لیے دنیا کا سب سے محترم شخص تھا بلکہ سگے ماموں سے بڑھ کر تھا۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کپکپاتے ہونٹوں سے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن آواز میرے حلق میں گھٹ گئی۔ بعض اوقات سچے جذبوں کی فراوانی الفاظ کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے، اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا۔

''ماں کہاں ہے ماما—؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''بالکل خیر سلا ہے''۔ وہ میرے کاندھے تھپکتا ہوا بولا۔ ''ایک دم ٹھیک ہے۔ اب اس کی آنکھیں بھی ٹھیک ہو رہی ہیں۔ وہ رات بھر جاگ کر تیرا انتظار کرتی رہی ہے— دیکھ سامنے—''

یہ کہہ کر ماموں سبزل ڈرامائی انداز میں ایک طرف ہٹ گیا تب میں نے ماں کو دیکھا۔ وہ اُجلے کپڑوں میں ملبوس ماموں سبزل کے پیچھے کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں چیخ مار کر ماں سے لپٹ گیا۔ اس کے ضعیف اور شفیق ہاتھوں کی حرارت، نرمی شفقت اور ممتا نے جیسے میرے دل سے ہر دکھ دور کر دیا۔ ماں رو رہی تھی مگر میرا من شانت تھا اس چھوٹے سے بچے کی طرح جو میلے میں گم ہونے کے بڑی دیر بعد ماں کی آغوش میں دوبارہ پہنچا ہو۔ ماں کو زندہ سلامت، صحت مند اور تندرست دیکھ کر میری آنکھوں اور دل میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ پھر ماں میرے باپ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے زور زور سے رونے لگی، میری آنکھوں سے بھی ساون بھادوں کی طرح آنسو بہنے لگے اور جیسے برسات کے بادلوں سے

پانی نچڑتا ہے اسی طرح جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ رہا تھا اور دل کا لہو آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے پگھل رہا تھا۔۔۔ میرا ماموں سردار محمد کی ہدایت پر میری ماں کو مجھ سے ملانے لایا تھا، صبح انہیں واپس چلے جانا تھا اور اب صبح ہونے میں دیر ہی کتنی تھی۔۔۔ ماں نے اصرار کر کے مجھے بستر پر لٹایا اور خود میرے سرہانے بیٹھ گئی۔ میرا سر تھپکنے لگی جیسے بچپن میں لوریاں دیتی تھی۔ مجھے نیند آنے لگی۔ ایسی نیند، ایسی پُرسکون نیند کہ میں باتیں کرتے کرتے سو گیا۔۔۔ آنکھ کھلی تو خاصی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ماں اسی طرح میرے سرہانے بیٹھی تھی، سامنے میز پر ہمارے لیے ناشتہ چنا ہوا تھا، ناشتے کے دوران ماں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اپنی حفاظت کا خاص خیال رکھوں گا۔ کبھی اکیلا گوٹھ صادق علی نہیں جاؤں گا، کبھی وڈیرا جلال دین یا اس کے کسی آدمی کے چکر میں نہیں آؤں گا۔ ہر لمحہ اور ہر پل چوکس رہوں گا اور ہر دوسرے تیسرے دن گوٹھ سجاول کا چکر لگاتا رہوں گا۔۔۔ گوٹھ محمد بخش سے گوٹھ سجاول زیادہ دور نہیں تھا لیکن وڈیرا سردار محمد نے میری ماں اور ماموں کو لانے اور چھوڑنے کے لیے الگ سے ایک ڈرائیور اور ایک گاڑی کا بندوبست کیا تھا۔ ماں میرے لیے گھی اور میوے والا گڑ اور مروندے لائی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے تک وہ میرے سر ہاتھ پھیرتی اور میری بلائیں لے لے کر روتی رہی، بار بار تاکید کرتی رہی کہ میں اپنی حفاظت کا خاص خیال رکھوں۔۔۔ میں نے بڑی مشکلوں سے ماں کو یقین دلایا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا، اللہ میری حفاظت کرے گا۔ میں اس کی ہر ہدایت کو نہ صرف یاد رکھوں گا بلکہ اس پر عمل بھی کروں گا۔۔۔ ماموں سبزل نے بھی مجھے اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ میں وڈیروں کی لڑائی کو اپنی ذاتی لڑائی بنانے سے گریز کروں کیونکہ وڈیروں کے مفادات بہر حال کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی سطح پر جا کر مل جاتے ہیں، نقصان ان غریبوں کا ہوتا ہے جو ان کا آلہ کار بنتے ہیں۔ ماموں سبزل مجھ سے سرگوشی میں باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی روانہ ہوتے ہوتے بولا۔

''جب تم گوٹھ سجاول آؤ گے تو میں تم سے باتیں کروں گا۔۔۔ بہت باتیں کرنی ہیں تم سے، بس ایک دو روز میں آ جاؤ۔۔۔''

میں نے وعدہ تو کر لیا لیکن ایک دو روز تک کہیں جانے کی فرصت نہیں ملی۔ اس حویلی میں سردار محمد نے اپنے انتخابی دفتر کا اتنا کام پھیلا دیا تھا کہ اسے سمیٹتے سمیٹتے کئی دن لگ گئے۔ شہر کے دو تین تعلیم یافتہ نوجوان ہماری مدد کیلئے ہر لمحہ حویلی میں موجود رہتے تھے لیکن سردار محمد نے مجھے اپنا کمپین انچارج بنا کر اتنا مصروف کر دیا تھا کہ بمشکل کھانا کھانے کی فرصت مل پاتی تھی۔ دو گن مین ہر جگہ ہر مقام پر ہر وقت میری حفاظت کے لئے مستعد رہتے تھے، وہ اتنے محتاط تھے یا انہیں ایسی خصوصی ہدایت دی گئی تھیں کہ جب میں باتھ روم میں جاتا تھا تب بھی وہ باہر موجود رہتے۔ بینر اور پوسٹر لگانے کیلئے ہم گوٹھ محمد بخش کے علاوہ ایک دو مزید علاقوں میں بھی گئے، گوٹھ صادق علی کے کئی آدمیوں سے میری ملاقات ہوئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ سب کچھ خوفزدہ ہیں، سلام علیک کے علاوہ بات نہیں کرتے اور دانستہ کترا تے ہیں۔ مجھے اس وقت بڑی ہنسی آئی جب گوٹھ صادق علی کا قادر بخش مجھے دیکھ کر کنی کترا کے ایک طرف ہونے لگا۔ اس وقت میں گوٹھ نیاز خاں کی گلیوں میں بیز کی رسیاں لگوا رہا تھا اور مجھے دیکھ کر جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر جب اچھی طرح اس نے مجھے پہچان لیا تو ایک طرف سٹک گیا۔ میں اس وقت ایک اونچے ٹرک کی چھت پر کھڑا تھا، وہیں سے اسے آواز دی۔

''قادرے!۔۔۔ بھاگو مت، بات سنو۔۔۔''

قادر بخش پل بھر کیلئے سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں نے تیزی سے ٹرک سے اتر کر اس کا پیچھا کیا۔ گلی کے موڑ پر

ایک بوڑھے پرچون فروش کی دکان کے پاس وہ رک گیا، تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بھاگتا کیوں ہے، پہچانتا نہیں مجھے؟— میں نبی بخش جنگی ہوں''۔

''جنگی—!'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''تیری جان کو خطرہ ہے، اس طرح باہر مت نکلا کر۔ میں نے سنا ہے، سائیں جلال دین تیرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے— تُو سردار محمد کا پولنگ ایجنٹ کیسے بن گیا؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''پولنگ ایجنٹ نہیں، کمپین انچارج ہوں— کمپین انچارج سمجھتا ہے، انتخابی مہم کا انچارج—!''

''یہ تو اور بھی خطرے والی بات ہے—'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر مزید دہشت زدہ ہو گیا، کہنے لگا۔ ''یہ دو بندوق والے ہمیں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں—؟''

میں ہنس پڑا۔ ''یہ میرے گن مین ہیں، میری باڈی گارڈ—''

''باڈی گارڈ—'' وہ حیرت سے چیخا۔ ''تیرے باڈی گارڈ؟ باڈی گارڈ تو وڈیروں کے ہوتے ہیں، تُو کہاں سے وڈیرا ہو گیا؟— میں نے سنا تھا کہ تُو سائیں جلال دین کے قیمتی زیورات لے کر بھاگ گیا ہے، پولیس تجھے ڈھونڈتی رہی اور شاید اب بھی پولیس تیری تلاش میں ہو—''

اس نے پھر ایک بار بوکھلائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا، کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں سائیں جلال دین کو پتہ نہیں چلا ہے ابھی کہ تُو وڈیرا سردار محمد کی الیکشن مہم چلا رہا تھا ورنہ وہ اپنے بھائی سے آ کر خود تجھے مانگ لیتا، بلکہ پکڑ لیتا، اور تیرا بھی وہی حشر کرتا جو ترے باپ کا ہوا—''

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پوری قوت سے ایک زناٹے دار تھپڑ قادر بخش کے منہ پر مارا، تھپڑ لگتے ہی وہ اوندھے منہ چکرا کر زمین پر گرا۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا، ہونٹ پھٹ گئے اور منہ خون سے بھر گیا۔ یہ دیکھتے ہی میری حفاظت پر مامور دونوں گن مین تیزی سے ہماری طرف لپکے اور ایک نے پھرتی سے جھک کر قادر بخش کو گلے سے پکڑ لیا، دوسرے نے فوری طور پر اس کی جیبوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ ایک چھوٹا سا چاقو اس کے کُرتے کی جیب سے برآمد ہوا اگرچہ یہ بے ضرر سا چاقو تھا لیکن اس کی موجودگی معنی خیز تھی۔ گن مین اسے مارتے پیٹتے ایک مکان کے احاطے میں لے آئے۔ میں انہیں روکتا رہ گیا مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ قادر بخش کا حلیہ بگڑ گیا۔ اول تو میرے تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے، مزید محافظوں نے جس بے دردی سے اس کی ٹھکائی کی تھی وہ اس کے رہے سہے ہوش اڑا دینے کیلئے کافی تھی۔ میں اگر سختی سے مداخلت نہ کرتا تو وہ اسے اور پیٹتے۔ یہ گاؤں کے نمبردار کا گھر تھا اور وہ اس ساری صورتحال کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا— علاقے میں تقریباً ہر گوٹھ کے لوگ سردار محمد کے ایک ایک آدمی کو پہچانتے تھے لیکن میرے بارے میں تذبذب کا شکار تھے کہ میں جلال دین کو چھوڑ کر اس کی پارٹی میں کیسے شامل ہو گیا۔ بعض لوگ مجھے پہچاننے سے قاصر تھے اور جو پہچان چکے تھے، الجھنے سے گریز کر رہے تھے۔ قادر بخش اپنی حماقت کے ہاتھوں پٹ گیا، اگر وہ مجھے مشتعل نہ کرتا تو بات اس حد تک نہ بڑھتی۔ اس نے میرے باپ کا نام لے کر مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا، یقینی طور پر وہ معافی تلافی کے قابل نہیں تھا۔ اگر اس کی پٹائی ہوئی تو بہت مناسب ہوئی— اب نمبردار اسے زمین سے اٹھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ بات کیا تھی لیکن قادر بخش اتنا سہم گیا تھا کہ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ میں نے محافظوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے درمیان میں آ کر کہا۔

''قادرے! میرے مرحوم باپ کے بارے اگر تیرا جلال دین بھی بکواس کرے گا تو میں اس کے تھوبڑے کا بھی یہی نقشہ بنادوں گا جو تیرا بنایا ہے---یادرکھنا اور گاؤں کے ہرشخص کو بتادینا کہ میں اپنی پکی ضمانت کروا کے آیا ہوں، جو مجھ سے الجھنے کی کوشش کرے گا اس کا یہی حشر ہوگا---''

قادر بخش کراہتا ہوا اُٹھا۔ وہ بُری طرح لنگڑا رہا تھا، جاتے جاتے اس نے زخمی سانپ کی طرح میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''تُو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا---یادرکھنا، یہ بات بھولنے والی نہیں۔ یہ سرخ آگ بہت دور تک جائے گی۔ یہ مت سمجھنا کہ بندوق والے صرف تیرے ساتھ ہیں---''

گن مین یہ سن کراس کی طرف لپکے مگر میں نے روک دیا اور وہ لنگڑاتا ہوا تیزی سے گاؤں کی گلیوں میں گم ہوگیا--- نمبردار پریشان ہوکر بولا۔

''ابھی تو الیکشن شروع بھی نہیں ہوئے کہ دنگا فساد شروع ہوگیا--- یہ حاکم نیاز و کا بھتیجا ہوتا ہے رشتے میں، گوٹھ صادق پہنچ کرآگ لگائے گا اور خواہ مخواہ بیچ میں میرا نام آئے گا--- بہت برا ہوا''۔

میں نے کہا۔''نمبردار! تمہارا نام نہیں آئے گا بیچ میں، مطمئن رہو اور اپنی زبان بند رکھو''۔

''میں کیوں اپنی زبان بند رکھوں---؟'' وہ بلند آواز میں بولا۔''اور تم کون ہوتے ہو میری زبان بند کروانے والے--- ہوتے کون ہو تم؟''

اب بات مزید بگڑ سکتی تھی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔''نمبردار! میں وڈیرا سردار محمد کا الیکشن کمپین انچارج ہوں، بس اتنا ہی تمہارے لیے جاننا کافی ہے۔''

نمبردار کچھ جھجک سا گیا لیکن فوری طور پر اس نے اپنا لہجہ نرم نہیں کیا، اُسی تیز لہجے میں بولا۔

''تو پھر میں کیا کروں، کون سا میرے اوپر احسان کردیا ہے تم نے؟--- یہاں کا انتظام دیکھنے کی میری ذمہ داری ہے۔ یہاں میں کسی کی بدمعاشی نہیں چلنے دوں گا۔ مجھے یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ دوپہر کو تم لوگوں نے ایسی گلیوں میں ٹرک کھڑا کر کے بینر باندھے ہیں جہاں بعض گھروں میں بے پردگی ہوئی ہے''۔

ایک گن مین آکر نمبردار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔''دیکھ نمبردار آگے سے ایک لفظ مت بولنا، جنگی سائیں کی بہت دشمن داری ہے اور وڈیرا سائیں کا حکم ہے کہ کوئی ان کے ساتھ اونچی نیچی بات کرے تو گولی ماردو---''

''ہونہہ، گولی ماردو---'' نمبردار نتھنے سکوڑ کر بولا۔''بہت گولیاں کھا چکے ہم--- وڈیرے کو بولنا کہ ووٹ لینا ہے تو گولی کی زبان میں نہیں شرافت کی زبان میں بات کرے ورنہ ایک کمپین تم چلاؤ گے اور ایک کمپین ہم چلائیں گے---''

دوسرا گن مین اچھل کر بولا۔''زیادہ ٹرٹر مت کرو نمبردار! ایک بار بول دیا ہے کہ ہمارے ساتھ بحث مت کرو۔ جو بات کرنی ہے، وڈیرے سائیں سے جاکر کرو---''

O

نمبردار بڑبڑاتا رہ گیا اور ہم دانت پیستے ہوئے وہاں سے نکل آئے۔ ٹرک تک پہنچے تو دوسرے ساتھیوں تک یہ اطلاع پہنچ گئی تھی اور وہ ڈنڈے اور کلہاڑیاں سنبھالے ہماری طرف آ رہے تھے، بروقت بیچ بچاؤ ہو گیا ورنہ معاملہ طول کھینچ جاتا۔

الیکشن حویلی پہنچ کر ہم کھانے کے بعد جب اپنے کمروں میں آرام کرنے کیلئے جانے لگے تو سردار محمد پہنچ گیا، وہ اپنی جیپ پر اپنے چار گن مینوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے حویلی کی سیڑھیوں کے پاس جیپ روک دی۔ وہ بھاری چادر سنبھالتا ہوا اُترا۔ فی الفور تمام لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ برآمدے میں پڑی ہوئی ایک اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جنگی دوست ---!'' وہ سگریٹ سلگائے ہوئے بولا۔ ''ابھی میری کمپین شروع نہیں ہوئی، جھگڑے شروع ہو گئے --- بات کیا تھی؟''

میں نے اسے تمام بات دی۔ وہ دھیرے دھیرے سگریٹ کے کش لیتا رہا اور تائید طلب نظروں سے دونوں گن مینوں کی طرف دیکھتا رہا، انہوں نے سر ہلا کر میرے بیان کی تائید کی۔

''جلال دین نے اپنے ایک پیغامبر کو میرے پاس بھیجا ہے ---'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''مجھ سے اس نے درخواست کی ہے کہ میں تمہیں خاموشی سے اس کے حوالے کر دوں''۔

میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا، کچھ بولا نہیں۔

''ظاہر ہے کہ میں نے انکار کر دیا''۔ سردار محمد اطمینان سے بولا۔ ''جس جاگیرداری سسٹم سے میرا تعلق ہے اس میں آدمی اپنا کتا بھی کسی کو نہیں دیتا اور پھر باہوٹ کو کسی کے حوالے کیسے کیا جا سکتا ہے کیونکہ باہوٹ کا مطلب ہے پناہ گزیں، وہ شخص جسے پناہ دی گئی ہو --- تم میرے کچھ بھی نہیں ہو لیکن مَیں تمہیں اپنا پناہ گزیں سمجھتا ہوں۔ آج سے تمہارے گن مینوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گا کیونکہ مجھے دھمکی ملی ہے کہ اگر مَیں تمہیں زندہ حالت میں ان کے حوالے نہیں کروں گا تو وہ تمہیں مردہ حالت میں وصول کر لیں گے ---''

میری رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔ میری موت کا پیغام بھیج کر جلال دین نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں ضبط کے سارے بندھن توڑ کر خود اس کیلئے اذیت ناک موت کا پیغام بن جاؤں۔ مجھے اس سے اپنے باپ کی موت کا انتقام لینا تھا۔ ابھی یہ ادھار اسے چکانا تھا، ابھی تو پچھلا حساب بھی اس نے صاف نہیں کیا تھا کہ میرے خون کا طالب ہو گیا۔

''سائیں ---!'' میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''صرف ایک بندوق اور اجازت چاہیے، میں خود گوٹھ صادق علی جا کر اس کا حساب بے باق کر آؤں گا --- میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا نام کہیں بھی نہیں آئے گا۔ میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پھانسی کے پھندے تک پہنچ کر بھی آپ یا آپ کے کسی دوست کا کوئی حوالہ میری زبان پر نہیں آئے گا ---''

سردار محمد غور سے مجھے دیکھ رہا تھا، مسکرا کر تیکھے لہجے میں بولا۔

''میں حوالوں سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں جنگی دوست! تھانوں کو تنخواہیں ہم اپنے گھروں سے دیتے ہیں اور اپنی عدالت آپ لگا کر مجرم کو سزا بھی ہم خود دیتے ہیں، ہمارے لیے حوالے وغیرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور اسی لیے ہماری حویلیوں میں عقوبت خانوں کو یہاں کون نہیں جانتا

لیکن میں نہیں چاہتا کہ الیکشن سے پہلے یا الیکشن کے دوران کوئی داغ میری شہرت پر لگے، کوئی مسئلہ میرے لیے کھڑا کیونکہ اب میں فیوڈل لارڈ نہیں، پبلک مین کے طور پر سامنے آنے والا ہوں۔ اپنے حریف کی جن کمزوریوں کو ایکسپلائٹ کر کے مجھے یہ الیکشن جیتنا ہے انہی کمزوریوں کو اس کے ہاتھ میں نہیں جانے دینا چاہتا— بات سمجھ گئے؟''

''ٹھیک ہے، سائیں—!'' میں نے شکست خوردہ انداز میں سر ہلایا۔

''کوئی پھڈا نہیں کوئی لغزا نہیں—'' وہ ایک انگلی اٹھا کر تیکھے انداز میں بولا۔ ''اگر جھگڑا تم پر مسلط بھی کر دیا جائے تو کھوپڑی قابو میں رکھو، بھیجہ ٹھنڈا رکھو۔ اپنے جذبات پر قابو رکھو''۔

پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے آدمیوں کو اس نے کچھ ہدایات دیں، نئے گن مین کو میری حفاظت پر تعینات گن مینوں سے ملوایا اور پھر جیپ میں جا بیٹھا۔

نیا گن مین اشرف گریجویٹ تھا اور شہر سے آیا تھا۔ اس کی آنکھیں بیحد چمکیلی اور پُر اسرار تھیں۔ اپنی حرکات و سکنات سے وہ منجھا ہوا کمانڈو معلوم ہوتا تھا لیکن اپنی تعلیمی پوزیشن کے علاوہ اس نے اور کچھ نہیں بتایا، دھیمے دھیمے مسکراتا رہا اور سر ہلا کر معذرت خواہانہ انداز میں کہتا رہا۔

''زیادہ باتیں ہمارے پیشے کیلئے مفید نہیں۔ سکیورٹی اور پروٹوکول کی ڈیوٹیاں دینے والے لوگ چاہے سرکاری اداروں میں ہوں یا غیر سرکاری اداروں میں، انہیں بہت ریزرو رہنا پڑتا ہے اور کسی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے''۔

اس کا بستر خاص میرے کمرے میں لگایا گیا تھا۔ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر کاموں کی نگرانی کے بعد میں سونے کیلئے لیٹ گیا تو وہ دیوار کی طرف منہ کیے ٹرانسسٹر سنتا رہا، جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ اس کا ٹرانسسٹر بجتا رہا۔ دھیمی دھیمی موسیقی تھی، پھر اچانک اس دھیمی دھیمی موسیقی کی لے یک لخت تیز ہو گئی۔ ساز انتہائی اونچے سُروں میں بجنے لگے، اتنے تیز کہ دھماکوں میں بدل گئے۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ٹرانسسٹر خاموش تھا، اشرف بستر سے غائب تھا اور باہر گولیاں چل رہی تھیں۔ موت میرا تعاقب کرتی ہوئی ایسے عالم میں میرے سر پر نازل ہو رہی تھی جب میں غنودگی کے عالم میں تھا، نہتا اور مضمحل، دن بھر کا تھکا ہوا۔ باہر مسلسل گولیاں چل رہی تھیں، لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ میں نے فوری طور پر جنریٹر سے چلنے والی بجلی کا مین سوئچ آف کیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ سوئچ بورڈ میرے کمرے کے داہنے دروازے کے قریب تھا، یک لخت گھپ اندھیرا چھا گیا اور ایک ہیولہ دروازے کے فریم میں پل بھر کے لیے نمودار ہوا۔

''جنگلی سائیں—!'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''فکر نہ کریں۔ میرے پیچھے آ جائیں، کمرہ فوری طور پر شفٹ کرنا ہے''۔ یہ اشرف تھا۔

''مگر کیوں!—؟'' میں نے حیرت سے پوچھا اور دروازے کے قریب رینگ آیا۔

''کیوں اور کس لیے کا ٹائم نہیں ہے—'' وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''حملہ آور آپ کا نام اور کمرہ پوچھتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے دو تو ہم نے ڈھیر کر دیئے ہیں لیکن وہ تعداد میں ہم سے زیادہ ہیں— آئیں فوراً، ہم حویلی کے پیچھے پرانے کنویں کے پاس چھپتے ہیں۔ یہ لیں ریوالور—''

اندھیرے میں اس نے ایک ریولور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ریوالور لوڈ تھا، اندھیرے ہی میں، میں نے چیک کرلیا اور پتہ نہیں کیوں ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میں خود کو مضبوط محسوس کرنے لگا۔۔۔ گولیاں چلانے والے چیختے دھاڑتے اندھا دھند فائرنگ کرتے اندر بڑھے چلے آرہے تھے۔ اشرف نے میرا بازو پکڑ کر برآمدے کے ایک کونے میں چھلانگ لگائی، دوسرے ہی لمحے ہم بھاگتے ہوئے عقبی صحن عبور کر کے پچھلی دیوار کی طرف لپک رہے تھے۔ یہ دیواریں دس بارہ فٹ اونچی تھی لیکن اشرف پھرتی سے چھلانگ مار کر اس پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے ہاتھ نیچے بڑھایا۔ میرے پاؤں چکنی دیوار کی سطح پر جم نہیں رہے تھے پھر میں نے پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر چھلانگ لگائی اور دیوار پر چڑھ گیا۔ اشرف دوسری طرف کود گیا، میں اپنا جسم تول کر چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ یکا یک دو تین دھماکے ہوئے۔۔۔ ظاہر ہے کہ گولیوں کا ہدف میرے سوا اور کون ہوسکتا تھا؟

تڑتڑاتی ہوئی گولیاں میرے دائیں بائیں کچی دیوار پر پڑیں۔ اشرف گارڈ نے فوری طور پر میرا ہاتھ کھینچ کر دوسری طرف چھلانگ لگائی۔ میں کوشش کر کے دیوار کی منڈیر تک پہنچا ہی تھا کہ ہم دونوں کے وزن سے دیوار کی درجنوں اینٹیں دھپا دھپ نیچے گریں اور ہم دونوں ٹوٹی ہوئی دیوار کے دوسرے عقبی حصے میں جا گرے۔ گولیاں ایک بار پھر چلیں لیکن اب ہم دیوار کے پیچھے اینٹوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں تھے۔ اشرف اور مجھے ہلکی چوٹیں لگی تھیں، ہاتھوں اور جسم پر تھوڑی بہت خراشیں بھی آئیں تھیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ دونوں گولیوں کا ہدف بننے سے محفوظ رہے تھے۔ جلدی ہم کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور گھٹنوں گھٹنوں چلتے ہوئے ہم دیوار کے اس حصے سے دور نکل آئے۔ یہاں جھاڑیاں اور درخت تھے۔ ایک حویلی کے کھنڈرات پھیلے تھے اور یہیں کہیں قریب میں وہ کنواں یا باؤلی تھی جہاں اشرف نے حفاظت کے خیال سے چھپنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن کنویں کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ وہ کھلی جگہ پر واقع تھا اور حملہ آور حویلی کے اطراف میں چکر لگا کر آسانی سے وہاں پہنچ سکتے تھے البتہ کھنڈرات خاصے گنجان اور کشادہ تھے اور ان میں آسانی سے چھپا جاسکتا تھا۔۔۔ فائر کرنے والے حویلی کے اندر پہنچ تو چکے تھے کیونکہ فوری طور پر انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن جیسے ہی حویلی کے ملازموں کو خطرے کا مکمل ادراک ہوا، سب جاگ کر چوکس ہوگئے۔ مسلح ملازمین نے ہوائی فائرنگ شروع کردی، جن کے پاس اسلحہ نہیں تھا انہوں نے ڈنڈے اور کلہاڑیاں سنبھال لیں۔ مسلسل ہوائی فائرنگ نے حملہ آوروں کو بوکھلا دیا۔ اب وہ ہر طرف سے گھرے ہوئے تھے کیونکہ بعض ملازموں نے حویلی کی چھت پر چڑھ کر للکارتے ہوئے چیخ چیخ کر بولتے ہوئے فائرنگ شروع کردی تھی اور ان گولیوں کا رخ حویلی کے اس صحن کی طرف تھا جہاں حملہ آور موجود تھے۔ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، صرف گولیوں کے شعلے اور بارود کی بُو محسوس ہوتی تھی۔ اب کسی بھی لمحے حملہ آور ٹوٹی ہوئی دیوار پھاند کے ہم تک پہنچ سکتے تھے۔ اشرف نے فوری طور میرا بازو پکڑ لیا۔

"کھنڈر کی طرف، جلدی۔۔۔"

وہ تیز سرگوشی میں بولا اور ہم نے کھنڈر کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور جھروکوں کی آڑ اور حصار میں تھے۔ ہم ایسی جگہ تھے جہاں دن کی روشنی میں بھی ہمیں آسانی سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ اب میں نے ریوالور نکال لیا تھا۔ حویلی کی چھت سے صحن میں فائرنگ ہو رہی تھی، چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر کئی بھاگتے ہوئے لوگ کھنڈر کے قریب سے گزر کر گھومتے ہوئے حویلی کے

بیرونی حصے کی طرف گئے۔ دو گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں۔ تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی ان کی ہیڈ لائٹس چمکیں، ٹائر چرچرائے۔ چند فائر ہوئے اور پھر گاڑیاں دھڑ دھڑاتی ہوئی گوٹھ نیاز خاں جانے والی کچی سڑک پر گھوم گئیں۔ تھوڑی دیر پہلے میدانِ کارزار بننے والی حویلی میں خاموشی طاری ہوگئی۔ حملہ آوروں نے حملے سے پہلے تمام ممکنہ حالات کا جائزہ لے کر حملہ کیا تھا اور اپنے بھاگنے کیلئے راستوں کا انتخاب پہلے ہی کر لیا تھا۔۔۔ حویلی کی چھت سے ایک ملازم چیخ چیخ کر آوازیں دے رہا تھا۔

''نبی بخش، نبی بخش!۔۔۔ اوئے نبی بخش کو ڈھونڈو۔۔۔ سائیں کو اطلاع دو فوراً۔۔۔ گاڑیاں بھگاؤ ان بزدلوں کے پیچھے، جانے نہ پائیں۔۔۔''

پھر کسی نے حویلی کا جنریٹر آن کر دیا، حویلی کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ لوگ زور زور سے ہمیں آوازیں دے رہے تھے۔ اب کھنڈر میں چھپے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہم کمین گاہ سے نکل کر حویلی میں آ گئے۔ جب ہم اندھیروں سے نکل کر حویلی میں روشن مقام پر آئے تو وہاں ملازمین جمع تھے، ان کے درمیان قادر بخش زخمی اور لہولہان پڑا تھا۔ اس کی دائیں پنڈلی پر گولی لگی تھی اور وہ حویلی کے ملازموں کے نرغے میں اس بری طرح آیا تھا کہ اسے بھاگنے کی مہلت نہ مل سکی تھی، ظاہر ہے کہ ملازمین نے اسے مارا پیٹا تھا۔ اب وہ برآمدے کے فرش پر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا اور اس کے جسم سے خون رس رہا تھا۔ حویلی کے دو ایک ملازمین کو معمولی چوٹیں آئی تھیں قادر بخش کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ تو یہ تھا وہ شخص جس نے حویلی پر حملہ کرایا تھا؟۔۔۔ اس کی یہ جرأت ناقابلِ معافی تھی لیکن سوچنے کی یہ بات تھی کہ اتنا بڑا اقدام وہ خود کیسے اٹھا سکتا تھا، ظاہر ہے کہ اسے کسی کی پشت پناہی حاصل تھی اور وہ شخص وڈیرا جلال دین کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا مگر قادر بخش کے منہ سے تصدیق ضروری تھی۔

حویلی کے بعض ملازمین سائیں سردار محمد کو وقوعہ کی اطلاع دینے چلے گئے تھے اور ان کے آنے تک قادر بخش کو محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ حملہ آور اسے چھڑانے کیلئے ایک بار پھر حملہ کر دیں لہٰذا حویلی کے تین مستعد گن مین بدستور چھت پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔۔۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ قادر بخش کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر کے پوچھوں کہ تُو نے یہ جرأت کیسے کی لیکن ایک زخمی اور نہتے شخص پر ہاتھ اٹھانے کو جی نہیں چاہتا بلکہ مجھے اس پر ترس آ گیا۔

''دیکھ قادرے۔۔۔!'' میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''تُو نے اس آگ میں کود کر خود کو جلانے کی جو کوشش کی ہے اسے آسان سے آسان لفظوں میں بھی میں خودکشی ہی کہوں گا۔۔۔ تیرے ساتھ اور کون کون تھا؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں، کچھ نہیں معلوم نہیں۔۔۔'' وہ مسلسل انکار میں سر ہلاتا رہا۔ ''میری بوٹیاں بھی اُڑا دو گے تب بھی میرا یہی جواب ہوگا۔۔۔''

''سائیں کے آنے تک ہم تجھے اس قابل رکھنا چاہتے ہیں کہ تُو بول سکے''۔ ایک گن مین نے بگڑتے ہوئے تیوروں سے کہا۔ ''ورنہ تُو کیا، تیرا باپ بھی ساری رات ناک سے زمین پر لکیریں لگا کر بتانے کیلئے تیار ہو جائے۔۔۔ سمجھ گیا میری بات؟'' گن مین نے طیش میں اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' قادر بخش کراہتے ہوئے بولا۔ ''مارنا ہے تو مار دو مجھے جان سے، مگر مجھے کچھ معلوم نہیں — ہر بار میرا یہی جواب ہوگا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں، کچھ معلوم نہیں —''

ایک ملازم ٹرے میں چائے کگ تیار کر کے لے آیا۔ اس نے سب کو چائے تقسیم کی۔ میں نے اپنا مگ اٹھایا اور فرش پر بیٹھتے ہوئے قادر بخش کی طرف بڑھا دیا۔

''چائے پی لے قادرے! بات چیت سائیں کے آنے کے بعد ہوگی —''

گارڈ اشرف نے لپک کر مگ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور بگڑ کر بولا۔

''یہ آپ کی جان لینے آیا تھا اور آپ اسے چائے پیش کر رہے ہیں — عجیب آدمی ہیں آپ؟''

''نہیں اشرف —!'' میں نے اس کے ہاتھ سے مگ واپس لے لیا۔ ''بات چیت سائیں کے آنے کے بعد ہوگی، ابھی اسے چائے پینے دو —''

یہ کہہ کر میں نے مگ پھر قادر بخش کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے تذبذب کے عالم میں ایک بار اشرف کو دیکھا، ایک بار میری طرف دیکھا اور پھر لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر مگ تھام لیا، سر جھکا کر چائے پینے لگا۔ ملازموں نے حقارت سے اسے دیکھا۔ ہم اسے ملازموں کی تحویل میں چھوڑ کر چھت پر آ گئے۔ اتنے میں گوٹھ محمد بخش سے آنے والی سڑک پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹ چمکیں۔ تھوڑی دیر بعد سردار محمد کی گاڑی حویلی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ وہ خود گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا آیا تھا اور نہایت غیض و غضب کے عالم میں تھا۔ حویلی کے تین چار ملازمین اس کے ساتھ تھے جنہوں نے بھاری اسلحہ اٹھا رکھا تھا۔ سردار محمد کی حالت اس غضبناک شیر جیسی تھی جس کی عدم موجودگی میں اس کی کچھار پر حملہ کیا گیا ہو۔

وہ تیزی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر آیا اور آتے ہی اس نے چنگھاڑ کر کہا۔

''جنگی کدھر ہے —!''

''میں بالکل ٹھیک ہوں سائیں —!''

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مجھے زندہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آئی مگر چہرے کے عضلات اور شعلے بدستور نمایاں رہے۔ شعلے بھڑکاتی آنکھیں بدستور اس کی غضبناکی کا اعلان کر رہی تھیں۔

''اس کتے کو میرے سامنے لاؤ —''

وہ قادر بخش کی طرف اشارہ کر کے اس کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا جو اسے دیکھتے ہی ایک ملازم نے لا کر برآمدے میں رکھ دی تھی۔ میری حفاظت پر مامور دو گن مین اسے ڈنڈا ڈولی کر کے سردار محمد کے سامنے لے آئے۔ وڈیرے کے بگڑے ہوئے تیور دیکھتے ہی قادر بخش کے چہرے پر دہشت نظر آنے لگی تھی۔ وہ بری طرح لرز رہا تھا اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

''سائیں مجھے کچھ معلوم نہیں — مجھے کچھ معلوم نہیں''۔

محافظوں نے اسے فرش پر کرسی کے نزدیک لا کر پٹخ دیا۔ ایک محافظ بولا۔

''سائیں، جب سے اسے پکڑا ہے یہی الفاظ بول رہا ہے --- اسے بہت مارا پیٹا ہے مگر کم بخت بڑا ڈھیٹ ہے، حقیقت نہیں کھولتا---''

''کھولے گا حقیقت---'' سردار محمد نے شعلہ بار نگاہوں سے قادر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ جانتا ہے کہ جلال دین کی طرح میرے پاس بھی کتے ہیں اور اسے معلوم ہے کہ کتوں کا پٹہ کھل جائے تو وہ اپنے شکار کا کیا حال کرتے ہیں''۔

قادر بخش سسکتے ہوئے بولا۔ ''سائیں! میں سچ کہتا ہوں، مجھے کچھ نہیں معلوم---''

سردار محمد نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا، بولا۔ ''آدھی رات سے زیادہ ٹائم گزر چکا ہے، مجھے جگا کر میری نیند خراب کی گئی ہے۔ میں تجھ سے یہ پوچھنے نہیں آیا ہوں کہ تجھے کچھ معلوم ہے یا نہیں ہے، یہ کام میرے آدمیوں کا ہے۔ میں صرف جو بات پوچھتا ہوں اس کا جواب دے----''

قادر بخش نے کچھ کہنا چاہا مگر سردار محمد نے بیٹھے بیٹھے اسے اتنی زور سے لات رسید کہ وہ الٹ کر دھڑام سے فرش پر جا گرا۔ اس کی نکسیر پھوٹ گئی، ہونٹ پھٹ گئے۔ وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چلایا۔

''سائیں، رحم--- سائیں، رحم---''

سردار محمد نے گردن گھما کر اشرف گارڈ کی طرف دیکھا، غالباً یہ کوئی ایسا اشارہ تھا جسے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھا۔ دوسرے ہی لمحے اشرف نے اپنے لباس کی تہوں سے ایک بڑا چاقو نکال لیا۔ ایک جھٹکے سے یہ چمکدار پھل اس کی پنڈلی میں اس جگہ گھونپ دیا جہاں پہلے ہی سے گولی لگی تھی۔ قادر بخش ماہی بے آب کی طرح تڑپا، اس کی چیخیں رات کے سناٹے میں چاروں طرف گونجنے لگیں۔ سردار محمد دانت پیستے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''یہ گولی نکالنے کا پہلا کمانڈو نسخہ ہے، ایسے پانچ نسخے استعمال کرنے کے بعد گولی باہر نکل آئے گی---''

''نہیں، نہیں---'' قادر بخش سخت تکلیف کے عالم میں کراہا۔ ''خدا کیلئے نہیں--- میرا کوئی قصور نہیں، نمبردار نے مجھے مجبور کیا تھا۔ میں خود سائیں جلال دین کے پاس نہیں گیا تھا، سائیں سے نمبردار نے بات کی تھی۔ اسی نے آدمیوں کا بندوبست کیا تھا''۔

''گاڑیاں کس کی تھیں---؟''

''گاڑیوں کا بندوبست حاکم نیازو نے کیا تھا''۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''حاکم نیازو؟---'' میرے ذہن میں جھماکہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حاکم نیازو زندہ تھا اور گوٹھ صادق علی میں موجود تھا۔ مجھے وہ لمحہ یاد آیا جب میں نے اس پر حملہ کیا تھا اور اسے بچ کر نکل بھاگا تھا۔ مجھے نہ شرافت علی اور نہ سردار محمد کسی نے بھی اس کی بابت کچھ نہیں بتایا تھا حتیٰ کہ میرے رشتے کے ماموں سبزل نے بھی اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ میری یادداشتوں کے ایسے نہاں خانے میں موجود تھا جہاں بہت اندھیرا تھا اور خاصی گرد جم چکی تھی--- وہ زندہ ہوگا اور میرے بارے میں پوری طرح باخبر ہوگا، اس کے بارے میں مَیں نے سوچا تک نہیں تھا اور اب وہ عفریت کی طرح ماضی کی گپھاؤں سے نکل کر حال کی روشنی میں آ گیا تھا--- اس کا نام سن کر ایک لمحے کیلئے سردار محمد کی پیشانی کے بل بھی کچھ گہرے ہو گئے تھے لیکن اس میں اور مجھ میں فرق یہ تھا کہ وہ ایک وڈیرا تھا اور نیاز محمد عرف حاکم نیازو کی حیثیت اس کے سامنے ایک معمولی ملازم سے زیادہ

نہیں تھی، جلد ہی اس آنکھوں میں پھر شعلے دہکنے لگے۔

''وہ کبڑا، دو ٹکے کا ملازم—'' وہ حقارت سے بولا۔ ''خبردار، آئندہ میرے سامنے اس کے نام کے ساتھ حاکم نہ لگانا۔ وہ میرے لیے پتھر کے اس ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جسے میں ٹھوکر مارنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہوں— تُو خوش نصیب ہے کہ میں نے تجھے لات ماری ہے، گوٹھ صادق علی کے ایک شخص کو یہ اعزاز تو حاصل ہوا کہ سردار محمد نے خود اسے لات رسید کی۔ تُو بڑا خوش نصیب ہے— تیرے ساتھ اور کون کون تھا؟''

''چودہ آدمی تھے میرے علاوہ—'' قادر بخش کراہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی پنڈلی پکڑ کر درد سے دہرا ہوتے ہوئے بولا۔ ''خدا کیلئے، سائیں! مجھے پانی پلا دیں۔ میرے حلق میں کانٹے اُگ آئے ہیں''۔

''پانی تجھے ضرور ملے گا—'' سردار محمد سفاکی سے مسکرایا۔ ''لیکن یہ انگریزی پانی ہوگا۔ اسے برانڈی کہتے ہیں۔ اس وقت تجھے اسی چیز کی ضرورت ہے—''

پھر وہ ایک ملازم کی طرف مڑا، دوسرے ہی لمحے ملازم برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں سنہری لیبل میں لپٹی ہوئی سیاہ رنگ کی ایک بوتل تھی، دوسرا ملازم سردار محمد کے اشارے پر گلاس لے آیا اور محلول بوتل سے گلاس میں منتقل ہونے لگا۔

''ہم اپنی بوتل سے اپنے کتوں اور غلاموں کو زہر بھی پلانا پسند نہیں کرتے''۔ وہ مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''لیکن تیری حالت ایسی ہے کہ تجھے اس زہر کی ضرورت ہے، کیونکہ میں نے تجھ سے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں—''

گلاس میں برانڈی انڈیلنے والے ملازم نے گلاس قادر بخش کو پکڑا دیا۔ قادر بخش کے ہاتھ کانپ رہے تھے، وہ گلاس بمشکل سنبھال سکا۔ آنکھیں موند کر گلاس اس نے منہ سے لگا لیا اور پھر گلاس ملازم کو پکڑاتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''حملے کا منصوبہ کس نے بنایا تھا؟'' سردار محمد بھوئیں سکوڑ کر بولا۔

''حاحاکم— نن نن، نہیں— نیاز— نیاز محمد نے—'' قادر بخش ہکلاتے ہوئے بولا۔

''تیرے سامنے؟'' سردار محمد نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں—'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''منصوبہ نیاز محمد نے اپنے ڈیرے پر بنایا تھا، اس کے آدمی مجھے گھر سے لینے آئے تھے''۔

''پروگرام کیا تھا؟'' اب کے سردار محمد نے قدرے آہستہ لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں نبی بخش جنگی کو اغوا کر کے گوٹھ صادق علی میں سائیں کی حویلی میں پہنچانا تھا''۔ وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ''ایک گاڑی میں حاحاکم— نہیں، نن نہیں— نیاز بھی موجود تھا۔ وہ گاڑی میں باہر بیٹھا تھا''۔

''ٹھیک ہے—'' سردار محمد اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے جھک کر اپنے معتمد ملازموں سے کچھ بات کی اور میری طرف گھوم کر آیا۔ ''میں نے اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا ہے کہ انہیں کس وقت کیا کرنا ہے— اب آرام کرو۔ یہ کھیل ہوتے رہتے ہیں، کوئی فکر کی بات نہیں—''

''سائیں—!'' قادر بخش لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''سائیں، مجھے اپنے ساتھ لے جائیں، راستے میں کہیں چھوڑ دیں۔ یہاں آپ

کے آدمی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

سردار محمد دانت پیس کر مسکرایا، شعلہ بار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا۔

"کوئی شخص تجھے ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن جب تک جلال دین سے میری بات نہیں ہوتی تو یہیں رہے گا۔۔۔ بھاگنے کی کوشش کرے گا تو اپنی موت کا خود ذمہ دار ہوگا"۔

اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔۔۔

O

میں اشرف کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا لیکن رات اتنی جا چکی تھی کہ نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میرے دونوں محافظ بھی کمرے میں آ گئے اور ہم باتیں کرنے لگے۔ جب حملہ ہوا تو میرے محافظ برآمدے میں موجود نہیں تھے، وہ انتخابی دفتر میں کام کرتے کرتے تھک کر اونگھنے لگے تھے، اصولاً ان کی ڈیوٹی میرے کمرے سے باہر برآمدے میں تھی۔ حملہ اتنا اچانک ہوا تھا کہ کسی کو سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور حملہ آوروں نے حویلی کے ملازمین کی اسی حواس باختگی سے فائدہ اٹھا کر پیش قدمی کر لی تھی لیکن جب ملازمین اپنے ہوش و حواس بحال کرتے ہوئے حویلی کی چھت پر چڑھ گئے تو وہاں انہیں پوزیشنیں لینے میں آسانی ہوگئی اور حملہ آور اُن کے نرغے میں آ گئے۔۔۔ باتیں کرتے کرتے سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا، مرغ بانگ دینے لگے رات بھر جاگتے رہنے اور مسلسل چائے پیتے رہنے سے منہ کا ذائقہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ مجھے جمائیاں آنے لگیں تو میں بستر پر لیٹ گیا اور جانے کس وقت نیند آ گئی۔ پھر جب میں اٹھا تو دھوپ الیکشن حویلی کی منڈیروں سے نیچے آ چکی تھی، چاروں طرف چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی، ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بستر سے اُٹھ بیٹھا، باہر بیٹھے ہوئے دونوں محافظ اندر آ گئے۔

"تھوڑی دیر پہلے سائیں چکر لگا چکے ہیں۔۔۔" ایک محافظ نے بتایا۔ "آپ سو رہے تھے، انہوں نے آپ کو جگانے سے منع کر دیا۔ آج آپ کو کہیں باہر نہیں جانا ہے، یہیں حویلی میں رہ کر سائیں کا انتظار کرنا ہے۔۔۔ اَب ناشتہ کر لیں"۔

میں ہاتھ منہ دھو کر بیرونی کمرے میں بنے ہوئے الیکشن آفس میں آ گیا اور یہیں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ پھر مجھے قادر بخش کا خیال آیا لیکن پوچھنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا کہ صبح ایک حکیم نے اس کی مرہم پٹی کی تھی اور اب وہ الیکشن حویلی کے اندرونی کمرے میں قید تھا، کمرے کے باہر ایک مسلح ملازم پہرہ دے رہا ہے۔۔۔ میرے لیے قادر بخش کی قید کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ وڈیروں کی اپنی جیلیں تھیں، اپنے قانون تھے، اپنی سزائیں تھیں، اپنی مرضی تھی، یہ وڈیرا شاہی نظام کی چھتری تھی جس کے نیچے ہزاروں مسائل کے جرثومے پنپ رہے تھے۔ لاکھوں اَن کہی داستانیں تڑپ رہی تھیں۔ اس چھتری کے باہر متمدن دنیا کی دھوپ دیکھنے والوں کی آنکھیں اُن مناظر کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھیں جنہیں ہماری نظریں دن رات دیکھتی تھیں۔ ایک وہ دنیا تھی جہاں تھانے، کچہریاں اور عدالتیں تھیں جج اور وکیل تھے۔ سزا دینے کا ایک قانونی پروسیس تھا اور ایک یہ دنیا تھی جہاں جزا اور سزا کا اپنا ایک علیحدہ نظام تھا اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا، باغی آوازوں کا حشر یہ ہوتا تھا کہ انہیں حلق میں گھونٹ دیا جاتا تھا۔

O

سردار محمد کے کاغذات نامزدگی جمع ہو چکے تھے اور اس کے رنگین پوسٹر، بینر اور ہورڈنگ کراچی سے تیار ہو کر پہنچ چکے تھے۔ ملازمین انہیں سنبھالنے سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔۔۔ کن کن جگہوں پر ہورڈنگ لگیں گے، کہاں کہاں پوسٹر لگیں گے۔ کہاں کہاں بینرز لگنے باقی ہیں، ان تمام باتوں پر غور ہو رہا تھا۔ اشرف لکھنے پڑھنے کے کام پر مامور کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ گریجویٹ تھا اور ان تمام کاموں کو اچھی طرح سمجھتا تھا جن کا تعلق سردار محمد کی الیکشن کمپین سے تھا۔ انتخابی جلسوں اور کمپین کی تفصیلات میرے پاس رجسٹر میں موجود تھیں۔ پہلا انتخابی جلسہ گوٹھ محمد بخش کے ہاکی گراؤنڈ میں ہونا تھا۔ یہ ہاکی گراؤنڈ پہلے اکھاڑہ ہوا کرتا تھا، بعد میں فٹ بال اور ہاکی گراؤنڈ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک پارٹی اس گراؤنڈ کو جلسہ گاہ بنانے کیلئے صفائی اور پنڈال تیار کرنے میں مصروف تھی۔ میں ایک نظر کام کا جائزہ لینے کیلئے وہاں جانا چاہتا تھا لیکن میرے دونوں محافظوں کے علاوہ اشرف نے بھی بتایا کہ سائیں نے انتخابی جلسے سے پہلے مجھے حویلی سے باہر نکلنے سے منع کر دیا ہے اور اس سلسلے میں اسے الیکشن حویلی میں آ کر مجھے خصوصی ہدایت دینی تھیں۔۔۔ حویلی میں کھانے پینے کا وسیع پیمانے پر وافر بندوبست تھا سردار محمد کھلے دل سے خرچ کر رہا تھا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ چائے کی پیالیاں گردش کرتی تھیں اور کھانے پینے کے سامان کی فراوانی تھی۔ میں دن بھر الیکشن آفس میں کاموں کی نگرانی کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی بٹاتا رہا۔ پھر کھانا ہم سب نے فرش پر بیٹھ کر کھایا اور ابھی چائے کا دور چل ہی رہا تھا کہ سردار محمد پہنچ گیا۔ وہ خلاف توقع بڑا ہشاش بشاش تھا۔ ہم سب اس کے استقبال کے لئے اُٹھ ہی رہے تھے کہ وہ کمرے میں آ گیا۔ ایک ملازم نے اس کیلئے کرسی لا کر رکھ دی۔

''جلال دین سے صبح میری بات ہوئی ہے۔۔۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس نے اس واقعے کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ قادر بخش نے اپنا ذاتی انتقام لینے کے لئے حویلی کے چند لوگوں کے ساتھ حملہ کیا ہوگا۔۔۔ نیازو کا بھی اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے البتہ وہ قادر بخش کو واپس مانگ رہا ہے''۔

''آپ نے کیا جواب دیا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''کیا جواب دینا تھا۔۔۔؟'' سردار محمد عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''چھوٹے موٹے لوگ ہمارا مسئلہ نہیں ہوتے۔۔۔ قادر بخش کو تو میں چھوڑ دوں گا لیکن اسے اپنے قدموں سے لنگڑاتے ہوئے چل کر جانا ہوگا۔۔۔ مانگنے کو تو تمہیں بھی مانگ رہا ہے جنگی دوست!''

''مجھے۔۔۔؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن اس معاملے میں تو آپ پہلے بھی جواب دے چکے ہیں۔۔۔''

''پہلے میرا جواب اُس کی سمجھ میں نہیں آیا''۔ وہ بولا۔ ''لیکن آج صبح اسے میری بات کی سمجھ آ گئی ہے۔ ہمارے درمیان ایک اصولی بات بھی طے پا گئی ہے کہ ہم الیکشن کمپین کے دوران ایک دوسرے کے آدمی نہ تو اغوا کریں گے، نہ ان پر حملہ کروائیں گے۔۔۔''

سردار محمد کا ایک بوڑھا معتمد ملازم دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

''سائیں! یہ بات میری کھوپڑی میں نہیں بیٹھتی۔۔۔ میں جلال دین کو جانتا ہوں اس کا اصول یہ ہے کہ کسی اصول کی پروا نہ کرو''۔

سردار محمد نے تائیدی انداز میں سر ہلایا، بولا۔ ''یہ بات میں بھی جانتا ہوں لیکن اب میں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا ہے اس لیے سیاست کی سب چالیں میری سمجھ میں آنے لگی ہیں۔۔۔ تم فکر نہ کرو اسے میں سنبھال لوں گا۔۔۔ قادر بخش کو دو تھپڑ مار کر باہر پھینک آؤ''۔

اشرف قریب کھڑا تھا، کسمساتے ہوئے بولا۔ ''اسے فی الحال چھوڑنا ٹھیک نہیں سائیں! یہ ہمارے خلاف فضا کو زہریلا کرے گا۔۔۔''

''ہشت۔۔۔'' سردار محمد نے بھڑک کر بڑی حقارت سے کہا۔ ''باز کے پنجے سے نکلنے والی بٹیر کو اچھی طرح پتہ ہوتا ہے کہ باز کے پنجے کتنے طاقتور ہوتے ہیں۔۔۔''

''تو پھر اسے تھپڑ مارنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟''

اشرف کے منہ سے نکل گیا۔۔۔ سردار محمد نے تیزی سے گردن گھمائی اور شعلہ بار نگاہوں سے اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''شرافت علی کی سفارش پر میں نے تمہیں اعتماد والی ملازمت دی ہے۔ یہ بولنے والی ملازمت نہیں ہے، تمہیں اس وقت بولنا ہے جب میں تمہاری آواز سننے کی خواہش ظاہر کروں۔۔۔ بات سمجھ میں آگئی کہ نہیں؟''

''ٹھیک ہے سر۔۔۔ سائیں!'' اشرف گڑبڑا کر بولا۔ ''آئی ایم سوری، میرا مطلب یہ تھا کہ۔۔۔''

سردار محمد مسکرایا، یہ عجیب طرح کی مسکراہٹ تھی پھر کہنے لگا۔

''محمد اشرف بی اے پاس، تمہارے پاس کاغذ کی ڈگری ہے اور اس ڈگری کے گھمنڈ میں تم بولتے ہو لیکن ڈگری سے آگے بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں جن کا تمہیں علم نہیں اس لیے ان پر مت بولو۔۔۔ آہستہ آہستہ تم میری طبیعت کو سمجھ جاؤ گے، جلدی مت کرو۔۔۔ ٹھیک؟''

''یس سر، سائیں۔۔۔!'' اشرف کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔

''ہاں، تم جاننا چاہتے تھے کہ جاتے وقت قادر بخش کو تھپڑ مارنا کیوں ضروری ہے؟'' وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔ ''یہ تھپڑ نہیں، ٹکٹ کو پنچ کرنا ہے۔ مسافر کی منزل آتی ہے تو گیٹ کیپر اس کا ٹکٹ یا تو لے لیتا ہے یا پنچ کر دیتا ہے، بات کچھ سمجھ میں آرہی ہے۔۔۔؟''

''یس سر، یس سر۔۔۔'' اشرف پسینہ پونچھنے لگا۔

''تو بس۔۔۔ اب یہ کام تم کرو گے''۔ سردار محمد نے کہا۔ ''قادر بخش کے کمرے کا دروازہ کھولو۔ اسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کرو، گھسیٹ کر حویلی کے باہر لے جاؤ اور تھپڑ اس کے منہ پر رسید کرو لیکن میرے جانے کے بعد۔۔۔ ٹھیک؟''

''یس سر۔۔۔'' اشرف سر سے پاؤں تک پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

سردار محمد اُٹھ کھڑا ہوا، ٹہل ٹہل کر کراچی سے آیا ہوا سامان دیکھنے لگا۔ بعض پوسٹرز کی چھپائی اچھی نہیں تھی جنہیں چھانٹ کر الگ رکھ دیا گیا تھا، بعض کی عبارتیں اس نے مسترد کر دیں۔ پھر اشرف کی طرف مڑ کر بولا۔

''عبارتیں خود سوچو، خود بناؤ اور فٹافٹ ایک آدمی بھیج دو تاکہ وہ اپنے ساتھ چھپوا کر لیتا آئے۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے''۔

اس مرتبہ اس کا منیجر قاسم بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے قاسم کو کچھ ہدایات دیں اور اسے ہمارے پاس چھوڑ کر خود اپنے گن مینوں کے ساتھ جانے کیلئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ایک زینہ طے کر کے گھوما، میری طرف دیکھ کر اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا اور آہستہ سے بولا۔

''ابھی دو تین دن تم حویلی سے باہر مت نکلو۔ میں تمہیں دھماکے کی طرح اپنے پنڈال میں لانا چاہتا ہوں، کل اس موضوع پر بات کریں

گے --- شاید ادا شرافت علی بھی آج پہنچ جائے''۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا گاڑی کے قریب پہنچ کر بولا۔ ''ماسٹر علی احمد شہباز نے میری الیکشن کمپین کیلئے بہت سا کام تیار کر رکھا ہے، وہ تمہیں کام سمجھا دے گا۔ آج کسی وقت وہ یہاں پہنچ جائے گا۔ پھر الیکشن تک اس کا ڈیرہ یہیں رہے گا--- میں قاسم کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ جہاں پیسوں کی ضرورت ہو یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو پریشانی نہ ہو۔ اسے میں نے تمہارے علاوہ ایک ایک شخص کے بارے میں ہدایات دے رکھی ہیں۔ یہ سب کو جانتا ہے، تمہیں بھی --- انشاء اللہ کسی چیز کی تکلیف نہیں ہوگی''۔

یہ کہہ کر سردار محمد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنے گن مینوں کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد قاسم نے ایک ایک کو ہدایات دینی شروع کیں --- قاسم جان درمیانے قد اور پختہ عمر کا ایک گٹھیلے جسم کا آدمی تھا۔ اس کی ایک آنکھ کسی حادثے میں ضائع ہوگئی تھی لہٰذا وہ دن ہو یا رات، ہر وقت آنکھوں پر تاریک شیشوں والی عینک لگائے رکھتا تھا۔ وہ سردار محمد کی جائیداد کا منتظم تھا اور حاکم نیازو کی طرح اس کی بھی الگ شان تھی۔ حاکم نیازو نیام میں منقش دستے والا خنجر رکھتا تھا، قاسم جان واسکٹ کے نیچے پستول کی چرمی پیٹی لٹکائے رکھتا تھا لیکن دونوں کا اندازِ گفتگو تقریباً ایک جیسا تھا۔ دیگر ملازموں کو ہدایات دینے کے بعد وہ میرے کمرے میں آکر اشرف کی چارپائی پر بیٹھ گیا، بولا۔

''نبی بخش جنگی! تم شاید مجھ سے زیادہ نہیں ملے لیکن میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب تمہاری مسیں اُگ رہی تھیں۔ مجھے وہ واقعہ بھی معلوم ہے جب جلال دین نے کسی بات پر ناراض ہو کر تمہیں قید کر لیا تھا--- بہرحال، اب تم ہمارے کیمپ میں آچکے ہو۔ دو باتوں کا خیال رکھنا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کبھی لالچ میں نہ آنا، دوسری بات یہ ہے کہ کبھی غداری نہ کرنا---''

مجھے غصہ آگیا۔ آخر یہ شخص کون ہوتا ہے مجھے نصیحتیں کرنے والا؟--- جب میرے معاملات کا تعلق براہِ راست سردار محمد یا شرافت علی سے تھا تو درمیان میں قاسم جان کہاں سے آگیا--- یہ شخص مجھ پر مسلط ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے قدرے سختی سے کہا۔

''سائیں وڈیرے نے مجھے تمام باتیں سمجھا دی ہیں، میرا خیال ہے اب کوئی بات باقی نہیں ہے''۔

قاسم جان کی مونچھیں پھڑکنے لگیں، بولا۔ ''مالکوں نے کام تو ہم سے لینا ہوتا ہے اس لیے جواب دہ بھی ہم ہیں۔ ان کا اپنا طریقہ ہے ہمارا اپنا طریقہ ہے--- ویسے میں نے سنا ہے کہ شہر کراچی نے گوٹھ صادق علی کے نبی بخش جنگی کو تبدیل کر دیا ہے۔ پہلے وہ مٹی کا ڈھیلا تھا اور اب کنکریٹ اور فولاد کا آدمی بن گیا ہے، نظر بھی آتا ہے کہ واقعی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں---''

مجھے قاسم جان کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں مگر سردار محمد نے ساری انتظامی ذمہ داری دیگر امور سمیت اس کے سپرد کر رکھی تھیں لہٰذا ناگواری کے شدید احساس کے باوجود میں اس کی باتوں کے جواب میں قدرے تلخ اور بے دلی سے ہوں، ہاں کرتا رہا۔ خاصی دیر تک وہ میرے کان کھاتا رہا۔ پھر اشرف کو ہدایات دینے لگا، وہاں سے فارغ ہوا تو دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر الیکشن حویلی کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ آخر اوپری منزل کا ایک کمرہ اس نے اپنے عارضی ڈیرے کیلئے منتخب کیا۔ ملازمین نے اس کمرے میں بڑا سا خوبصورت قالین بچھا کر گاؤ تکیے رکھ دیئے۔ ان تیاریوں کے دوران ایک ملازم نے میرے کمرے میں کھانا لگا دیا۔ میں اشرف اور دونوں محافظوں کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ قاسم نے اپنے حواریوں سمیت اوپری منزل پر ڈیرہ جما لیا۔ وہ پینے پلانے والا آدمی تھا اسی لیے اس کے دائیں بائیں اسی قبیل کے ملازم تھے۔ ہم کھانے سے فارغ

ہوئے تو ماسٹر علی احمد شہباز اپنے ساتھیوں سمیت پہنچ گیا۔ وہ گوٹھ صادق علی میں سکول ماسٹر تھا لیکن اپنی شاعری کی وجہ سے پورے علاقے میں مشہور تھا۔ وہ بلند آواز میں لہک لہک کر اپنا کلام پڑھتا تھا۔ دبلا پتلا، لمبے قد کا پٹے دار بالوں والا ماسٹر شہباز ایک طرح سے عوامی شاعر تھا اور اس کی شاعری زیادہ تر عشق و عاشقی کے موضوعات پر محیط تھی۔ اس نے بعض لوک گیتوں کو بھی اپنی طرف سے گرہیں لگا کر اور اشعار کا اضافہ کر کے ان گیتوں کو مزید مقبول کر دیا تھا۔ وہ آنکھوں میں سرمہ لگاتا تھا اور گہرے رنگوں کے ڈھیلے ڈھالے کڑھے ہوئے کرتے پہنتا تھا، کاندھوں پر ایک مخصوص چادر ہوتی تھی۔ جب وہ اپنے بازو لہرا لہرا کر اسٹیج پر اپنا کلام پڑھتا تھا تو لوگوں میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ دلیری کے ساتھ سردار محمد کے کیمپ میں آ گیا تھا جبکہ وہ گوٹھ صادق علی میں سکول ماسٹر تھا اور گوٹھ صادق علی کے کسی بھی آدمی کا گوٹھ محمد بخش میں آ کر سردار محمد کا حمایتی بن جانا ایک کھلی جنگ کا اعلان تھا۔ یہ جنگ اس نے کیوں اور کیسے قبول کر لی جبکہ اس کے ماں باپ اور بیوی بچے گوٹھ صادق علی میں رہائش پذیر تھے؟ — یہی سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں اسے کئی مرتبہ مل چکا تھا۔ کئی بیٹھکوں میں اور کئی اوطاقوں میں اس کا کلام سن چکا تھا لیکن اتنے عرصے بعد اسے الیکشن حویلی میں ملنے کا یہ تجربہ میرے لیے انوکھا تھا — مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کیلئے چونکا۔ پھر بڑی گرمجوشی سے گلے ملا، کہنے لگا۔

''جنگی! میں نے سنا تھا کہ سائیں سردار محمد نے اپنی الیکشن حویلی میں ایک بم چھپا رکھا ہے۔ تجھے دیکھ کر یقین آ گیا کہ وہ بم تیرے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، خوب قد کاٹھ نکالا ہے تم نے — شاباشے بھئی شاباشے —''

اس کے ساتھیوں میں گلزار بھی شامل تھا، گلزار گاتا بہت اچھا تھا۔ وہ بھی گوٹھ صادق علی کا رہائشی تھا — جو سوال مجھے بڑی دیر سے پریشان کر رہا تھا آخر وہ میری زبان پر آ ہی گیا۔ میں نے ماسٹر شہباز کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''اتنی ہمت آپ نے کیسے کر لی ماسٹر شہباز، یہ تو جلال دین کے ساتھ کھلی جنگ کا اعلان ہے —؟''

شہباز مسکرایا، پھر اطمینان سے بولا۔ ''یہ دو وڈیروں کی نہیں، وہ نظریوں کی جنگ ہے۔ جلال دین اس اصول پر الیکشن لڑ رہا ہے کہ حکومت میں آنے کا حق اس کے خاندان کو حاصل ہے، سردار محمد یہ اعلان لے کر اٹھا ہے کہ عوام پر حکمرانی کا حق ان لوگوں کو حاصل ہونا چاہیے جو عوام کی نمائندگی کی صلاحیت رکھتے ہوں — میرے سامنے جلال دین بھی تھا، سردار سائیں بھی تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اور میرے ساتھیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں سردار سائیں کو کامیاب بنانا چاہئے اس لیے میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے بیوی، بچے اور ماں باپ پہلے ہی گوٹھ محمد بخش میں بھیج دیئے تھے۔ سائیں نے ہمیں مکان بھی دیئے، زمین بھی دی۔ اسکول ماسٹری میں نے چھوڑ دی ہے اور اب الیکشن کا رزلٹ آنے تک ہم لوگ اس حویلی میں رہیں گے — تم اپنی سناؤ جنگی پیارے! ہم تو سر پر کفن باندھ کر میدان میں اترے ہیں —''

میں نے جواباً کہا۔ ''تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ آپ کفن باندھ کر میدان میں اترے ہیں اور مجھے باندھا کفن باندھا گیا ہے، اب اس کی لاج نبھانی ہے —''

''نبھائیں گے —'' ماسٹر شہباز میرے کاندھے پر تھپکی دے کر بولا۔ ''اس الیکشن میں ایسی ایسی آگ لگانے والی نظمیں پڑھوں گا کہ دنیا دنگ رہ جائے گی۔ جنہوں نے آج تک میری زبان سے پھول جھڑتے دیکھے تھے، اب وہ اس زبان سے شعلے نکلتے دیکھیں گے —

بڑی آگ بھری ہے میرے اندر نبی بخش جنگی! امیدانِ کارزار گرم ہونے دے پھر دیکھنا میرے جلوے، میں اس پورے استحصالی نظام کے خلاف صدائے احتجاج بن کر گلی کوچوں میں پھیل جاؤں گا"۔

میں نے کہنا چاہا کہ ماسٹر علی احمد شہباز! تم جس نظام کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے ہو وہ تو سینکڑوں مربع میل تک پھیلا ہوا ہے اس کی زد میں کئی گوٹھ، کئی قصبے کئی شہر آتے ہیں جہاں کھڑے ہو کر تم یہ بات کر رہے ہو وہاں بھی یہی نظام قائم ہے۔اس حویلی میں کوئی نظام بدل تو نہیں گیا۔ یہاں بھی وہی ذہنیت، وہی سوچ وہی طور طریقے ہیں جو تم نے گوٹھ صادق علی کے وڈیروں میں دیکھے ہیں۔ یہاں کی مٹی اور پانی اسی مٹی اور پانی کا ایک حصہ ہے مگر میں یہ سب کچھ اس وقت نہ کہہ سکا۔شاعر لوگ بالخصوص ماسٹر شہباز جیسے لوگ بنیادی طور پر سادہ دل اور معصوم لوگ ہیں۔انہیں حقائق سے اتفاق بھی ہوتا ہے تو وہ ہر بات کو شاعرانہ عینک سے دیکھتے ہیں، خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں کے بادل ان کے دماغ کو ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ایسے لوگ خوش فہم اور اُمید پرست ہوتے ہیں لیکن امید پرستی بھی دنیا کی تقدیر نہیں بدلتی، اس کیلئے ہاتھ پاؤں چلانا ضروری ہے۔ یہ دنیا فعال، متحرک اور سرگرم لوگ مانگتی ہے۔اس بھٹی میں نبی بخش جیسے ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے۔

O

ماسٹر شہباز اور اس کے ساتھیوں کی آمد کی خبر سن کر قاسم جھومتا جھومتا اوپری منزل سے نیچے آ گیا۔اس وقت اس کے ایک ہاتھ میں بوتل تھی، لہک کر بولا۔

"دیکھ، ماسٹر شہباز! تیری خبر پاتے ہی مَیں خود اتر آیا ہوں، تجھے اوپر نہیں بلوایا۔اب تُو میرے ساتھ اوپر جائے گا اور میرے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں تیرا ڈیرہ لگے گا۔آج رات کو جشن ہوگا، جشن ــــ"

ماسٹر شہباز اپنے مخصوص انداز میں ہنسا، کہنے لگا۔"قاسم ادا! تُو میرا بڑا بھائی ہے اور جب میں تیرے ساتھ بیٹھ کر بوتل نہیں پی سکتا تو جشن میں حصہ کیسے لے سکتا ہوں؟ــــ بس تیری دعائیں چاہئیں۔ بوتلیں بھیجنی ہیں تو میرے کمرے میں بھیج اور چل کر دکھا کہ تیری منجری میں ہماری رہائش کا کیا انتظام ہوا ہے؟"

ماسٹر شہباز، قاسم سے خاصا بے تکلف معلوم ہوتا تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے قہقہے لگاتے، جھومتے جھامتے اپنے ساتھیوں سمیت اوپر چلے گئے ــــ خاصی رات بیت چکی تھی۔ اشرف میرے کمرے میں آ چکا تھا اور حسبِ معمول دیوار کی طرف کروٹ بدلے ٹرانسسٹر سن رہا تھا، دونوں محافظ برآمدے کی دیوار سے گاؤ تکیے لگائے اپنی بندوقیں پاس رکھے اونگھنے لگے تھے مگر مجھے اب تک نیند نہیں آ رہی تھی۔ اشرف نے میری بے چینی اور بے خوابی کی الجھن کو محسوس کر کے ٹرانسسٹر بند کر دیا اور کہنے لگا۔

"ایک بات آپ سے کرنی تھی مگر ڈرتا ہوں کہ یہ بات باہر نہ نکلے ــــ میں بڑی پریشانی میں ہوں"۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ــــ کہنے لگا۔

"مجھے آپ ایک اچھے اور ہمدرد انسان نظر آتے ہیں اس لیے اپنا مسئلہ صرف آپ سے بیان کر رہا ہوں"۔

''بولو۔۔۔؟''میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔''شام کو جب میں نے قادر بخش کو باہر بھگانے کیلئے دروازہ کھولا تو وہ کمرے میں نہیں تھا، پچھلی طرف کی کھڑکی کھول کر نکل گیا تھا۔۔۔''

''اوہ۔۔۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ قادر بخش کو اسی طرح رخصت ہونا تھا جس طرح وڈیرے نے کہا تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔ قادر بخش کے از خود فرار ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یہ کھیل کوئی اور صورت اختیار کرنے والا تھا۔

''کسی اور کو اس بات کی خبر ہوئی؟''میں نے فوراً پوچھا۔

''نہیں۔۔۔'' اشرف نے کہا۔''میں نے کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے دی بلکہ اسی وقت یہ مشہور کر دیا کہ میں قادر بخش کو مار پیٹ کر حویلی سے باہر دھکیل آیا ہوں۔ کسی نے تصدیق نہیں چاہی، ایسے غافل لوگ ہیں یہ۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ حرام خوروں کا ایک ٹولہ ہے جو الیکشن کے نام پر سائیں وڈیرے کی دولت پر عیش کرنے اور موج اُڑانے کیلئے حویلی میں جمع ہوگیا ہے، دن بھر میں ہزاروں روپے پانی کی طرح بہائے جارہے ہیں۔۔۔''

''دھیرج اشرف خان، دھیرج۔۔۔''میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''اکثر وڈیرے اپنی دولت اسی طرح اُڑانے کے عادی ہوتے ہیں اور ویسے بھی ان کے پاس زمین، جائیداد اور باغات کی کمی نہیں ہوتی۔ اگر ایک الیکشن میں زمین کے ایک ٹکڑے کی آمدن خرچ ہوجاتی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن تم ان معاملات میں اپنی ٹانگ مت اڑاؤ۔ سردار محمد تم سے کہہ بھی چکا ہے کہ یہ زبان کھولنے کی نہیں، زبان بند رکھنے کی ملازمت ہے۔۔۔''

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ اوپر کس قسم کا جشن ہو رہا ہے؟''وہ رازداری سے بولا۔

''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔۔۔''میں نے لاتعلقی سے کاندھے اُچکے۔

''تین عورتیں حویلی کی عقبی سیڑھیوں سے اوپر پہنچائی گئی ہیں۔۔۔'' وہ قدرے آگے جھکتا ہوا بولا۔''یہ کس قسم کا دفتر بننے جارہا ہے، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔۔۔''

''عورتیں۔۔۔؟''

میں چونکا۔۔۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ قاسم پینے پلانے والا آدمی ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس قسم کا رنگین مزاج بھی ہوسکتا ہے کہ اس حویلی میں عورتوں کو بلوائے جہاں ایک رات پہلے حملہ ہوچکا ہو اور جس حویلی کی حیثیت الیکشن آفس جیسی ہو۔۔۔ غصے کی ایک شدید لہر مجھے اپنے جگر کو چھیدتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں یکلخت بستر سے اُٹھ بیٹھا۔۔۔ قاسم کو یہ بتانا ضروری تھا کہ اس حویلی میں نبی بخش موجود ہے اور نبی بخش جنگی کی موجودگی میں یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا۔

''پلیز۔۔۔''اشرف مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔''جنگی صاحب! آرام سے بیٹھ جائیں، بلکہ لیٹ جائیں۔ چند گھنٹوں بعد صبح ہوجائے گی، صبح کو آپ سردار محمد سے بات کریں۔ اس وقت آپ کا جذبات میں آنا ٹھیک نہیں۔۔۔''

میرے اندر غیظ و غضب کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے، اُکھڑ اور اُجڈ نبی بخش جنگی بیدار ہوچکا تھا۔ اب اس صورتحال میں نارمل رہنا میرے

لیے ناممکن تھا۔ بے ساختہ میرا ہاتھ اپنے تکیے کے نیچے گیا، دوسرے ہی لمحے پیٹی سمیت اپنا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں بجلی کی سی پھرتی سے اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اشرف مجھے روکتا ہی رہ گیا اور باہر اونگھتے ہوئے دونوں محافظ چونک کر جاگ اٹھے۔

''خبردار—!'' میں نے ایک لمحے کیلئے ان کے پاس رک کر کہا۔ ''میں جشن منانے اوپر جا رہا ہوں، میرے پیچھے کوئی اوپر نہیں آئے گا''۔

O

پھر میں سیڑھیاں طے کر کے اس دروازے کے قریب پہنچ گیا جس کی کنڈی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ ایک ہلکے سے جھٹکے سے کنڈی کھل گئی۔ اب میرے سامنے اینکسی حویلی کی کشادہ چھت اور کھلا آسمان تھا، دوسری طرف تین چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ سبھی کمروں میں روشنی ہو رہی تھی، نیچے حویلی کا جنریٹر چل رہا تھا۔ حملے کے بعد ملازموں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ رات بھر حویلی کے دونوں جنریٹر باری باری چلاتے رہیں اور خوب روشنی رکھیں مگر چھت پر پہرے کا کوئی انتظام دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بڑے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس کے دروازے بند تھے، اندر سے دبی دبی نسوانی چیخوں اور مردانہ قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دروازے لکڑی کی پتلی پھچیوں سے بنے ہوئے تھے لہٰذا تختوں کے درمیان ایک ایک انگلی جتنا خلاء تھا جس میں سے اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کے پہلے حصے میں فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا، اردگرد گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے۔ تیکھے نین نقش کی ایک سانولی سی بھرے بھرے جسم والی عورت پر دو افراد جھکے ہوئے تھے۔ ایک اسے گلاس پیش کر رہا تھا، دوسرا اس کے جسم پر چٹکیاں لے رہا تھا اور عورت مسلسل انکار میں سر ہلا رہی تھی۔ ان کے عقب میں لکڑی کا ایک خوبصورت پارٹیشن تھا جس کے پیچھے سے نسوانی چیخوں اور ایک مرد کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورت پر جھکے ہوئے مردوں کے چہرے جب روشنی کی طرف گھومے تو میں نے دیکھا کہ حویلی کے ملازم تھے، قاسم غالباً پارٹیشن کے پیچھے دادِعیش دے رہا تھا۔

''پی لے—'' ایک ملازم عورت کی طرف گلاس بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''بڑی مزیدار چیز ہے۔ دو گھونٹ پی لے گی تو لطف آ جائے گا''۔

''نہیں—'' عورت انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ مَیں حلق سے نیچے نہیں اتار سکتی۔ ایک دفعہ غلطی کی تھی، سارا دن حالت خراب رہی تھی—بس ایسے ہی ٹھیک ہے—''

دوسرا ملازم اس کی کمر پر چٹکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''ہم پوری بوتل بھی چڑھا جائیں تو کچھ نہیں ہوتا، تجھے دو گھونٹ بھی مصیبت ہو رہے ہیں—ضد نہ کر، مان لے—''

''نہیں—'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''مت مجبور کرو مجھے—''

''یہ ایسے نہیں مانے گی—'' پہلے ملازم نے گلاس ایک طرف رکھ کر اس کے دونوں بازو پکڑ لیے، ایک ٹانگ اس کے پہلو سے گزار کے اسے جکڑ لیا اور دوسرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''گلاس اٹھا کر اس کے منہ میں انڈیل دے—دیکھتا ہوں، کیسے نہیں مانتی—''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے دھمکی پر عمل کرتے، میں گلا پھاڑ کر چلایا۔

''قاسم جان! دروازہ کھولو—''

رات کے سناٹے میں میری للکارتی ہوئی کڑک دار آواز نشے میں دھت جشن منانے والوں پر بم کر طرح گری، ایک دم خاموشی طاری ہو گئی جیسے کمرے میں موجود ہر شے کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

''میں کہتا ہوں، دروازہ کھولو۔۔۔'' میں نے دروازے پر ایک ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''قاسم جان! دروازہ کھولو۔۔۔''

دوسرے ہی لمحے اندر بتی بجھ گئی، کمرہ تاریک ہو گیا۔ پھر اس تاریکی میں ہلچل سی ہوئی۔ لباس کی سرسراہٹیں، چیزوں کے الٹ پلٹ کرنے کی آوازیں، قدموں کی دھپ دھپ گونجنے لگی۔ پھر کسی نے اندر سے کہا۔

''قاسم جان تو یہاں نہیں ہے۔۔۔ تم کون ہو؟''

''قاسم جان اندر ہے۔۔۔'' میں نے گرج کر کہا۔ ''اور میں تمہارا باپ ہوں۔۔۔''

یہ اشتعال انگیز جملہ دروازہ کھلوانے کا بہترین نسخہ ثابت ہوا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور کسی نے مجھ پر دھات کے ایک لمبے گلدان سے حملہ کیا۔ میں اس کیلئے پہلے ہی سے تیار کھڑا تھا، فوری طور پر اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ بھاری گلدان یا وہ دھات کا جو بھی برتن تھا، حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ کر دھم سے چھت کے نیچے فرش پر گرا اور لڑھکتا ہوا حویلی کی بیرونی فصیل کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے حملہ آور کو سنبھلنے کی مہلت نہیں دی، پوری قوت سے گھوم کر ایک مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا اور اچھل کر ایک لات ماری۔ وہ دھڑام سے الٹ کر اندر جا گرا۔۔۔ اندر گھپ اندھیرا تھا جبکہ چھت پر تاروں کی روشنی کی وجہ سے بہت مدھم مدھم سا اجالا تھا اس لیے یہی جگہ میرا میدانِ کارزار بننے کیلئے مناسب تھی۔ پستول میرے ہاتھ میں تھی، اسے میں نے کاندھے پر ڈال کر آستینیں چڑھا لیں۔

''قاسم جان۔۔۔!'' میں نے بھاری لہجے میں کہا۔ ''باہر آ جاؤ، میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔۔۔''

''نبی بخش جنگی! سائیں قاسم یہاں نہیں ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اسے حویلی سے بڑے سائیں کا بلاوا آیا تھا، وہ وہاں چلا گیا ہے۔۔۔'' پھر اس کی آواز قدرے مدھم ہو گئی، اس میں التجا کا انداز جھلک آیا۔ ''جنگی سائیں! ہم یہاں شغل میلے کیلئے دو چار دوست جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا مزہ نہ خراب کرو، نیچے جا کر آرام کرو۔۔۔''

میں نے گرج کر کہا۔ ''نمک حرام غفورے! میں نے تیری آواز پہچان لی ہے۔۔۔ یہ سائیں کا الیکشن دفتر ہے، شغل میلے کی جگہ نہیں ہے۔ ایک منٹ کے اندر اندر باہر نکل کر تتر بتر ہو جاؤ ورنہ ایک بھی آدمی کے ہاتھ پاؤں سلامت نہیں رہنے دوں گا۔ میں یہ بیہودگی یہاں نہیں ہونے دوں گا۔۔۔''

اندر کچھ کھسر پھسر ہوئی۔

''اچھا، آپ دروازے کے پاس سے ہٹ جائیں۔۔۔'' ایک سہمی ہوئی آواز نے کہا۔ ''ہم باہر نکل رہے ہیں۔۔۔''

میں ایک طرف ہو گیا۔ اندھیرے سے دو تین ہیولے برآمد ہوئے چوڑیوں اور پازیبوں کی جھنکار گونجی۔ پھر یہ ہیولے آپس میں اس طرح غلط ملط ہو گئے جس سے مدھم اجالے میں کمرے سے نکلنے والوں کی تعداد کا تعین نہ ہو سکا۔ وہ سب تیزی سے عقبی سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ حویلی میں دو تین گاڑیاں ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اس وقت بھی احاطے میں دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے چھت سے جھانک کر دیکھا۔ ایک پرانی

اسٹیشن ویگن اسٹارٹ ہو رہی تھی اور غالباً اس میں چھت سے اترنے والی عورتیں اور مرد سوار تھے۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور وہ حویلی کے احاطے سے نکل کر کچی سڑک پر گھوم گئی۔ اسی لمحے میں بتی روشن ہوگئی ساتھ والے کمرے سے ماسٹر علی احمد شہباز اور اس کے ساتھی شور سن کر باہر آ گئے تھے — قاسم کے کمرے میں ایک دبلا پتلا سا ملازم کھڑا تھا۔

''ابھی یہاں کیا ہو رہا تھا—'' ماسٹر شہباز نے حیرت سے پوچھا۔ ''بڑی دھینگا مشتی کی آوازیں آ رہی تھیں—؟''

''جشن مستی ہو رہا تھا—'' میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ ''مگر میں رنگ میں بھنگ ڈالنے پہنچ گیا''۔

ماسٹر شہباز نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''کیا ضرورت تھی تجھے دوسروں کے کام میں دخل دینے کی—؟''

میں نے کہا۔ ''ضرورت تھی تو میں نے دخل دیا ماسٹر شہباز!— ویسے بھی الیکشن حویلی کو میں بدکاری کا اڈا نہیں بننے دوں گا''۔

ماسٹر شہباز نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، مجھے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''تیرے خون میں بہت گرمی ہے پیارے، اسے ٹھنڈا کر— ٹھنڈا نہیں کرے گا تو کسی دن جان سے جائے گا''—

پھر وہ مجھے لیے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں بھی فرشی بستروں کا اہتمام تھا، گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے البتہ شراب کی بجائے قہوے کی پیالیاں گردش کر رہی تھیں۔ وہ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، دوسرا گاؤ تکیہ میری طرف لڑھکا کر بولا۔

''آرام سے بیٹھ جا— اور غور سے میری بات سن!'' میں نے طوعاً کرہاً گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لی۔ ''دیکھ جنگی—!'' ماسٹر شہباز ہاتھ اٹھا کر کسی فلاسفر کے انداز میں بولا۔ ''اگر تُو اوپر آنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لیتا تو میں تجھے صاف منع کر دیتا، منع اس لیے کرتا کہ آپس ٹکرانے اور توانائیاں ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تُو کوئی محتسب نہیں، کسی کا احتساب کرنے کا حق صرف محتسب کو حاصل ہوتا ہے اور تجھے سائیں سردار محمد نے احتساب کیلئے نہیں کسی خاص مقصد کیلئے اپنے پاس رکھا ہے۔ وہ خاص مقصد یہ ہے کہ تجھے سائیں سردار محمد کے انتخابی جلسوں میں عینی شاہد کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ جب سائیں سردار محمد اپنے کزن جلال کے ظلم و ستم کے پول کھولے گا تو تجھے اسٹیج پر کھڑا کیا جائے گا، تجھے سائیں سردار محمد کے ہر بیان کی ہاتھ اٹھا کر تائید کرنی ہے— اب تُو خود سوچ کہ اگر تو سائیں کے سب سے معتمد آدمی اور اس کی جائیداد کے منیجر سے ٹکرلے گا تو وہ تجھ پر کیسے اعتماد کرے گا— بول!''

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ماسٹر شہباز! میں کوئی بات مزاج کے خلاف برداشت نہیں کر سکتا— چاہے جلال دین کا منشی نیاز محمد ہو یا سردار محمد کا منشی قاسم جان ہو، جہاں بھی میری طبیعت اور میرے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوگی میں ڈٹ جاؤں گا، ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گا—''

ماسٹر شہباز قہقہہ لگا کر ہنسا، ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ وہ رومال سے آنکھوں کے گوشے پونچھتا ہوا بولا۔

''ہم تو سمجھتے تھے کہ شاعر ہی سادہ دل لوگ ہوتے ہیں، اب پتہ چلا کہ تیرے جیسے دنیادار بھی سادہ لوگ ہوتے ہیں— بیوقوف آدمی! تُو کس اخلاق، شرافت اور انصاف کی بات کر رہا ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اکثر وڈیرے ایک لاکھ کا کتا خرید لیتے ہیں لیکن ایک سو روپیہ بھی اپنے ملازم کی بیماری یا مصیبت پر خرچ نہیں کرتے۔ یہاں ایک کتے کی قیمت لاکھ، ڈیڑھ لاکھ، دو لاکھ ہوتی ہے لیکن ملازم کی عزت آبرو، جان اور مال کی قیمت ایک

سو، ڈیڑھ سو اور دو سو بھی نہیں ہوتی۔ اس نظام کے خلاف نہ تیرے مضبوط بازو کچھ کر سکتے ہیں، نہ ماسٹر شہباز کا قلم کچھ کر سکتا ہے — عافیت کے ساتھ خاموشی سے وقت گزارنے کی سوچ پیارے! ان الجھنوں میں پڑے گا تو کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا، تیرا ہی نقصان ہوگا — لے چائے پی اور جان بنا —"

یہ کہہ کر اس نے گرم گرم قہوے کی ایک پیالی میری طرف بڑھا دی۔ میں خاموشی سے قہوہ پینے لگا — ماسٹر شہباز گرم و سرد چشیدہ انسان تھا۔ اس نے اس نظام کا جو تجزیہ بھی کیا تھا وہ خاصی حد تک درست تھا لیکن میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس نظام کا ایک پرزہ یا اس شطرنج کا ایک مہرہ بننے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ آخر اس زندگی پر میرا اپنا بھی کوئی حق تھا۔ میں کب تک حالات کے دھارے پر بہتا رہتا، کب تک دوسروں کی مرضی پر چلتا رہتا؟ — ماسٹر شہباز کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ہی ماموں سبزل کے گوٹھ پہنچ کر ماں کو اپنے ساتھ لوں گا اور اس علاقے سے نکل کر سکھر یا حیدر آباد چلا جاؤں گا۔ وہاں محنت مزدوری کر کے زندگی گزاروں گا اور ہمیشہ کیلئے اپنے ماضی کو فراموش کر دوں گا۔ پھر جیسے جیسے میں اس فیصلے پر غور کرتا گیا مجھے زندگی آسان، سبک اور پُرسکون نظر آتی گئی۔ جانے کو تو میں کراچی بھی جا سکتا تھا، اُڑن سانپ کا ٹھکانہ ڈھونڈ کر دوبارہ اس کے گروہ میں شامل ہو سکتا تھا لیکن اب حالات اتنے بدل چکے تھے اور سب کچھ اس قدر تلپٹ ہو چکا تھا کہ میرا کراچی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس شہر سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی جس کے ایک ٹوٹے پھوٹے قبرستان میں میری ایک عزیز ہستی محوِ خواب تھی جس کے ساتھ اتنے جیتے جاگتے لمحے گزارے تھے کہ اب اس کی جدائی کا عذاب از سرِ نو اوڑھنا میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ سکھر یا حیدر آباد ہی میرے لیے موزوں شہر تھے، وہاں کوئی مجھے نہیں جانتا تھا البتہ میں ایک شخص کو جانتا تھا جو حیدر آباد میں تلک چاوڑی پر چوڑیاں بنانے کا کام کرتا تھا۔ اس کا نام عبدل تھا اور وہ کبھی گوٹھ صادق علی میں حویلی کا ترکھان ہوا کرتا تھا، پھر کسی بات سے ناراض ہو کر ہمیشہ کیلئے گوٹھ سے چلا گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جا کر عبدل سے ملوں گا اور اس کے ساتھ مل کر کام کروں گا، ماں کو بھی ساتھ لے جاؤں گا کہ اس بڑھاپے میں وہ میری جدائی کا مسلسل صدمہ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی — مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ماسٹر شہباز نے دو ایک مرتبہ مخاطب کرنے کی کوشش کی پھر کاغذ پنسل نکال کر کچھ لکھنے لگا۔ میں بھی بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا تھا، اونگھتے اونگھتے مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور ماسٹر شہباز اور اس کے ساتھی بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ دیسی گھی کے پراٹھے، دیسی انڈے، بھنا ہوا دیسی مرغ اور بھاپ چھوڑتی ہوئی چائے کی بڑی کیتلی — میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔

ماسٹر شہباز لہک لہک کر کہہ رہا تھا۔

"یہ دیسی گھی کے پراٹھے اور دیسی مرغ اچھی شاعری کیلئے بہت ضروری ہیں۔ اچھی شاعری کروانی ہے تو شاعر کو روزانہ ایک سیر بادام کھلاؤ، دو سیر دودھ پلاؤ، ایک دیسی مرغ بھون کر دو، اوپر دیسی گھی کے چار بڑے پراٹھے کھلاؤ تو انشاء اللہ پہلوانی شاعری کرے گا — کیوں جنگی؟"

میں ہنس پڑا۔ بڑی آزردہ، تھکی تھکی ہنسی — ناشتے کے بعد میں نیچے اترا تو اشرف تیزی سے میری طرف لپکا اور مجھے الگ لے جا کر بولا۔

"سائیں سردار محمد بیرونی دفتر میں بیٹھے ہیں، دو تین بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے —"

کوئی اور بھی پر اس نے معنی خیز انداز میں زور دیا۔ میں سمجھا کہ وہ قاسم جان کے بارے میں بتا رہا ہے لیکن جیسے ہی میں نے بیرونی دفتر میں قدم رکھا تو مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی، سامنے شرافت علی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بازو پھیلا کر اٹھ بیٹھا۔ سردار محمد نے گردن گھما کر مجھے دیکھا مگر

اٹھا نہیں، بدستور بیٹھا رہا۔ اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

''اوہ، جنگی۔۔۔!'' شرافت علی نے مجھے بھینچ کر گلے لگاتے ہوئے بولا۔ ''کتنی خوشی ہو رہی ہے اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ کر۔۔۔ بیٹھو، بیٹھو۔۔۔''

پھر اس نے زبردستی مجھے اپنے قریب والی کرسی پر بٹھا لیا، مجھے حیرت اور خوشی سے دیکھتا رہا۔ سردار محمد نے کمرے میں موجود ملازمین کو آنکھ سے اشارہ کیا تو سب ایک ایک کرکے کمرے سے نکل گئے۔

''میں رات ہی پہنچا ہوں''۔ شرافت علی بتا رہا تھا۔ ''جی تو چاہتا تھا کہ تم سے ملوں لیکن سفر کا تھکا ہوا تھا لہٰذا نہ آ سکا۔۔۔'' پھر وہ سردار محمد کی طرف دیکھ کر مسکرایا، بولا۔ ''ویسے بھی رات تم جوڑ و کرانے کے موڈ میں تھے۔ ہمیں رات ہی ساری رپورٹ مل گئی تھی۔۔۔''

''ادا سائیں۔۔۔!'' سردار محمد برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''آپ جنگی دوست سے معاملے کی بات کریں۔ ابھی بہت سارے کام پڑے ہیں۔۔۔''

''معاملے کی بات؟''۔۔۔ میں نے بھوئیں سکوڑ کے سردار محمد کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''بات یہ ہے۔۔۔'' شرافت اپنے مخصوص دھیمے اور میٹھے لہجے میں بولا۔ ''جنگی دوست! میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا، تمہیں واپس کراچی اپنے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔۔۔''

''لیکن۔۔۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''وہاں میں کروں گا کیا؟''

''تم وہاں سائیں محمد کے الیکشن آفس میں کام کرو گے''۔ شرافت علی بولا۔ ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں پبلک پلیٹ فارم پر لانے کی بجائے پریس کے سامنے پیش کیا جائے، پریس تمہاری بات کو زیادہ موثر انداز میں عوام تک پہنچا سکتا ہے''۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''لیکن شرافت سائیں! میں کراچی جانا نہیں چاہتا۔۔۔''

سردار محمد درمیان سے بات اچکتے ہوئے بولا۔ ''تم کراچی جانا نہیں چاہتے اور میں تمہیں یہاں رکھنا نہیں چاہتا۔ اب درمیانی راستہ تم خود نکال لو۔۔۔''

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''نکال لیا ہے سائیں، آپ بے فکر ہو جائیں۔۔۔''

سردار محمد کی مونچھیں پھڑ کنے لگیں۔ وہ ترکی بہ ترکی سوال و جواب کا عادی نہیں تھا، تیز چبھتے ہوئے لہجے میں کہا میری طرف مڑ کو بولا۔

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''مطلب بہت صاف ہے۔۔۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔ ''میں خود بھی یہاں رہنا نہیں چاہتا جہاں قاسم جیسے لوگ موجود ہوں، جہاں خربوزوں کی رکھوالی پر گیدڑ مامور کیے جائیں۔۔۔''

''بس بس۔۔۔'' سردار محمد بگڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آگے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے مت نکالنا۔ قاسم جان میرا ملازم نہیں گھر کا فرد ہے،

میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کے لئے تیار نہیں--- رات تم نے اس کے ساتھ جو غنڈا گردی کی ہے اور جس طرح بلاوجہ الزام تراشیاں کی ہیں، اس کی سزا---"

شرافت علی اٹھ کر ہمارے درمیان آ گیا، پیار سے سردار محمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں ادا نہیں--- نبی بخش جنگی ہمارے لیے بڑا قیمتی آدمی ہے، غصہ تھوک دو---"

"ادا سائیں!" سردار محمد جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کے ساتھ ہمیشہ میرا اس بات پر اختلاف ہوتا ہے کہ آپ ملازموں کو سر پر رکھنے کے عادی ہیں اور میں جوتی کو پاؤں کے علاوہ کہیں اور نہیں رکھ سکتا، یہ بات میرے خاندانی وقار کے خلاف ہے"۔

"میں کسی کے پاؤں کی جوتی نہیں ہوں"۔ میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو شخص ایسا سمجھتا ہے میں اس کے سر پر جوتی رکھنے کا طریقہ جانتا ہوں---"

یہ سنتے ہی سردار محمد بلبلاتے ہوئے سانڈ کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے پوری قوت سے میرا گریبان تھام لیا اور زور لگا کر مجھے دیوار کی طرف دھکا دیا۔ میرے اندر کے وحشی کیلئے اتنی ہی مہمیز کافی تھی۔ میں نے دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑی کلائی کا ایک وار اس کے کاندھے پر کیا، دوسرا وار اس کی گردن پر--- وہ لحیم شحیم آدمی تھا لیکن میرے بھاری بھرکم جبڑے اور منجھے ہوئے بازوؤں کے آگے جم نہ سکا۔ اس کے دونوں ہاتھ فوری طور پر میرے گریبان سے الگ ہو گئے۔ وہ اپنے وجود کو سمیٹ کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اب اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اس کے بڑے بڑے گھنگھریالے بال بکھر گئے تھے۔ اس نے پوری قوت سے لات گھما کر میرے پیٹ میں ماری اور اسی قوت سے میری لات گھوم چکی تھی۔ دونوں کی ٹانگیں ہوا میں ٹکرا گئیں، سردار محمد لڑکھڑا کر دیوار کی طرف جھکا اور جھکتے ہی اس نے ریوالور نکال لیا۔ اس کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ جنونی ہو چکا ہے اور کسی صورت میں مجھے چھوڑنے کیلئے تیار نہیں۔

"ادا سائیں---!" وہ مجنونانہ انداز میں چنگھاڑ کر بولا۔ "ہٹ جاؤ سامنے سے، نکل جاؤ کمرے سے--- میں اس کتے پر چھ کی چھ گولیاں ضائع کرنا چاہتا ہوں"۔

"ادا سردار محمد---!" شرافت علی پریشان ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے بولا۔ "دیکھو، گولی مت چلاؤ--- بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں، وہی ہوگا جو تم چاہو گے---"

"نہیں ادا نہیں---" سردار محمد دانت پیستے ہوئے بولا۔ "تم شہری لوگ ہو، تم ہمارے رسم و رواج نہیں جانتے۔ ملازم جب سامنے کھڑا ہو جائے تو اس کی سزا موت ہے"۔

میں براہِ راست سردار محمد کے ریوالور کی زد پر تھا۔ وہ جنونی ہو چکا تھا، اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس لمحے میری ہلکی سی جنبش یا ایک بھی لفظ اسے مزید پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا لہٰذا میں نے تنکھیوں سے فوری دفاع کیلئے جگہ کا انتخاب کیا۔ ایک بہت بڑا چوبی تختہ کمرے کے دائیں طرف اسٹینڈ پر کھڑا کیا گیا تھا، غالباً بڑے ہورڈنگ بورڈ کی صورت میں اسے کسی اونچی جگہ پر لگایا جانا تھا۔ فوری طور پر ایک وہی ایسی جگہ تھی جہاں

میں چھلانگ لگا کر چند لمحوں کیلئے اس کے ریوالور سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ میں نے جسم تولا اور پوری قوت سے ہورڈنگ کے پیچھے چھلانگ لگا دی، اس وقت سردار محمد نے فائر کیا تو گولی چوبی تختے کا ایک کنارہ چھیدتی ہوئی دیوار میں جا لگی، پلاسٹر کا ایک پورا ٹکڑا فرش پر گرا۔

''ادا سردار محمد —!'' شرافت علی چیخ کر بولا۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں، حوصلے سے کام لو — میں اسے باہر نکالتا ہوں۔ وہ تم سے معافی مانگے گا —''

''سیٹھ شرافت علی —!'' میں نے چوبی تختے کی آڑ سے کہا۔ ''معافی کسی قصور پر مانگی جاتی ہے اور میں نے کوئی قصور نہیں کیا — قاسم جان حویلی میں عورتیں لایا تھا، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ الیکشن حویلی ناپاک ہو اور اسی لیے میں نے انہیں بھگا دیا تھا''۔

''جھوٹ ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے —'' سردار محمد ہذیانی انداز میں چیخ کر بولا۔ ''یہ قاسم جان پر من گھڑت الزام ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عورتیں تُو لایا تھا اور اس بات پر اس نے تجھے لعن طعن بھی کی تھی، جھگڑا اسی وجہ سے ہوا —''

''پوچھ لو اپنے آدمی سے —'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''حلف دے کر پوچھو کہ اصل بات کیا تھی، عورتیں کون لایا تھا اور کس نے انہیں یہاں سے دفع کیا تھا —''

''سب پوچھ چکا ہوں، بکواس بند کر —'' سردار محمد نے گرج کر کہا۔

''ہر ملازم نے گواہی دی ہے کہ عورتیں تُو لایا تھا، دونوں محافظوں نے قسم کھا کر بتایا ہے کہ تو اوپر جشن منانے گیا تھا اور تُو نے انہیں اوپر آنے سے منع کر دیا تھا''۔

بات تو ایک حد تک درست تھی لیکن غلط رنگ میں سردار محمد تک پہنچائی گئی تھی جس نے سارے معاملے کی صورت ہی بگاڑ دی تھی لیکن اس وقت کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ وہ بھرے ہوئے ریوالور کی ایک گولی چلا چکا تھا اور اس کے غصے میں رتی بھر بھی کمی نہیں آئی تھی — میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ چوبی تختے سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا اور اس آڑ سے نکل کر بیرونی دروازے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا کیونکہ انتہائی تیز رفتار جست کے باوجود اس کی اندھی گولیاں میرا جسم چاٹ سکتی تھیں۔ ایک ہی صورت تھی کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھین لیا جائے مگر یہ ناممکنات میں سے تھا اس لمحے وہ ایک آتش زیر پا شخص تھا اور ذرا سی بھی حرکت پر کسی جاندار کو اپنی گولیوں سے چھلنی کر سکتا تھا۔ اب آخری صورت یہی رہ گئی تھی کہ کسی طرح اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کر دی جائے۔ اس کیلئے ضروری تھا کہ میرے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز آ جائی جسے مخالف سمت میں پھینک کر میں چند لمحوں کیلئے اس کا دھیان بٹا سکتا تھا لیکن یہاں کوئی ایسی چیز دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی — یکا یک میری نظر اپنے قدموں کے قریب بندھے ہوئے ایک بنڈل پر پڑی۔ یہ پوسٹروں کا بنڈل تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ ڈھائی تین کلو وزنی یہ بنڈل رول کی شکل میں تھا، اگر یہ کسی طرح سردار محمد کے ریوالور والے ہاتھ پر پوری طرح قوت سے جا کر لگتا ہے تو ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل سکتا تھا لیکن بنڈل پھینک کر مارنے کے لیے میرا چوبی تختے کی آڑ سے نکلنا ضروری تھا اور یہ رسک لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے چند لمحوں تک اپنے حواس مجتمع کیے۔ پھر تیزی سے چوبی تختے کے پیچھے سے برآمد ہوتے ہی لپک کر پوری قوت سے بنڈل اس کے ہاتھ پر دے مارا — حیرت انگیز طور پر نتیجہ حسب توقع نکلا، ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا — وہ ریوالور کی طرف جھکا ہی تھا کہ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا ریوالور پر ضھپٹ پڑا۔ اب

ریوالور میری گرفت میں تھا۔ میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔

''سردار محمد!'' میں نے اسے ریوالور کی زد لیتے ہوئے للکارا۔ ''تم نے چھ کی چھ گولیاں میرے جسم پر ضائع کرنے کی بات کی تھی لیکن میں ایک ہی گولی سے تمہارا قصہ تمام کر سکتا ہوں۔۔۔''

''نہیں، نہیں جنگی دوست۔۔۔!'' شرافت علی چیخا۔ ''خبردار، گولی نہ چلانا۔ گولی نہ چلانا۔ ریوالور مجھے دے دو۔۔۔ بس طے ہو گیا کہ اب تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ تمہارا اپنا راستہ، ہمارا اپنا راستہ۔۔۔ اس تلخی کو اس کمرے میں ختم کر دو اور ریوالور مجھے دے کر خاموشی سے چلے جاؤ''۔

''نہیں۔۔۔'' سردار محمد زخمی سانپ کی طرح بل کھا کر چلایا۔ ''فیصلے تم مت کرواؤ سائیں! یہ فیصلہ مجھے کرنے دو۔ جب بھی کمی کمین مالکوں کے آگے زبان چلانے لگیں تو پھر فیصلے کا حق مالکان کو حاصل ہوتا ہے، کسی اور کو نہیں۔۔۔''

''سردار محمد۔۔۔!'' میں نے گرج کر کہا۔ ''ہاتھ پیر ہلائے بغیر تُو نے اپنے باپ دادا کی دولت پر عیش کئے ہیں، کسی قابل ہوتا تو انگلینڈ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر نہ آتا۔۔۔ تُو عوام کا نمائندہ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ کبھی اپنے گریبان میں منہ بھی ڈال کر دیکھا ہے کہ تیری کیا وقعت ہے؟۔۔۔ ہم جیسے کی کمین نہ ہوں تو تیرے جیسے وڈیروں کی آبرو خاک میں مل جائے۔ ہماری لاشوں پر محل تعمیر کرتے ہو اور ہماری ہڈیوں کے سودے کرتے ہو، اسلحہ کے بل پر حکمرانی کرتے ہو اور احتجاج کرنے والوں کو غنڈہ کہتے ہو۔ یہ ہے تمہاری تعلیم، یہ ہے تمہاری انسانیت، یہ ہے تمہارا بڑا پن۔۔۔ اگر بڑا پن اسی کمینگی کا نام ہے تو میں لعنت بھیجتا ہوں، تھوکتا ہوں تیرے اور جلال دین جیسے بدقماشوں کے بڑے پن پر۔۔۔''

○

سردار محمد کے منہ سے جواباً گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔ اگر میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور نہ ہوتا تو وہ جھپٹ کر میرا گلا دبوچ لیتا، میرا خون پی جاتا لیکن بھرے ہوئے ریوالور کے سامنے وہ بے بسی سے پیچ و تاب کھانے، دانت پیسنے اور گالیاں بکنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے خود ساختہ خاندانی وقار کی دیواریں زمین بوس ہو رہی تھیں۔ یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا، شاید میں اس کی زندگی میں یوں اسے زچ کر دینے والا پہلا آدمی تھا اور آدمی بھی ایسا جو سماجی حیثیت سے اس سے کہیں کمتر اور کمزور تھا— مجھے کمرے میں داخل ہوتے وقت توقع نہیں تھی کہ حالات کا نقشہ اس تیزی سے بدلے گا۔ شرافت علی نے جھگڑے کے آغاز میں معاملہ ٹھنڈا کرنے کیلئے سردار محمد کو مسلسل سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی لیکن جونہی میں نے ریوالور پر قبضہ کیا، پلٹی ہوئی بساط دیکھ کر اس نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ اب ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ میں جتنا عرصہ اس کے قریب رہا، میں نے یہی دیکھا کہ وہ چٹان کی طرح مستحکم اور مستقل مزاج آدمی ہے۔ وہ ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جس کے اندر انگنت طوفان ہل کھاتے پھرتے ہیں لیکن سطح سمندر پر اس کا اظہار نہیں ہونے پاتا لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ ایک طرف اس کا سالا تھا، دوسری طرف ایک ایسا شخص تھا جس سے اس کا کسی بھی قسم کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ وہ میری خاطر اپنی رشتہ داری میں زہر کیوں گھولتا لیکن مجھے توقع نہیں تھی کہ بد سے بدتر حالات میں بھی وہ مجھ سے لاتعلقی کا اعلان کر دے گا اور یہاں تک کہہ دے گا کہ تمہارا راستہ جدا، ہمارا راستہ جدا، ریوالور رکھ دو اور خاموشی سے ساری تلخی اسی کمرے میں دفن کر کے جہاں جانا چاہتے ہو جاؤ— میں توقع کر رہا تھا کہ وہ صلح صفائی کی کوشش کرے گا، اس ماحول کی تلخی اور تناؤ کو ختم کرنے کیلئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے گا کہ فضا میں پھیلی ہوئی نفرت کی کڑواہٹ تحلیل ہو سکے گی لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا— ایک اور اندیشہ بھی مسلسل میرے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا کہ اگر بساط پلٹتی دیکھ کر آخری حربے کے طور پر سردار محمد نے اپنے مسلح آدمیوں کو آواز دے کر بلا لیا تو میں ہر طرف سے محصور ہو جاؤں گا، بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا پھر موت کے علاوہ کسی کی بانہیں مجھے پناہ نہیں دے سکیں گی اس لیے میں نے دھیرے دھیرے دروازے کی طرف سرکنا شروع کر دیا تھا تاکہ جونہی فضا کا تناؤ کچھ کم ہو میں باہر نکل جاؤں۔ سردار محمد مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔ اس کا تندرست، سرخ و سفید چہرہ اس وقت انتہائی کریہہ اور نفرت انگیز لگ رہا تھا۔ غصے کی شدت نے اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا، آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھیں اور ان کی سرخی میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ منہ سے جھاگ تیزی سے نکل کر رہا تھا، سینہ جنونی اور آتش فشانی سانسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ بپھرے ہوئے سانڈ اور سانپ کی طرح پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ بھی تھی کہ کسی طرح اچھل کر ریوالور پر قبضہ کر لے۔ دو تین مرتبہ وہ اس ارادے سے میری طرف بڑھا لیکن میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا، واضح طور پر اس نے دیکھ لیا تھا کہ میری انگلی ٹریگر پر ہے اور میں گولی چلانے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لوں گا— شرافت علی بے بسی کے عالم میں صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کہہ کہہ کر تھک چکا تھا کہ میں ریوالور رکھ دوں لیکن ریوالور چھوڑنے کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔

''دیکھو جنگی—!'' بالآخر شرافت علی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''معمولی بات کو لمبی دشمنی میں تبدیل نہ کرو، ریوالور نہیں دیتے تو خاموشی سے نکل جاؤ۔ آج سے ہمارے اور تمہارے راستے جدا ہو گئے''۔

''نہیں اوا—!'' سردار محمد چیخ کر بولا۔ ''کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟— اس سے کہیں کہ جان پیاری ہے تو ریوالور یہاں چھوڑے،

کانوں کو ہاتھ لگائے، معافی مانگے اور پھر گوٹھ محمد بخش سے دفع ہو جائے"۔

"سنو، سردار محمد ---!" میں نے نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن کے مصداق ایک فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "نہ میں ریوالور دوں گا، نہ کانوں کو ہاتھ لگاؤں گا اور نہ معافی مانگوں گا البتہ گوٹھ محمد بخش چھوڑ دوں گا۔ کسی نے میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو وہ اپنی موت کا خود ذمہ دار ہوگا۔"

"ہم شکار کے پیچھے کتے نہیں چھوڑتے، گولی چھوڑتے ہیں"۔ سردار محمد نے نخوت سے کہا۔

"جس گولی پر میرا نام لکھا ہوگا وہ ضرور میرا پیچھا کرے گی ---" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "موت اور زندگی تجھ جیسے وڈیروں کے ہاتھ میں نہیں، اللہ کے ہاتھ میں ہے --- مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے ---" یہ کہہ کر میں نے ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا، جاتے جاتے محض سردار محمد کو چڑانے کے لیے کہا۔ "سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ تیرے وڈیرہ شاہی غرور نے تجھ سے ایک ایسا مہرہ چھین لیا جسے تُو پبلک پلیٹ فارم پر استعمال کرنا چاہتا تھا"۔ چند لمحے توقف کے بعد مَیں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "اب تک تو تقدیر نے مجھے مختلف لوگوں کا مہرہ بنائے رکھا، آئندہ بھی اگر یہی حالات ہوئے تو پھر کسی ایسے جاگیردار کا مہرہ بنوں گا جو تجھ سے وڈیروں کی طرح ٹکر لے سکے --- جلال دین کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

حالانکہ میں نے یہ سب کچھ محض اسے جلانے، دھمانے اور چڑانے کیلئے کہا تھا اور اس کی غلیظ گالیوں کے ردعمل کے طور پر کہا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میرے الفاظ کا فوری ردِعمل ہوا، شرافت علی اور سردار محمد نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایسا لگا جیسے میں نے نادانستگی میں سردار محمد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اس کا سارا جوش و جذبہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کہاں تو وہ بپھرے ہوئے سانڈ اور زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا، مجھے کچا چبا جانا چاہتا تھا اور کہاں اس کا چہرہ یکا یک دھواں دھواں ہو گیا۔

"نبی بخش جنگی ---!" شرافت علی نے کہا۔ "غالباً تم نے مذاق میں یہ بات کی ہے کیونکہ میں کسی بھی حالت میں سوچ نہیں سکتا کہ تم ہم سے نمک حرامی کرو گے --- چاہے تمہیں کتنا بھی رنج ہو، کتنا بھی ملال ہو، کتنا بھی غصہ ہو، وعدہ کرو کہ کبھی جلال دین کے پلیٹ فارم کو ہمارے خلاف استعمال نہیں کرو گے۔ یہ ہماری آن اور اَنا کا مسئلہ ہے ---"

ریوالور کی نال جس سردار محمد کو خوفزدہ نہیں کر سکتی تھی، جلال دین کے نام نے اس کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ شرافت علی کیلئے بھی یہ کم پریشان کن بات نہیں تھی مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ جلال دین سے رجوع کروں۔ ناممکن!

"ٹھیک ہے ---" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "وعدہ کرتا ہوں لیکن مجھے میری مرضی سے جینے کا حق رہنا چاہئے --- میں گوٹھ محمد بخش میں نہیں رہوں گا، گوٹھ صادق علی میں نہیں جاؤں گا لیکن جہاں جاؤں گا اگر مجھے تنگ یا ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی تو پھر میرے ردِعمل پر کسی کو ناراض نہیں ہونا چاہیے"۔ مَیں نے اپنی انگلی سے سردار محمد کی انگوٹھی اتار کر اس کی طرف اچھار دی۔ "یہ سنبھالو اپنی انگوٹھی، یہ تمہاری دوستی کی علامت تھی --- ریوالور البتہ تمہیں بعد میں ملے گا"۔

اب وہاں مزید رکنا کسی صورت بھی مناسب نہیں تھا۔ میں تیزی سے کمرے سے نکلا، اپنے کمرے میں پہنچا۔ تکیے کے نیچے سے چرمی پیٹی

والا اپنا لائسنسی ریوالور اور لائسنس اٹھایا اور پھرتی سے باہر نکلا— اشرف حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سردار محمد کے ریوالور کا چیمبر کھول کر گولیاں نکالیں، انہیں اپنی جیب میں ڈالا اور خالی ریوالور اسے دے کر بولا۔

''یہ فوری طور پر سردار محمد کو دے آؤ— خدا حافظ!''

میں نے ریوالور اس کے حوالے کر کے تیزی سے اس سے مصافحہ کیا اور اسے حیران و پریشان چھوڑ کر حویلی کے احاطے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل آیا— حیرت ہے کہ کسی نے مجھے روکا نہیں حالانکہ بہت سے ملازمین برآمدے اور صحن میں موجود تھے، اور تو اور ماسٹر شہباز بھی برآمدے میں گلزار گلوکار کے ساتھ کھڑا تھا لیکن کسی نے مجھے آواز نہیں دی، روکا نہیں۔ میں تیز تیز چلتا ہوا گوٹھ محمد بخش کی نہر کے پل پر پہنچا تو ایک چھکڑا ویگن مل گئی، یہ ماموں سبزل کے گوٹھ کی طرف جا رہی تھی۔ اب میری کیفیت ایسے جرنیل کی تھی جو جنگ ہار کے، اپنے تمغے اتار کے، اپنی کیپ اتار کے نہتا اور بے سروسامان، بے منزل و بے نشان ہو چکا ہو— یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی ایک لق و دق چٹیل صحرا ہے جہاں ہر طرف دھوپ ہی دھوپ ہے، سائے کا نام و نشان بھی نہیں۔ جتنی چھتیں اور جتنے سائے تھے میرے سر سے چھن چکے تھے۔ اب میں تھا اور زندگی کا لامتناہی صحرا تھا جس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس صحرا میں دھوپ سے بچاؤ کیلئے اگر کچھ تھا تو کیکٹس، کانٹے دار جھاڑیاں، ببول اور جلتے سلگتے ریت کے ذرے تھے۔ بس ایک بوڑھی ماں کی آس تھی۔ اب وہی لے دے کر میری آخری امید رہ گئی تھی۔ میں ویگن کے مسلسل ہچکولوں میں آنکھیں موندے سوچ رہا تھا کہ جیب میں کل ڈھائی تین سو روپے ہیں، لباس اور چادر ہے جو میرے جسم پر ہے یا مڑے تڑے میلے کچیلے نوٹ— ابھی ماموں سبزل کے بچوں کو دینا دلانا پڑے گا۔ گاؤں کے اور جن عزیزوں کے بچے ہیں انہیں بھی کچھ رقم دینی پڑے گی۔ پھر ماں کے ہمراہ حیدر آباد جا کر کہاں رہوں گا۔ فوری طور پر روٹی پانی کا بندوبست کیسے ہوگا، عبدل سے اتنے عرصے کے بعد ملاقات ہوگی اور پتہ نہیں وہ مجھے پہچان بھی پائے گا کہ نہیں؟— ہو سکتا ہے کہ وہ سرد مہری سے ملے، مجھے پہچاننے سے انکار کر دے یا پہچان بھی لے تو فوری طور پر میری رہائش اور کام کا بندوبست نہ کر سکے۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ فی الحال ماں کو ماموں کے پاس رہنے دوں اور خود حیدر آباد جا کر قسمت آزماؤں۔ کام دھندہ مل جائے، سر چھپانے کی جگہ کا بندوبست ہو جائے تو ماں کو بلوا لوں اور یہی حل مناسب تھا۔ یہ سوچ کر دل کو قدرے اطمینان ہو گیا— چھکڑا ویگن اونچے نیچے راستوں پر اترتی چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ ماموں کے گوٹھ کا ایک شخص اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا، مجھے پہچاننے کیلئے بار بار مڑ کر میری طرف مسکرا کے دیکھتا تھا۔ شاید اس سے کبھی گوٹھ صادق علی یا ماموں سبزل کے گوٹھ میں ملاقات ہو چکی تھی۔ میں نے مسکراہٹ کا جواب سر کی جنبش سے دیا۔ گوٹھ پہنچ کر جب ہم ویگن سے اترے تو وہ مصافحہ کر کے کہنا لگا۔

''جنگی! شاید مجھے پہچانا نہیں؟— میں سبزل کی گھر والی کا چچا زاد بھائی ہوں''۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''ایک بار میں گوٹھ صادق علی میں تیرے ماموں کے گھر سے دیسی گھی اور انڈے لے کر آیا تھا۔ اس وقت تُو حویلی میں کام کرتا تھا۔ اب کہاں ہے—؟''

میں نے سرد سانس لے کر کہا۔ ''آج کل تو فارغ ہوں—''

''وڈیرا سردار محمد کی چاکری چھوڑ دی؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''چاکری تھی ہی کب؟'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''تھی تو سہی۔۔۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''تیرا ماموں بتا رہا تھا کہ تیرے تو بڑے عیش ہیں۔ دو بندوق والے آگے، دو پیچھے، صبح پلاؤ، شام کو مرغ۔۔۔ بڑی افسری پر لگایا ہوا تھا وڈیرے سردار محمد نے تجھے، کیا خیال ہے کامیاب ہو جائے گا الیکشن میں؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔۔۔'' میں نے کاندھے اُچکتے ہوئے کہا۔

''لو، اور سنو۔۔۔'' وہ میرا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ ''تیرا ماموں پورے گوٹھ میں کہتا پھرتا ہے کہ تُو وڈیرے کا الیکشن انچارج ہے اور اس بیچارے کو الیکشن کا حال ہی معلوم نہیں۔۔۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''ماموں کیسا ہے، میری ماں سے ملاقات ہوئی۔۔۔؟''

''ماموں تیرا پریشان ہے۔۔۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ''کئی دن سے تیری ماں بیمار ہے۔ سبزل تجھے بلانے جا رہا تھا، پتہ نہیں کل چلا گیا ہو یا آج روانہ ہو۔۔۔''

''کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔۔۔؟'' میں نے تشویش انگیز لہجے میں پوچھا۔

''گوٹھ میں ڈاکٹر کہاں ہوتے ہیں بھولے۔۔۔!'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔ ''چوتیس پینتیس کلومیٹر دور ہسپتال ہے، وہاں جا کر تیرا ماموں خیراتی دوائیں لے آیا تھا''۔

اتنے میں میری نظر ماموں سبزل پر پڑی۔ وہ کاندھے پر چادر رکھے تیزی کے ایک طرف جا رہا تھا، اس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی تھے۔

''ماموں۔۔۔'' میں نے زور سے اسے آواز دی۔

ماموں سبزل چلتے چلتے رک گیا، پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا اور چندھیائی آنکھوں سے مجھے پہچاننے کی کوشش کی پھر لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور مجھے گلے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کی دلدوز چیخیں، اس کے بَین، اس کی سسکیاں، اس کے آنسو چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ تقدیر نے مجھ سے آخری پناہ، آخری چھت بھی چھین لی ہے۔ میرا انتظار کرنے والی میرا انتظار کرتے کرتے خود ایسی دنیا میں چلی گئی تھی جہاں میری جگر خراش چیخیں بھی نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

O

اس خبر نے میرے اعصاب ہلا کر رکھ دیے تھے مجھے اندر سے مزید توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ ماں کی موت نے یکلخت میرے لیے دنیا کی ہنسی بستی گلیوں میں سناٹے پھیلا دیے تھے۔۔۔ ماموں سبزل دکھ کی ان کاٹ دار ساعتوں میں میرا حقیقی غمگسار ثابت ہوا۔ وہ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ ہر چند کہ وہ میرا حقیقی ماموں نہیں تھا، رشتے کا ماموں تھا لیکن جس طرح اس نے مجھے سنبھالا، سہارا دیا اس طرح تو اگر میری ماں کا کوئی حقیقی بھائی ہوتا تو وہ بھی نہ کرتا۔ وہ مجھے گلے سے لگائے، میرے آنسو پونچھتا ہوا اس طرح گھر میں داخل ہوا جیسے کوئی چھوٹے بچے کو پیار کرتا ہوا گھر لاتا ہے۔ یہ گھر بھی گاؤں کے ان چھوٹے کچے گھروں کی طرح تھا جو کشادہ صحن، بیری یا کیکر کے ایک آدھ پیڑ، بھوسے کی کوٹھڑی اور دو تین نیچی چھتوں والے چھوٹے

کمروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ صحن کا احاطہ بھی کچی اینٹوں کا تھا البتہ چھ سات فٹ اونچا تھا اور اس میں ٹین کا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ صحن میں عورتیں بین کر رہی تھیں اور برآمدے کی پرچھتی کے نیچے ایک چارپائی پر چادر میں لپٹی میری بوڑھی ماں کی لاش پڑی تھی۔۔۔ ماموں سبزل نے بتایا کہ وہ مجھے رات بھر یاد کرتی رہی تھی۔ صبح اذانوں کے وقت اس نے حسرت آمیز انداز میں دروازے کی طرف دیکھ کر اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا تھا۔

''سبزل! اب وہ نہیں آئے گا۔۔۔ آنا ہوتا تو اب تک آ چکتا''۔ پھر اس نے اپنے سرہانے سے رومال میں لپٹے ہوئے زیورات کی ایک چھوٹی سی پوٹلی نکال کر ماموں کو دیتے ہوئے کہا۔ ''زندگی بھر پائی پائی جوڑ کر یہ زیور بنائے تھے کہ اپنے ہاتھوں سے اُس کی دلہن کو پہناؤں گی لیکن لگتا ہے کہ وہ دن میری زندگی میں نہیں آئے گا۔ اب یہ تم اسے پہنچا دینا اور اس کا بہت خیال رکھنا۔ پوری دنیا کی نظر میں وہ کڑیل جوان ہے لیکن میرے لیے اب تک وہی جنگو ہے جسے میں نہر پر نہلانے لے جاتی تھی۔ جس کا منہ دھلاتی تھی، جس کے کپڑے بدلتی تھی۔۔۔'' پھر چند اکھڑے اکھڑے سانس لے کر اس نے دم توڑ دیا تھا۔۔۔ یہ آج ہی صبح کا واقعہ تھا۔ ماں کی موت کی خبر سن کر ارد گرد کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ماموں نے ایک شخص کو اطلاع دے کر موٹر سائیکل پر گوٹھ محمد بخش بھیجا تھا لیکن میرے وہاں سے روانہ ہونے تک وہ وہاں پہنچا نہیں تھا اب ماموں سبزل خود مجھے لینے گوٹھ محمد بخش جانے کیلئے نکلا تھا کہ لاری اڈے پر مجھ سے ملاقات ہو گئی تھی۔۔۔ گوٹھ کے عام آدمیوں میں ایسی موتیں کئی دن تک موضوع گفتگو رہتی تھی لیکن وڈیروں، جاگیرداروں کیلئے ایسی موتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں، وہ ایسی باتوں کا نوٹس نہیں لیتے البتہ تھوڑی بہت رقم اور اجناس اشک اشوئی کیلئے بھجوا دیتے ہیں۔ اس گوٹھ اور اس سے ملحقہ بے شمار گوٹھوں پر سردار محمد کی عملداری تھی اور موجودہ حالات میں توقع نہیں تھی کہ وہ ذرہ بھر بھی میری ذات کیلئے کوئی نرم گوشہ رکھتا ہوگا۔ میں جن حالات میں اسے چھوڑ کر آیا تھا، الیکشن حویلی سے نکلا تھا یا نکالا گیا تھا اس کے بعد سارا تعلق اور وابستگی ختم ہو چکی تھی۔

ماں کی تجہیز و تکفین کے بعد جب میں ماموں اور گوٹھ کے دیگر لوگوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو ماموں سبزل کے چچازاد بھائی نے پوچھا۔

''اب تیرا کیا ارادہ ہے جنگی؟''

اس وقت تو دل پر اتنا بوجھ تھا کہ ایسی باتوں کا ہوش ہی نہیں تھا۔ میں فقط آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا لیکن رات کو جب میں اور ماموں سبزل کوٹھڑی میں سونے کے لیے گئے تو مجھے مسلسل کروٹیں بدلتے دیکھ کر ماموں سبزل نے مامی سے کہہ کر چائے بنوائی، گوٹھ سے لائے ہوئے پیراسیٹامول کے پتے سے دو گولیاں نکال کر دیں۔ پھر میری چارپائی پر آ بیٹھا اور بولا۔

''دیکھ نبی بخش جنگی! تیری ماں میری سگی بہن نہیں تھی لیکن سگی بہنوں سے بڑھ کر مجھے عزیز تھی۔ اس نے بہت موقعوں پر میری اور میری بیوی کی مدد کی تھی مگر کبھی ہم سے بدلہ نہیں مانگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے تیرے باپ کی موت پر زبردستی اپنے پاس لے آیا۔ وہ گوٹھ صادق علی کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی کہتی تھی کہ نوکروں کی اس کوٹھڑی میں میرے لیے اپنائیت کی بڑی کشش ہے۔ یہاں میں نے کئی برس گزارے ہیں، لہٰذا میں یہ جگہ چھوڑ نہیں سکتی لیکن میں اس کی منتیں کر کے اسے اپنے ساتھ لے آیا کیونکہ اس ضعیفی اور بیماری میں وہاں اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔۔۔ اب وہ تو اللہ کے پاس چلی گئی مگر اس کی نشانی تیری صورت میں موجود ہے۔۔۔ بول، تیرا کیا پروگرام ہے؟''

میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''پروگرام کیا ہونا ہے، ماموں! میرے لیے اب کیا باقی رہ گیا ہے۔۔۔ پہلے سوچا تھا کہ الیکشن کے بعد

اگر سردار محمد کامیاب ہو گیا تو جہاں وہ جائے گا، اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ ماں کو بھی اپنے پاس بلا لوں گا لیکن اب تو ساری بساط ہی پلٹ گئی ہے۔۔۔ سردار محمد سے میرا جھگڑا ہو گیا ہے"۔

"جھگڑا۔۔۔" ماموں حیرت سے چیخ پڑا۔ "سردار محمد سے۔۔۔ کیا کہہ رہے تم؟"

"صحیح کہہ رہا ہوں ماموں۔۔۔!" میں نے مضمحل لہجے میں کہا۔ "مجھے خود بھی توقع نہیں تھی کہ معمولی سی بات بڑھ کر اس طرح حالات بگاڑ دے گی۔"

پھر میں نے اسے مختصراً تمام روداد سنا دی۔ وہ سنتا رہا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا۔ پوری بات سن کر وہ چارپائی سے اٹھ کر پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔۔۔ ٹہلتا رہا اور پُر تاسف لہجے میں کہتا رہا۔

"یہ بہت ہی بُرا ہوا۔۔۔ بہت ہی بُرا ہوا۔۔۔"

اس کی پریشانی اپنی جگہ بجا تھی لیکن میں اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ میں اپنی ماں کی رسم سوئم کے بعد ہمیشہ کیلئے اس گوٹھ سے چلا جاؤں گا اور حیدر آباد میں ایک دوست کے پاس جا کر محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی گزار دوں گا۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔۔۔" ماموں سنبل نے پلٹ کر شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تم مجھے چھوڑ کر جاؤ۔ اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی، اور تمہارا کوئی معقول کام دھندہ لگا ہوتا، پھر تم جانے کیلئے کہتے تو میں تمہیں شاید نہ روکتا لیکن ابھی تو اس کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی، ابھی میں تمہیں کیسے جانے دوں۔۔۔؟"

میں نے اپنی نم آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا ماموں کہ میری وجہ سے وڈیرے آپ کی جان کے بھی دشمن ہو جائیں، میں اپنی لڑائی میں آپ کو نہیں لانا چاہتا۔۔۔ ظاہر ہے کہ سردار محمد کے لیے اب ہر وہ شخص اس کا کھلا دشمن ہو گا جو مجھے پناہ دے گا یا کسی بھی طرح میری کوئی اخلاقی مدد کرے گا"۔

"کیا کرے گا وڈیرا؟" ماموں سنبل مضبوط لہجے میں بولا۔ "اگر اپنے کسی عزیز کا دکھ بانٹنا جرم ہے تو سنبل یہ جرم ضرور کرے گا۔ میں نہیں ڈرتا کسی مصیبت سے۔۔۔"

"نہیں ماموں۔۔۔!" میں نے ماموں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "میں آپ کے احسانوں کا بدلہ اگر نہیں دے سکتا تو آپ کو کسی مشکل میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ ماں کے سوئم کے بعد میں حیدر آباد چلا جاؤں گا اور ماں نے جو زیور میری دلہن کیلئے دیے تھے وہ آپ رکھ لیں۔ مجھے بس آپ کی دعائیں چاہئیں"۔

"دیکھ نبی بخش۔۔۔!" ماموں نے مجھے قائل کرتے ہوئے کہا۔ "تو کہیں نہیں جائے گا۔۔۔ یہ بات میں اوپرے دل سے نہیں کہہ رہا ہوں، میں نے سوچ لیا ہے کہ تو میرے پاس رہے گا۔ میرا جو تھوڑا سا زمین کا ٹکڑا ہے اس پر مل کر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ تیرے لیے دو کمرے الگ ڈال دوں گا اور یہیں کسی اچھے گھر میں تیری شادی کروا دوں گا۔۔۔ بس اب کہیں اور جانے کا خیال دل سے نکال دے۔ ہم جس فضا میں پلے بڑھے ہیں

وہی ہمیں راس آتی ہے، وڈیروں کی جنگ میں ہم ہاریوں، کسانوں کا کیا کام؟ --- چل، اب سو جا---"

یہ کہہ کر اس نے میرا سر تھپکا اور مطمئن انداز میں سر ہلاتا ہوا اپنی کھاٹ کی طرف بڑھ گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک طرف ماموں کی پیش کش اور دوسری طرف اس ماحول سے بھاگ نکلنے کی تڑپ تھی۔ میں نے میدان چھوڑنے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا لیکن یہاں رہنے میں میری وجہ سے ماموں اور ان کے افرادِ خانہ کو کئی مشکلات پیش آسکتی تھیں۔ پھر یہ بھی تو ضروری نہیں تھا کہ اس منظر کے فریم سے میرے نکلنے کے بعد ماموں کی عزت، جان و مال محفوظ ہو۔ وڈیروں کے انتقام کی آگ صرف ایک دامن تک محدود نہیں رہ سکتی تھی اس لیے میدانِ جنگ میں ڈٹ کر کھڑے رہنا ضروری تھا، مجھے اپنے محسن کو ممکنہ خطرات سے بچانا تھا۔ میرے جانے کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو مضبوطی سے ان کا سہارا بن سکے لہٰذا میں نے فیصلہ کرلیا کہ بڑوں کی سیاست کے غبار سے اپنی آنکھیں بچا کر یہیں رہوں گا اور ہر طرف سے کان لپیٹ کر کھیتی باڑی کے کام میں ماموں سبزل کا ہاتھ بٹاؤں گا۔ میں اپنے بازوؤں کی طاقت اور محنت سے ان زمینوں کو اتنا سنوار اور نکھاروں گا کہ ماموں اس کام کی طرف سے مطمئن اور بے نیاز ہو جائے --- یہی سوچتے ہوئے مجھے نیند آ گئی۔

منہ اندھیرے ماموں نے میرا کاندھا ہلا کر مجھے جگا دیا۔

"کوئی آیا ہے"۔ وہ میرے کان پر جھک سرگوشی سے بولا۔ "اس نے چادر کی بکل مار رکھی ہے اور بار بار پوچھنے پر بھی اپنا نام نہیں بتاتا، کہتا ہے کہ جنگی کا دوست اور خیر خواہ ہوں، اس سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ موت اور زندگی کا معاملہ ہے"۔

"موت اور زندگی کا معاملہ؟" میں نے نیم غنودگی کے عالم میں دہرایا۔

"کون ہو سکتا ہے اتنی سویرے، اس وقت تو یہاں تک کوئی گاڑی بھی نہیں آتی --- کیسے آیا ہے وہ، کسی گاڑی پر آیا ہے یا پیدل ---؟"

"گاڑی تو کوئی نہیں ہے ---" ماموں نے بتایا۔ "شاید اونٹ پر آیا ہے اور اونٹ اس نے کافی دور چھوڑا ہے شاید --- مگر تم اس طرح مت جاؤ۔ مجھے مشکوک آدمی لگتا ہے"۔

"اللہ مالک ہے ---"

میں نے چرمی پیٹی تکیے کے نیچے سے نکالی جس میں ریوالور تھا، دوسرے ہی لمحے میں نے پیٹی قمیض کے نیچے باندھ لی اور ماموں کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

"کون ہے ---؟" میں نے ٹین کا پھاٹک کھول کر ایک لمحہ توقف کیا۔ باہر تاریکی چھائی ہوئی تھی البتہ اس تاریکی کے کنارے مدھم مدھم اجالوں میں بھیگنے لگے تھے۔ صبح ہونے میں خاصی دیر تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور دھیمے دھیمے سفید ہونے والے افق ستارے بجھ رہے تھے۔ ایسے میں ایک سایہ چادر کی بکل مار کے کھڑا تھا۔

"میں اشرف ہوں سر ---!"

اس نے قدرے بلند آواز میں کہا اور میں حیران رہ گیا۔ پھر گارڈ اشرف نزدیک آ گیا اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔

''بہت ضروری بات ہے''۔ وہ آہستہ سے بولا۔

''آؤ اندر آجاؤ—'' میں نے پھاٹک پوری طرح کھولتے ہوئے کہا۔

''نہیں—'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''ٹائم نہیں ہے سر بالکل ٹائم نہیں ہے— بس آپ ایک طرف آ کر بات سن لیں اور بزرگوار کو اندر بھیج دیں''۔

سبزل ماموں اندر نہیں گیا بدستور وہیں کھڑا رہا— اشرف مجھے ایک طرف لے گیا، کہنے لگا۔

''آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ یہاں حملے کیلئے پہنچ جائیں گے۔ میں آپ خبردار کرنے کیلئے بڑی مشکلوں سے آیا ہوں۔ وڈیرے کا موڈ اب تک مجھ سے ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اس کی نوکری پر لعنت بھیج کر آپ کے ساتھ اس علاقے سے نکلنے کا پروگرام بنایا ہے''۔ وہ ایک ہی سانس میں جلدی جلدی تمام باتیں بتا رہا تھا۔

''مگر جائیں گے کہاں—؟'' میں نے پوچھا

''کراچی—'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''لاکھوں کی آبادی کے اس شہر میں ہم دو آدمیوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور کام کاج کے بے شمار مواقع ہیں''۔

میں نے بے ساختہ کہا۔ ''اگر کراچی میں واقعی اتنے مواقع تھے جتنے تم بتا رہے ہو تو تم اتنا بڑا شہر چھوڑ کر یہاں ان دیہاتوں میں کیوں آ گئے تھے؟''

''لالچ سائیں''۔ وہ خفت آمیز لہجے میں بولا۔ ''لالچ نے مجھے مارا— چار پیسے زیادہ کمانے کا لالچ کسے نہیں ہوتا۔ جس آدمی کی معرفت مجھے وڈیرے کی ملازمت ملی اس نے بڑے سبز باغ دکھائے تھے، میں اس کے چکر میں پھنس گیا—''

''بہرحال—'' میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''تمہیں جانا ہو تو جاؤ، میں تو میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں ہوں''۔

اشرف جھنجھلا کر بولا۔ ''سر میں کب آپ سے میدان چھوڑنے کی بات کر رہا ہوں۔ میں تو آپ کو خطرے سے خبردار کرنے کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر، اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر یہاں پہنچا ہوں۔ پورے دو میل پیدل چلا ہوں۔ پھر دو سواریاں تبدیل کیے، بڑی مشکل سے پوچھتا پاچھتا اور چھپتا چھپاتا یہاں پہنچا ہوں''۔

''لیکن اشرف—!'' میں نے صاف لفظوں میں کہا۔ ''میں فقط اپنی جان بچا کر اپنے ماموں اور اس کے گھر والوں کی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا''۔

''پھر وہی بات—'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ''مذہب نے بھی حفظ ماتقدم اور جان بچانے کی ہدایت دی ہے۔ آپ کا موت کے منہ میں نہتے ہو کر چھلانگ لگانا خودکشی کے مترادف ہوگا''۔

''کیا تمہیں میری ماں کی موت کے بارے میں پتہ نہیں چلا؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''اوہ، ہاں—'' اشرف گڑبڑا کر بولا۔ ''مجھے گھبراہٹ میں خیال ہی نہیں آیا۔ اطلاع تو کل ہی وہاں گوٹھ پہنچ گئی تھی، بہت افسوس ہوا—''

میں نے اس کے شہری اندازِ تعزیت سے سخت کوفت محسوس کی، میرے حلق میں جیسے کڑواہٹ سی بھر گئی۔ جب میں بولا تو میرا لہجہ حد درجہ تلخ تھا۔

''ہمارے ہاں تعزیت اس طرح نہیں ہوتی جس طرح تم کر رہے ہو۔ تم لوگوں کی شہری زندگی کی عادی طبیعت تمہارے اندر سے انسانیت نکال دیتی ہے اور ہم جاہل، اجڈ گنوار لوگ انسانی رشتوں کی اہمیت کو فراموش نہیں کر پاتے، یہی ہمارے اور تمہارے درمیان بڑا فرق ہے اور یہ فرق تمہاری ہمدردی کے دو چار لفظوں سے ختم نہیں ہو سکتا''۔

''آئی ایم سوری، سر ---!'' اشرف نے فوراً خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ویری سوری سر، لیکن وقت بہت کم ہے''۔

''کہہ تو دیا کہ ----''

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ماموں سبزل جو قریب ہی کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا، درمیان میں آ کر میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''تمہارا ساتھی جو کچھ کہہ رہا ہے، فوراً اس پر عمل کرو۔ میری فکر نہ کرو، میرا اللہ مالک ہے --- جاؤ---''

''مگر ماموں ---!'' میں نے کہا۔ ''اللہ آپ ہی کا نہیں، میرا بھی مالک ہے اور موت اگر اس مٹی پر لکھی ہے تو یہیں آئے گی، نہیں لکھی تو نہیں آئے گی چاہے ایک سو بندوقچی میری طرف منہ کر کے فائرنگ کر دیں''۔

''ذرا ایک منٹ ٹھہرو''۔ ماموں ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا کہہ کر تیزی سے اندر چلا گیا۔

''اب ہمارے پاس باتوں کا بالکل وقت نہیں ہے سر ---!'' اشرف گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ باتیں ہم راستے میں کر لیں گے۔ میں نے وہاں کھجوروں والے باغ کے پاس ساربان کو انتظار کرنے کیلئے کھڑا کیا ہے''۔ اشرف کہہ رہا تھا اور میں تذبذب کے عالم میں خاموش کھڑا تھا۔ اتنے میں ماموں اندر سے نکل آیا، بڑی خاموشی سے اس نے زیورات کی پوٹلی اور ایک بڑی سی چادر میرے حوالے کر دی --- صورتِ حال ایسی تھی کہ میں اشرف کے سامنے انکار کر کے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ماموں نے کیا چیز مجھے دی ہے، طوعاً و کرہاً میں نے خود پر جبر کیا اور خاموش کھڑا رہا۔

''میں نے تیری مامی کو کسی بات کی خبر نہیں لگنے دی ہے۔'' ماموں نے کہا۔ ''وہ بہت پوچھ رہی تھی، کرید رہی تھی کہ اتنی صبح کون آیا ہے اور تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ بڑے کمزور دل کی عورت ہے --- جاؤ، اللہ بیلی --- ہماری طرف سے مت گھبرانا۔ جو ہو گی، دیکھی جائے گی۔ اللہ مالک ہے --- میں ہر قیمت پر تمہیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتا ہوں ---''

جانے کو میرا دل آمادہ نہیں تھا اور میں مسلسل انکار کر رہا تھا۔ یہاں سے جانا میرے مزاج اور میری مردانگی کے خلاف تھا لیکن اب ماموں کے زور دینے پر میرے لیے یہی مناسب تھا کہ فی الحال یہاں سے چل دوں۔ میں ماموں سے گلے ملا، اشرف نے ماموں سے رخصتی مصافحہ کیا اور ہم کھجوروں والے باغات کی طرف چل پڑے جو بستی سے کچھ فاصلے پر شمال کی جانب تھا۔ یہ باغ کسی زمانے میں خوب ہرا بھرا ہوتا تھا مگر اب اجاڑ اور ویران ہو چکا تھا۔ اس کے گرداگرد جو کچی دیوار کھنچی ہوئی تھی وہ بھی کئی جگہوں سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور اب یہ باغ آوارہ کتوں، گیدڑوں اور پرندوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے لیکن وہاں دور دور تک کسی ساربان کا کوئی وجود نہیں تھا اور نہ کوئی اونٹ نظر آ رہا تھا۔

''چلا گیا بے ایمان ---'' اشرف نے اِدھر اُدھر کھوجتی نظریں ڈال کر کہا۔ ''حالانکہ میں نے پیشگی رقم اسے دی تھی''۔

اب پو پھٹ رہی تھی، پرندے چہکنے لگے تھے۔ سپیدہ سحر سے چہرے کے خدوخال اُجاگر ہونے لگے تھے۔ اچانک اشرف اچھل کر مجھ سے دور کھڑا ہوا گیا۔

''سر---!'' اس نے عجیب سی بھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے شاید ایک بار آپ کو بتایا تھا کہ ہمارے پیشے میں زیادہ بات چیت کی گنجائش نہیں ہوتی''۔

''ہاں---'' میں نے حیرت سے سر ہلایا۔ ''مگر اس بات کو یہاں دہرانے کا کون سا موقع ہے؟''

اس نے ایک لمحے کیلئے توقف کیا۔ پھر بولا تو اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ عجیب اور اجنبی سا لگا تھا۔

''آئی ایم سوری سر! یہ تکلیف دہ ڈیوٹی میرے ذمے لگائی گئی ہے---'' اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ چادر کی بکل سے باہر نکل آیا جس میں آٹو میٹک ریوالور چمک رہا تھا۔ ''میں یہ کام نہیں کرنا چاہتا تھا'' ۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مگر مجبوری ہے، مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپ کو شوٹ کر دوں''۔

O

میں بھونچکا سا رہ گیا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس شخص کو میری جان کی حفاظت پر مامور کیا جائے گا، وہ ایک دن میری جان لینے پر تل جائے گا مگر میرے سوچنے، نہ سوچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میری خوش گمانیاں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھیں اور موت ایک اٹل حقیقت کے روپ میں سامنے کھڑی تھی۔

اب سوچنے سمجھنے اور بحث کا موقع نہیں تھا۔ مجھے اگر اپنی جان عزیز تھی تو اسے بچانے کیلئے فوری طور پر کچھ کرنا تھا۔

''اشرف---!'' میں نے فوری حکمتِ عملی کے تحت اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اسے گفتگو میں الجھانا چاہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا کام تم اپنے ہاتھوں میں لو گے۔ اگر تمہاری نظر میں میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی تو تم نے اسی روز مجھے ختم کیوں نہ کر دیا جس روز تمہارے پاس وقت بھی تھا اور مناسب جگہ بھی''۔

''کس روز---؟'' اشرف ایک قدم اور پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

''جس روز الیکشن حویلی پر حملہ ہوا تھا اور تم میری حفاظت کرتے ہوئے مجھے کھنڈرات تک لے گئے تھے۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''اس روز مجھے ایسا کوئی حکم نہیں ملا تھا'' ۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پہلو بدل کر میرا نشانہ لیا۔ اب میرا سینہ اس کا ہدف تھا۔

''ارے---'' بے ساختہ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''یہ کمبخت یہاں کیا کر رہا ہے؟''

اشرف پھرتی سے گھوما، ایک لمحے کیلئے اس کا دھیان ہٹ گیا اور یہی لمحہ مجھے حرکت میں لے آیا۔ میں بجلی کی تیزی سے اس پر جا پڑا۔ میری بھرپور ٹکر اس کے پیٹ پر پڑی اور میں اسے رگیدتا ہوا زمین پر گرا، دوسرا ہاتھ گھما کر میں نے پوری قوت سے اس کی کلائی تھام لی۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے کمزور تھا لیکن کمانڈو تربیت کی بناء پر خاصا پھرتیلا تھا۔ میرے جسم کے بوجھ کے نیچے وہ مچھلی کی طرح تڑپا لیکن میں نے گرفت ڈھیلی نہیں کی، اس کی پیٹھ پر گھٹنا رکھ کر اس کا ریوالور والا ہاتھ اس کے پیٹ کے نیچے دبا دیا۔ وہ برق رفتاری سے اچھلنے اور الٹ کر میری گرفت سے نکلنے کیلئے زور

آزمائی کرتا رہا لیکن نکل نہیں سکا۔ اسی لمحے میں نے ایک مکہ اس کی کنپٹی پر رسید کیا تو وہ تڑپ کر ساکت ہو گیا، گھونسہ کارآمد ثابت ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے نیچے سے ریوالور کھینچا اور لات مار کر اسے سیدھا کر دیا، ایک اور لات اس کی کھوپڑی پر رسید کی۔ پتہ نہیں وہ بے ہوش ہوا تھا یا عدم آباد سدھار گیا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کی کوشش ضرور کی تھی، اسے جان سے مارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی۔ ایک شناختی کارڈ، چند کاغذات اور کچھ کرنسی نوٹ اسی کی جیبوں سے برآمد ہوئے۔ اس زور آزمائی میں ماموں سبزل کی دی ہوئی چادر اور زیورات کی پوٹلی دور جا پڑی تھی۔ میں نے اٹھ کر یہ چیزیں سمیٹیں۔ اسی لمحے کھجوروں کے جھنڈ میں ایک اونٹ بلبلایا اور پھر صبح کی پہلی کرنوں میں ایک اونٹ سوار نمودار ہوا۔ وہ سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں نے چادر کی بکل مار کر خود کو چھپا لیا۔ ٹوٹی ہوئی کچی دیوار کے عقب میں اشرف زمین پر چاروں شانے چت پڑا تھا، فوری طور پر اونٹ سوار کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ وہ میرے قریب آ کر اونٹ کو شٹکارتا ہوا چھلانگ مار اونٹ سے نیچے اتر آیا، اونٹ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

''معاف کرنا، مجھے دیر ہو گئی''۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، پھر بولا۔ ''چلیں ---؟''

میں نے سر ہلایا، بولا نہیں --- وہ آگے بڑھ کر اونٹ پر سوار ہو گیا، پالان پر اپنے پیچھے اس اس نے مجھے بھی بٹھا لیا۔ اونٹ اٹھا اور پھر ایک طرف چل پڑا۔

''جیپ کے پاس، نا---؟'' اس نے کھجوروں کے جھنڈ سے نکلتے ہوئے پوچھا، غالباً اسے گوٹھ سے باہر کھڑی کسی جیپ کے قریب سے لیا گیا تھا اور واپسی کے لئے وہی جگہ طے ہوئی تھی۔

''ہاں---'' میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ پھر اپنے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ ''چلتے رہو، رکو مت۔ دائیں طرف''۔

دائیں طرف ایک غیر آباد اور ویران راستہ تھا جو آگے جا کر سنسان اُجاڑ جنگلوں سے مل جاتا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا، نہ اس طرف کوئی آبادی تھی اس لیے کوئی گاڑی یا ساربان اُدھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ ان جنگلوں میں بہت اندر، شاید بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ڈاکہ زنی کرنے والوں کے خیمے اور غار تھے جو ہیلی کاپٹر پر بھی دکھائی نہیں دیتے تھے، اسی جنگل کے اندر کہیں سے دریائے سندھ بھی گزرتا تھا۔ اونٹ سوار کو پہلے تو اپنی کنپٹی سے آ لگنے والی میرے ریوالور کی نال پر اچنبھا ہوا مگر پھر فوراً ہی بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ وہ براہِ راست موت کی زد میں تھا۔ اس احساس نے اس پر کپکپی طاری کر دی۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔

''جیپ کہاں کھڑی ہے---؟'' میں نے نال اس کی کنپٹی پر دباتے ہوئے پوچھا۔

''سس، سرکار وہ پل کے پار---'' وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کون کون تھا جیپ میں---؟'' میں نے دانت پیس کر پوچھا۔

''سس، سرکار! وہ تین آدمی تھے''۔ وہ گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ پھر اس نے اونٹ روک لیا۔ میری طرف گھوم کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''اللہ جانتا ہے، میرا کوئی قصور نہیں۔ میرا قطعاً کوئی قصور نہیں''۔

پھر یکلخت اس نے اونٹ کو رکنے کیلئے اشارہ کیا اور تیزی سے چھلانگ لگا کر اونٹ سے اتر گیا۔ میں نے رسی کھینچ کے پہلوؤں میں اپنی ایڑھیاں چبھو کر اونٹ کو بٹھا دیا، یہ تکنیک میں نے اپنے لڑکپن میں سیکھی تھی۔ جیسے ہی اونٹ زمین پر بیٹھا، میں نے زقند بھر کے ساربان کو جالیا۔ میرے مضبوط شکنجے میں اس کی دبلی پتلی لرزتی ہوئی گردن منجمد سی ہوگئی اور وہ دھاڑیں مار کر رو پڑا۔

''شرم کر—'' میں نے دھکا دے کر اسے ایک جھاڑی پر گرا دیا۔ ''مرد ہو کر عورتوں کی طرح روتا ہے''۔

''میرا اونٹ مت لے جانا، سرکار—!'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''غریب آدمی ہوں۔ مارا جاؤں گا''۔

''اونٹ تو میں لے کر جاؤں گا''۔ میں نے کہا۔ ''مگر کدھر جاؤں گا، یہ تجھے معلوم نہیں ہوگا''۔ یہ کہہ کر میں اس کی طرف بڑھا۔ جیب سے میں نے چند نوٹ نکالے اور زبردستی اس کی واسکٹ میں ڈال دیئے۔ ''اونٹ تیرے پاس خود ہی لوٹ آئے گا مگر شاید تھوڑے انتظار کے بعد''۔

یہ کہہ کر میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ اسے بے ہوش کرنا ضروری تھا، وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح جھاڑی سے الجھتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ میں نے اونٹ پر سوار ہو کر اس کی باگیں سنبھال لیں۔ کسی منزل کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں تھا لیکن مجھے جلد از جلد ان راستوں سے غائب ہو جانا چاہیے تھا جہاں میرا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ واحد صورت یہی تھی کہ میں فی الفور جنگلوں میں روپوش ہو جاؤں لیکن جنگلوں میں جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ان جنگلوں میں بے شمار جرائم پیشہ لوگ، مفرور قیدی، ڈاکو اور قاتل موجود ہو سکتے تھے جنہوں نے میل ہا میل پھیلے ہوئے لق دوق صحراؤں، جنگلوں اور بیابانوں میں اپنے ٹھکانے اس طرح بنا رکھے تھے کہ پولیس اور رینجرز بھی آسانی سے وہاں تک پہنچ نہیں سکتے تھے لیکن ان جنگلوں کے علاوہ میرے لیے اور کوئی جائے اماں بھی نہیں تھی، میں جاتا تو کہاں جاتا؟— میں نے جنگلوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ابتداً چھوٹی چھوٹی چھدری جھاڑیاں تھیں، کانٹے دار جھنڈ تھے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ جھاڑیاں چوڑی ہوتی گئیں، ان میں درخت بھی شامل ہوتے گئے۔ کہیں کہیں تو جھاڑیاں اتنی گھنی ہو کر آپس میں مل گئی تھیں کہ ان سے گزر کر آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اندازاً میں دس بارہ کلومیٹر اندر پہنچا تھا کہ سامنے جھاڑیوں میں زلزلہ سا پیدا ہوا اور تین آدمی ڈھالے باندھے، بندوقیں اٹھائے سامنے آگئے وہ گہرے رنگوں کی شلواریں اور قمیصیں پہنے ہوئے تھے، چہروں پر ڈھاٹا تھا اور اس میں سے صرف ان کی سرخ سرخ دہکتی ہوئی آنکھیں باہر دکھائی دے رہی تھیں۔ کارتوسوں والی پٹیاں ان کے کاندھوں سے پہلوؤں کی جانب ترچھے انداز میں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں دونالی بندوقیں تھیں اور چھ کی چھ نالیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں اونٹ کو بٹھا کر نیچے اتر آیا، یقینی طور پر وہ اس جنگل کے روپوش باسی تھے۔

''ہاتھ اوپر—'' ایک نے چیخ کر کہا۔ ''اوپر— اوپر—''

O

میں نے فوری طور پر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میرے ریوالور کی پیٹی میرے لباس کے نیچے میرے جسم کے ساتھ بندھی ہوئی تھی البتہ زیورات کی پوٹلی اور اشرف کا ریوالور میرے واسکٹ کی جیب میں تھا۔ میرے جسم پر بھاری چادر تھی اور جب تک وہ میری تلاشی نہ لیتے انہیں یہ چیزیں نہیں مل سکتی تھیں۔ ایک شخص میرے قریب آگیا۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر سرگوشی میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تو دوسرا

لمبا سا شخص میری طرف بڑھا۔

''کون ہے تُو ---؟'' اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''غریب آدمی ہوں بابا ---!'' میں نے جان چھڑانے کیلئے کہا۔ ''غلطی سے راستہ بھول کر ادھر آ گیا ہوں ---''

''یہ غلطی نہیں ہے ---'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''اس غلطی کا نام موت ہے۔ اس جنگل کے باہر دس کلومیٹر تک وڈیروں کی حکومت ہے، دس کلومیٹر کے بعد ہمارے علاقے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں کوئی آدمی یا جانور ہماری مرضی کے خلاف نہیں پہنچ سکتا۔ نام بتاؤ؟''

''غوث محمد ---'' بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

''گوٹھ؟''

''گوٹھ اللہ بخش ---''

''گوٹھ اللہ بخش''۔ اس نے آنکھیں میچ کر الفاظ دہرائے۔ ''وہ تو یہاں سے ساٹھ پینسٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اتنی دور سے یہاں آنے کا مقصد؟''

''مقصد تو سائیں، کچھ نہیں''۔ میں نے بے دلی سے کہا۔ ''مجھے سردار کے پاس لے چلو''۔

تینوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ کچھ اشارے کئے، دبی زبان سے کچھ باتیں کیں اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''سردار سے کیا کام ہے تجھے؟'' ایک نے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

''یہ سردار کو ہی بتاؤں گا''۔ میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''اونٹ کا کیا بنے گا، یہ تو ڈیرے تک نہیں جا سکتا؟''

''اس کو یہیں چھوڑ دو سائیں!'' میں نے فوراً کہا۔ ''ویسے بھی یہ اونٹ میرا نہیں ہے، کسی اور کا ہے۔ خود ہی اپنے مالک کے پاس جائے گا''۔

تیسرے شخص نے لپک کر اونٹ کے کجاوے سے پانی کی چرمی مشک، روٹیاں اور اچار کا چھوٹا سا مرتبان ڈھونڈ کر اتار لیا۔ پھر اونٹ کو ششکار کر بھگا دیا۔ اونٹ شاید اسی موقع کے انتظار میں تھا، جھاڑیاں الانگھتا پھلانگتا بھگدڑ جنگلوں سے نکل بھاگا۔ پھر دو نے عقب سے مجھے کور کیا، ایک آگے آگے چلنے لگا۔ وہ بڑی مشاقی سے جھاڑیاں اور سرکنڈے چیرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا تھا مگر کانٹے دار جھاڑیوں نے کئی مرتبہ میری پنڈلیوں اور بازوؤں پر خراشیں ڈال دیں۔ یہ ایسی خاردار جھاڑیاں تھیں کہ عام آدمی آسانی سے ان کے درمیان نہیں چل سکتا تھا اور ویسے بھی میرے لیے اس میل ہا میل پھیلے ہوئے جنگل میں اندر آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ یکا یک قریبی جھاڑیوں سے تیتر پر مار کر اُڑے، ایک گیدڑ کسی جھاڑی سے نکل کر ایک طرف کو بھاگا۔ اب جھاڑیاں اتنی بلند ہو چکی تھیں کہ ہمارے سروں سے اونچی ہو گئی تھیں، بیچ بیچ میں درختوں کی بے ترتیب قطاریں تھیں۔ یہاں سے چند گز دور تک کا حصہ دن کی روشنی میں بھی واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا۔ اب اونچے نیچے ٹیلے شروع ہو رہے تھے، درخت اور جھاڑیاں ان ٹیلوں کے گرداگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ کہیں گڑھے تھے، کہیں کھائیاں تھیں، کہیں بھربھری چٹانیں تھیں اور کہیں جھاڑیاں غاروں کے اردگرد اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے

قدرتی پناہ گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ جھاڑیاں بلند سے بلند تر اور گھنی سے گھنی ہوتی جارہی تھیں۔ مٹی کے بنے ہوئے ایک چبوترے کے قریب پہنچ کر لمبے قد والا ڈاکو رک گیا۔ اس نے اپنی بندوق کا رخ آسمان کی طرف کر کے ایک ہوائی فائر کیا، دھماکے کی گونج ہر طرف پھیل گئی۔ پرندوں کی ڈاریں شور مچاتی ہوئی آسمان کی طرف بلند ہوگئیں، دور کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فوراً بعد کہیں دور سے جوابی فائر کی آواز آئی۔ لمبے قد والے نے پھر ہوائی فائر کیا۔ اب آنے والے کا انتظار تھا۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی پھر کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے عقب سے تیتر سے ملتی جلتی آواز آئی۔

''کالا تیتر۔۔۔ کالا تیتر۔۔۔''

پستہ قد نے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔ پھر جھاڑیوں میں ہلچل ہوئی اور ایک مضبوط جسم کا آدمی باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں تھا۔ گچھے دار گھنی مونچھیں اور سرخ آنکھیں اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہی تھیں۔

اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور یا بندوق کی بجائے لوہے کی موٹھ والا ایک بڑا ڈنڈا تھا۔

''کیا بات ہے بچل؟'' اس نے لمبے کو مخاطب کیا۔

''حکمد ادسائیں۔۔۔! ایک ڈنگر لے کر آئے ہیں، یہ سردار سے ملنا چاہتا ہے''۔

گھنی سیاہ مونچھوں اور خوفناک چہرے والے حکمد ادنے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور پھر خوفناک لہجے میں بولا۔

''کون ہے تُو ماٹھو۔۔۔؟''

ماٹھو ان علاقوں میں حقیر آدمی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا۔

''ماٹھو نہیں، مانو (بندہ) ہوں۔ سردار سے مجھے ملنا ہے۔ کیوں ملنا ہے، یہ ان ہی کو بتاؤں گا''۔

''سردار کو پہلے سے جانتا ہے تُو؟'' حکمد ادنے بھاری آواز میں پوچھا۔

''سردار بھی مجھے جانتا ہے''۔

مَیں نے اسی اعتماد سے جواب دیا۔ یہ اندھیرے میں چلایا ہوا ایک تیر تھا جو نشانے پر لگ بھی سکتا تھا، خطا بھی ہوسکتا تھا۔ ان جنگلوں میں کسی ایک ڈکیت کی حکمرانی نہیں تھی، اندر ہی اندر ان کی سرحدیں متعین تھیں اور علاقے بٹے ہوئے تھے۔ میں صرف ایک ڈاکو کی بابت جانتا تھا جسے نہال بابا کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ جب میں گوٹھ صادق علی سے فرار ہو کر پہلی مرتبہ کراچی جانے کیلئے ہائی وے کی طرف بڑھتے ہوئے علی بخش ساربان کے ساتھ ایک چھپر ہوٹل میں اترا تھا تو چند لمحوں کیلئے وہ ہائی وے پر ایک ڈاکہ ڈالنے جارہے تھے۔ علی بخش ساربان جو ماضی کا ایک ڈاکو تھا، وہاں اپنے ایک پرانے ساتھی سے بھی ملا تھا۔ علی بخش نے ڈکیتی چھوڑ کر توبہ کرلی تھی اور ساربانی کے ذریعے اپنی روزی کما رہا تھا۔ حکمد ادکچھ دیر مجھے گھورتا رہا، دانتوں سے ہونٹ کاٹتا رہا پھر واپسی کیلئے مڑتے ہوئے اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم جھاڑیاں عبور کر کے ایک گڑھے کے قریب پہنچے تو حکمد ادغائب ہوگیا۔ اس

گڑھے میں برساتی پانی بھرا ہوا تھا اور کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں، دو تین گدھے بھی پانی میں منہ ڈالے کھڑے تھے۔ چند بکریاں قریب ہی چر رہی تھیں۔ یہ گڑھا خاصے نشیب میں تھا، اس کے چاروں طرف درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ پانی بھرنے والی عورتوں میں سے چند ایک نے سر اٹھا کر حیرت اور اشتیاق سے مجھے دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئیں۔ بڑی بڑی آنکھوں، چمکتے ہوئے سفید دانتوں، سانولی رنگت اور بھرے بھرے جسم والی ایک عورت پر میری نظریں ایک لمحے کیلئے رک سی گئیں۔ وہ گھاگرے اور چولی میں ملبوس تھی اور میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ بیک وقت ہماری نظریں آپس میں ملیں تو اس نے گھبرا کے نظریں چرانے کی بجائے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ یہ اندر تک اتر جانے والی آنکھیں تھیں۔ یہ آنکھیں عکس ریز بھی تھیں اور ایکس ریز بھی۔ میں نے اپنی نظریں چرا لیں۔ سچل کی آنکھیں میری پوری نگراں تھیں۔ مجھے دانستہ ایسے راستے سے لایا گیا تھا جہاں حکمداد کو غائب ہونے اور ہمیں کچھ دیر رک کر آگے بڑھنے کا وقفہ مل سکے۔ برساتی پانی کے گڑھے کے ایک حصے سے کٹاؤ دار راستہ سیڑھیوں کی طرح اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ ہم اس پر چڑھتے ہوئے اوپر پہنچے تو غیر ارادی طور پر میں نے گھوم کر نیچے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بڑی روشن اور چمکدار آنکھیں بدستور میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اتنی دور سے بھی اس کے چمکتے ہوئے خوبصورت دانت بہت اچھے لگ رہے تھے۔ میں جلدی سے گھوم گیا۔

''سیدھے چلو''۔

میرے پیچھے چلنے والوں نے بیک وقت میری کمر پر اپنی بندوقوں کی نالیں چبھوئیں۔ یہ جھاڑیاں آگے جا کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی تھیں۔ یہاں قدرتی غاریں سی بنی ہوئی تھیں اور ان کے گرد خاردار جھاڑیاں اور پتھر پھیلائے ہوئے تھے۔ سچل ایک غار میں اترا، اس کے پیچھے میں نے اور میرے پیچھے دونوں ڈاکوؤں نے قدم اندر رکھے۔ یہ غار کسی چٹان کے نیچے ایک بڑے اور کشادہ تہہ خانے کی طرح تھا اور اس میں ہوا اور روشنی کا قدرتی نظام تھا۔ تہہ خانے میں جگہ جگہ جلی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر اور کیتلیاں اور برتن دکھائی دے رہے تھے۔ لکڑیوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ فرش پر ترپالیں، میلی چادریں اور پتھر پڑے تھے، اس جگہ کئی لوگ موجود تھے۔ درمیان میں ایک کشادہ سی جگہ پر ایک ترپال بچھی ہوئی تھی اور اس پر دو تین آدمیوں کے درمیان چھریرے جسم کا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کی پتلی پتلی مونچھیں، پتلے ہونٹ اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں بظاہر تو کوئی خاص بات نہیں تھیں لیکن ان سب کا مجموعی تاثر اسے دوسروں سے بالکل مختلف بناتا تھا اور حکمداد اس کے قریب بیٹھا تھا۔ ان سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ چھریرے جسم والے کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں بلا کی مقناطیسی کشش تھی۔ وہ دیوار سے لگے گدے سے ٹیک لگائے، ایک گھٹنا اوپر اٹھائے، اس پر اپنی کلائی رکھے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔

''غوث محمد ---!'' اس نے تیز چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیٹھ جا''۔

میں زمین پر بیٹھ گیا۔

''شروع ہو جا ---'' اس نے ہاتھ کی ایک انگلی سے اشارہ کیا۔ ''جو تیری حقیقت ہے مختصر بیان کر، جو تیرا مطلب ہے، صاف بول ---''

''سائیں ---!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''حالات کا ستایا ہوا آدمی ہوں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے پاس آ گیا ہوں مجھے اپنے پاس رکھ لیں''۔

وہ بڑے آرام سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر بے آواز ہنسی ہنسا، اس کا جسم ہلکورے لے رہا تھا اور چہرے پر اس تمسخر آمیز ہنسی کے اثرات سرخی کی صورت میں جھلک رہے تھے۔

''بہت خوب ---!'' اس نے حکمداد کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''جو حالات کا ستایا ہوا آدمی ہو، اِدھر آجائے جیسے ہم ہاتھ باندھ کر اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بہت خوب، بہت خوب ---!''

سائیں ---!'' میں نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے بستیوں اور شہروں میں آدمی کے اندر کا آدمی دیکھنے کا موقع ملا ہے، سب سے تنگ آچکا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ ان جنگلوں کے باسی اپنے الگ قاعدے قانون رکھتے ہیں۔ اب میں ان قاعدوں اور قوانین کو سمجھنا اور برتنا چاہتا ہوں''۔

''تیرا کس سے تعلق ہے''۔ حکمداد اچانک بولا۔ ''پولیس سے کہ رینجرز سے؟''

''کسی سے بھی نہیں، سائیں ---!''

''خیر اس کا پتہ ہم چلالیں گے ---'' چھریرے جسم والے سردار نے کہا۔

''ہتھیار چلاسکتا ہے ---؟''

''چلاسکتا ہوں، سائیں ---!''

''کون کون سے ہتھیار ---؟''

''تقریباً سب ---!''

''سب ---؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا، اسے یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں، سائیں، سب ---'' میں نے اعتراف کیا۔ ''کچھ وڈیروں کی چاکری نے سارے ہتھیار چلانے سکھا دیئے''۔

''کون کون سے وڈیرے ---؟'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں تذبذب میں پڑ گیا کہ جانے سردار کس وڈیرے کے زیرِ اثر تھا لیکن کچھ نہ کچھ بتانا ضروری تھا۔ میں نے گوٹھ حاجی محمد کے وڈیرے کا نام لے دیا، گوٹھ حاجی محمد کا وڈیرا صدیق محمد ایک بے ضرر اور غیر اہم وڈیرا تھا۔ سردار اس کا نام سن کر ہنس پڑا، بولا۔

''اس کا آدمی بھی بکرا ہے میری نظر میں --- وڈیرے کے اندر رعب داب ہونا ضروری ہے۔ اس بے چارے کو دیکھ کر تو ہنسی آتی ہے۔ پیسہ کتنا لایا ہے؟''

''پیسہ تو نہیں لایا سائیں ---!'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ پھر واسکٹ کی جیبوں سے پوٹلی اور اشرف کا ریوالور نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''یہ ریوالور ہے اور یہ میری ہونے والی دلہن کا زیور ہے جو میری مرحومہ ماں نے پائی پائی جوڑ کر بنایا تھا''۔

اُس نے ہاتھ بڑھا کر ریوالور اٹھالیا۔ اسے اچھی طرح چیک کیا اور پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پوٹلی کی طرف ناگواری سے دیکھ کر بولا۔

''ابھی اس کی ضرورت نہیں، اپنے پاس رکھ''۔

حکمداد نے اس کے کان میں کوئی سرگوشی کی لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر اونچی آواز میں بولا۔

''تیرے بارے میں فیصلہ ایک دو روز بعد کریں گے۔ ابھی اِدھر تیرے ٹھہرے کا بندوبست کرنا ہے، اَن پانی کا بندوبست کرنا ہے۔ حکمداد! اسے لے جا باڑے کے ساتھ والی کھوہ میں، ڈھور ڈنگر چرانے اور پانی بھرنے کا کام کرے گا''۔

حکمداد پھرتی سے اٹھا اور مجھے لے کر غار سے نکلا، باہر آ کر کہنے لگا۔

''تیرے اوپر مجھے شبہ ہے کہ تُو وہ نہیں جو اپنے منہ سے بتاتا ہے مگر پھر بھی سردار نے تجھ پر بھروسہ کر لیا ہے۔ وہ بڑے دل والا سردار ہے۔ اسے دھوکہ مت دینا''۔

''کبھی نہیں سائیں!'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے دائیں بائیں سر ہلایا۔

''پولیس میں ریکارڈ ہے تیرا—؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''بالکل نہیں، سائیں—!''

''پکی بات—؟''

''پکی بات سائیں—!''

''ٹھیک ہے—!'' حکمداد نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر سر ہلا دیا۔

میں تو سمجھتا تھا کہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے بھرے ہوئے اس جنگل میں میلوں دور تک ایک ہی مناظر ہوں گے اور ان جنگلوں، ویرانوں میں انسانوں کا رہن سہن ناممکن ہوگا۔ ڈاکو صرف چھپنے کیلئے ان جنگلوں میں پناہ لیتے ہوں گے ورنہ مختلف آبادیوں اور بستیوں میں رہتے ہوں گے جو ان جنگلوں کے آس پاس تھیں لیکن یہاں آ کر رفتہ رفتہ اس دنیا کے اسرار مجھ پر منکشف ہوتے گئے۔ یہ ایک بالکل مختلف دنیا تھی، شہروں میں جرائم کی زیرِ زمین دنیا سے بھی مختلف— یہاں سینکڑوں مربع میل میں ایسی کانٹے دار جھاڑیاں، درخت، گڑھے اور ٹیلے پھیلتے چلے گئے تھے جن میں بیک وقت سینکڑوں افراد ہو سکتے تھے۔ ڈاکوؤں کا مواصلاتی نظام بغیر کسی مشین کے بڑا مربوط اور مؤثر تھا۔ انہوں نے زبانی کوڈ کے علاوہ فائرنگ کے تبادلے کے ذریعے بھی کوڈ مقرر کر رکھے تھے۔ جب تک میں ان جنگلوں میں اندر تک نہیں آیا تھا سمجھتا رہا کہ کسی انسانی آبادی کا مستقل طور پر ان ویرانوں میں موجود رہنا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ پہلا مسئلہ خوراک کی عدم دستیابی کا تھا اور دوسرا جنگلی جانوروں کا لیکن ان جنگلوں میں آ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ دونوں مسائل آدمی کی مہارت نے حل کر لیے ہیں۔ جہاں جنگل چھدرے تھے وہاں بڑے بڑے گڑھے تھے جن میں برساتی پانی کھڑا رہتا تھا۔ لکڑی کے موٹے اور چھوٹے شہتیر کاٹ کر بعض باڑے اور پناہ گاہیں بنائی گئی تھیں۔ ان میں گائے، بیل، بکریاں اور مرغیاں تک موجود تھیں۔ بعضوں نے اپنی رہائش کے لیے بھربھری چٹانوں کو اندر سے اس طرح صاف کر لیا تھا کہ وہاں آڑے ترچھے کمرے بن گئے تھے۔ ان کمروں میں ضروریات کی چھوٹی بڑی تقریباً سبھی چیزیں موجود تھیں لیکن ہر جگہ آڑ اور حصار بندی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ کسی بھی خطرے یا غیر معمولی صورت حال کیلئے موقع پر فوری طور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کیلئے گدھے استعمال ہوتے تھے۔ باڑے میں کچھ اونٹ اور خچر بھی موجود تھے۔ خاردار

تاروں کو درختوں کے آگے پیچھے سے گزار گزار کر احاطے کی حد بندی کی گئی تھی۔ اس کے قریب نگرانی کیلئے باڑے کے اندر ہی ایک بڑے سے گڑھے کو تہہ خانے کی شکل دے کر اس پر لکڑیوں کا ایک جنگلہ رکھ دیا گیا تھا اور یہی میرا مسکن قرار پایا۔ یہ خاصا چوڑا تہہ خانہ تھا اور اس میں جگہ جگہ کٹاؤ اور بھربھری مٹی کے ڈھیر کے ساتھ لکڑیوں کے گٹھے پڑے تھے۔ دیوار پر موٹے موٹے کیلوں سے کلہاڑیاں لٹکائی گئی تھیں، موٹے رسوں کا ڈھیر تھا اور جگہ جگہ جلی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں کو کوٹ کوٹ کے بستر نما گدے بنائے ہوئے تھے، ایک طرف کمبل پڑے تھے۔ یہاں ان جنگلوں میں مستقل روشنی کی ممانعت تھی اور روشنی صرف غاروں، گڑھوں اور تہہ خانوں میں ضرورت پڑنے پر کی جاتی تھی۔ چولہے اس طرح بنے ہوئے تھے کہ ان کا دھواں بل کھا کے درختوں اور جھاڑیاں کے حصار سے بلند نہیں ہونے پاتا تھا۔ ان جنگلوں میں رہنے والوں کو ہر جھاڑی، ہر گڑھے اور ہر درخت کا علم تھا لہٰذا وہ اندھیروں میں بھی بے آواز چلتے ہوئے بڑی آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتے تھے۔ چند برس پہلے تک یہ جنگلات ناقابلِ تسخیر تھے۔ اُن دنوں ہائی وے پر دن دیہاڑے لوٹ مار کا سلسلہ بڑے تواتر سے جاری تھا، حکومت کے بڑے بڑے افسروں اور انجینئروں کے اغواء کی وارداتیں روز کا معمول تھیں۔ پولیس جان توڑ کوشش کے باوجود مجرموں تک پہنچ نہیں پاتی تھی۔ ان دنوں بہت کم ڈاکو اپنی عورتوں کو اپنے ساتھ رکھتے تھے لیکن جب پیرا ملٹری فورسز نے مسلسل آپریشنوں کے ذریعے ان جنگلوں میں چھپے ہوئے جرائم پیشہ افراد پر دھاوے بولنے شروع کیے تو کئی گروہ تتر بتر ہو گئے، جنگلوں کے ان حصوں میں چلے گئے جو بہت اندر اور بہت محفوظ تھے، وہاں ہیلی کاپٹر بھی ان کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ کچھ ڈاکو روپوش ہو گئے، کچھ پکڑے گئے اور کچھ کی ضمانتیں ان وڈیروں نے کروالیں جو آس پاس کی آبادیوں میں رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان جنگلوں کے اسرار اور ہیبت کا طلسم ٹوٹتا گیا۔ ڈاکوؤں کیلئے ان جنگلوں میں مستقل طور پر پوشیدہ رہنا ناممکن ہو گیا، انہوں نے وارداتوں کے سلسلے محدود کر دیے، اپنے ساتھ بیوی بچوں کو رکھنے لگے اور آہستہ آہستہ جنگل ان کی آماجگاہ بن گیا بھولے بھٹکے اگر پولیس یا رینجرز کے سپاہی ادھر آ بھی نکلتے انہیں ڈاکوؤں کی بجائے کام کاج کرتی عورتیں، لکڑیاں کاٹتے مرد اور پانی بھرتے بچے ملتے۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص پر اس لیے قانونی گرفت نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ جنگل میں آباد ہیں، جنگل میں رہنا بسنا قانوناً کسی جرم میں نہیں آتا اس لیے ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم بھی کرتے تھے، محفوظ بھی رہتے تھے۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کو اپنی دولت کی حفاظت اور توسیع کیلئے ہمیشہ ایسے افراد کی ضرورت تھی جنہیں وقت پڑنے پر وہ اپنی طاقت کے اظہار لیے بھی استعمال کر سکیں۔ بعض ڈاکو ایسے تھے جو آبادیوں کے متمول افراد سے بھتے وصول کرنے جاتے تھے اور بعض وڈیرے اور جاگیردار ایسے بھی تھے جو بعض گروہوں کی پشت پناہی کے ساتھ ساتھ ان سے خود بھتے بھی وصول کرتے تھے، یہ بھتے دراصل ان جرائم پیشہ افراد کو قانونی گرفت سے بچائے رکھنے کا معاوضہ ہوتے تھے۔ بعض وڈیروں کے ہاتھ لمبے تھے اور بعضوں کے ہاتھ تو اتنے لمبے تھے کہ سرکار دربار تک ان کی رسائی تھی، کوئی محکمہ نہیں تھا جہاں ان کا مخصوص اثر و رسوخ نہ ہو۔ چھریرے بدن کے اس اس پھرتیلے ادھیڑ عمر سردار کا نام نہال چند تھا۔ وہ مسلمان تھا اور نہال بابا کہلاتا تھا۔ یہ وہی نہال تھا جو مجھے گوٹھ قاسم علی کے راستے میں ایک چھپر ہوٹل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دکھائی دیا تھا۔ جب میں گوٹھ صادق علی سے فرار ہو کر کراچی جا رہا تھا اس وقت نہال اور اس کے ساتھیوں کے چہروں پر نقابیں تھیں۔ وہ لوٹ مار کیلئے جاتے جاتے چائے پینے کیلئے اس چھپر ہوٹل میں رک گئے تھے۔ حکمداد قصاب رہ چکا تھا۔ ایک جھگڑے میں جیل گیا اور وہاں سے فرار ہو کر نہال بابا کے گروہ

میں آشنا ہوا۔ اس کے چہرے بشرے سے وحشت اور درندگی جھلکتی تھی لیکن اس کے بارے میں یہ میرا ابتدائی تاثر تھا۔ چند ہی روز میں وہ میری جسمانی طاقت کے چند مظاہرے دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور میرا دوست بن گیا۔ نہال بابا کا وہ سب سے قریبی ساتھی تھا۔ میری تعریفیں کر کے اس نے نہال بابا کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا کر دیا۔ دن کو میں لکڑیاں کاٹنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل کے مشرقی حصے میں جاتا تھا۔ یہاں قد آور درخت تھے اور ان کی لکڑیاں بہت سے کام آتی تھیں۔ رات کو میں باڑے کے تہہ خانے میں سوتا تھا، دن کو گیدڑوں اور خرگوشوں کے علاوہ اور کوئی جانور یہاں دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن سورج ڈوبتے ہی بھیڑیوں کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ حکمداد نے بتایا کہ بھیڑیوں نے اب تک ان پر حملہ تو نہیں کیا لیکن ان پر بھروسہ بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا کہ بھیڑیے آخر بھیڑیے تھے، ان سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی، احتیاط کے طور پر میرے پاس تہہ خانے میں ٹارچ اور کلہاڑیاں موجود رہتی تھیں، اوپر مضبوط اور گتھی ہوئی لکڑیوں کا بھاری جنگلہ لگا ہوا تھا۔ رات کو ویسے بھی مجھے جلدی نیند نہیں آتی تھی۔ اکثر نیند میں مجھے مویشیوں کے شور مچانے اور بھیڑیوں کے غرانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں لیکن صبح کو ایک آدھ مرغی کی گمشدگی کے علاوہ اور کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی، بھیڑیوں نے ابھی بکریوں اور میمنوں پر اپنے دانت نہیں آزمائے تھے۔ میرا اپنا ریوالور ہر وقت میری پیٹی میں میرے لباس کے نیچے جسم سے بندھا رہتا تھا۔ اب تک کسی نے میری جسمانی تلاشی نہیں لی تھی اور اب تو یہ امکان بھی ختم ہو چکا تھا۔ زیورات کی پوٹلی بھی میں قمیض کے نیچے پہنی ہوئی صدری کی جیب میں رکھتا تھا۔ حکمداد سے جب اچھی دوستی ہوگئی تو ایک روز اس نے زیورات کے سلسلے میں مجھے لاپرواہی ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''غوث محمد! تُو سمجھتا ہے کہ تیرے زیور تیرے پاس محفوظ ہیں لیکن تُو ایک بات بھول گیا ہے کہ تقریباً ہر آدمی کو پتہ ہے کہ تیرے پاس خاصی مالیت کے زیورات ہیں۔ خیر میرے ہوتے ہوئے تو ان کا گم ہونا یا چرایا جانا ممکن نہیں لیکن کسی کی نیت کا کوئی بھروسہ نہیں تُو احتیاط کیا کر''۔

''کیا احتیاط کروں؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

'بس دھیان رکھا کر--- کام کاج میں کہیں اِسے اِدھر اُدھر رکھ کر نہ بھول جانا''۔ وہ اپنی گچھے دار مونچھوں کے نیچے مسکرایا۔

''ایسا تو خیر، میں بھی کچا نہیں سرکار---!'' میں نے نادانستگی میں صدری پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جو زیور لینا چاہے گا اسے چھ فٹ کے اس بھاری جثے پر قابو پانا پڑے گا اور مجھے گروہ میں ایسا تو کوئی شیر نظر نہیں آتا''۔

''اس میں کیا شک ہے''۔ وہ مجھے رشک آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سردار دو چار دن میں ایک خاص کام تیرے ذمے لگائے گا، اس وقت ٹھیک پتہ چلے گا کہ چھ فٹ کا یہ بھاری جثہ کتنے کام آسکتا ہے؟''

O

ان چند دنوں میں سردار سے میری ملاقات کی نوبت بہت کم آئی تھی۔ وہ جنوب کی سمت درختوں کے جھنڈ میں کسی جگہ رہتا تھا مگر مجھے وہ جگہ بتائی نہیں گئی تھی۔ بڑے سے تہہ خانے میں جہاں پہلے دن میری اس سے ملاقات ہوئی تھی، وہیں عموماً ہم کھانا کھانے کیلئے دوپہر یا شام کو کسی وقت اکٹھے ہوتے تھے۔ سردار بہت کم باتیں کرتا تھا، زیادہ تر خاموشی سے مجھے گھورتا رہتا تھا۔ ابتدا اُن نگاہوں میں قہر، دہشت اور تعجب کی پرچھائیاں

نظر آتی تھیں مگر پھر رفتہ رفتہ یہ تاثرات زائل ہوگئے۔ اب ان آنکھوں میں شناسائی کی مدھم چمک نظر آتی تھی اور بس — وہ رسمی علیک سلیک یا پرسشِ حال کا قائل نہیں تھا، صرف چند لفظوں میں کام کی بات کرتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا۔ اسے پروا نہیں ہوتی تھی کہ مخاطب پر اس کی باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ''ٹھیک ہے غوث محمد — کوئی شکوہ شکایت — تیرے کو اَن پانی ملتا ہے کہ نہیں ملتا۔ مرغیاں غائب نہیں ہونی چاہئیں۔ ڈھور ڈنگر کا خاص خیال رکھ''۔ بس یہی اس کے اور میرے درمیان باتیں ہوتی تھیں۔

اس روز شام ہی سے بادل چھا گئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں درختوں اور جھاڑیوں میں سرسرا رہی تھیں، سیٹیوں جیسی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اول تو ان صحراؤں بیابانوں میں بارش نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی تھی تو ایک نعمت غیر مترقبہ کے مترادف تھی۔ چند گھنٹوں میں گڑھے بھر جاتے تھے اور سبزے پر جمی ہوئی گرد صاف ہو جاتی تھی، جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ عورتیں اور بچے، بوڑھے اور جوان سب کھلے آسمان تلے آ کر پانی میں بھیگتے تھے اور اپنے جسموں کا میل کچیل دھوتے تھے۔ ان کے حلق سے مارے خوشی کے طرح طرح کی چیخیں نکلتی تھیں۔ اس وقت حکم داد میرے ساتھ باڑے کے نزدیک مرغیوں کیلئے ترپال ڈالنے والوں کو دیکھ رہا تھا، وہ میرے ساتھ کام میں جٹے ہوئے تھے۔ حکمداد ایک بھربھرے ٹیلے پر کھڑا تھا، کہنے لگا۔

''ایک ترپال لکڑیوں کے جنگلے پر بھی ڈال لینا ورنہ سارا پانی اندر جائے گا''۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک شخص کو بڑے تہہ خانے کی طرف دوڑایا تاکہ وہاں سے ترپال لے آئے۔ پیچھے درختوں کے جھنڈ سے عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اِدھر سب آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے اور بارش کے منتظر تھے۔ سب کے چہرے کھل اُٹھے۔ لکڑیوں کے جنگلے پر ہم نے بڑی سی سبز ترپال ڈال دی تھی۔ اب کام کرنے والے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں حکمداد کے ساتھ کھانا کھانے بڑے تہہ خانے کی طرف چل پڑا، وہاں بھی ترپال پڑ چکی تھی اور سردار خاموشی سے بیٹھا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چراغ جل رہے تھے، بڑا خوفناک اور پُراسرار منظر تھا۔ آج بھیڑ کا گوشت بھونا گیا تھا، بڑے بڑے توے پر پکائی ہوئی روٹیوں کے ساتھ اچار اور پیاز کی گانٹھیں بھی تھیں، کھانے میں ایسا اہتمام اس سے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔

''کوئی خاص بات ہے شاید —؟'' میں نے سرگوشی میں حکمداد سے پوچھا۔

''ہاں —'' وہ روٹی کے ایک بڑے سے نوالے میں گوشت لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''خاص ہی سمجھو — سردار مہم پر جا رہا ہے''۔

''کون سی مہم —؟'' میں نے کھاتے کھاتے نوالہ روک کر پوچھا۔

''بس ہے ایک مہم —''

اس نے بات گول کرتے ہوئے کہا، پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا بہت لذیذ تھا مگر بڑی عجلت میں کھایا گیا۔ کھانا کھاتے ہی سردار اُٹھ کھڑا ہوا، اپنے گدے کے نیچے سے اس نے آٹومیٹک رائفل اٹھائی اور بڑی سی چادر کو کاندھے سے گزار کر پہلو میں گرہ دی۔ حکمداد اور دوسرے بھی اسلحہ اور سامان اٹھانے لگے۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے ان کے ساتھ اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تُو اپنے باڑے میں چل---'' حکمداد نے سردار سے مشورے کے بعد کہا۔ ''دھیان رکھنا''۔

پھر وہ تہہ خانے میں موجود لوگوں کو سردار کی ہدایت کے مطابق حکم دینے لگا۔ چند لوگوں کو پیچھے رہنا تھا، باقی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ پُر جوش نظر آ رہے تھے حالانکہ آندھی طوفان کے موسم میں ایک عام آدمی کے لیے اس جنگل میں دو قدم چلنے کا تصور بھی محال تھا لیکن ان کا جوش و خروش دیکھ کر لگتا تھا کہ انہیں یہ ساعت بڑی دیر بعد میسر آئی ہے۔ میں ٹارچ کی مدد سے اپنے باڑے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب بوندیں تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔ آسمان بادلوں کی وجہ سے سرِ شام ہی سیاہ ہو گیا تھا، اب گھنی جھاڑیوں اور اونچے درختوں نے ماحول کو گھپ اندھیرے میں اس طرح تبدیل کر دیا تھا کہ ایک قدم آگے کی چیز صاف نظر نہیں آتی تھی۔ باڑے کے پاس پہنچ کر میں رک گیا۔ ٹارچ کا لرزتا ہوا دائرہ لکڑیوں کے جنگلے پر پڑی ہوئی ترپال پر رینگ رہا تھا جاتے وقت میں نے پانی کو اندر جانے سے روکنے کے لیے ترپال کے کناروں پر پتھر رکھ دیے تھے لیکن اب وہ پتھر نظر نہیں آ رہے تھے، غالباً مویشیوں کی بھاگ دوڑ میں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ میں ترپال کا کونا اٹھا کر جنگلے سے نیچے اترا۔ اس غار میں کٹاؤ اور سیڑھیاں تھیں جن پر بڑی آسانی سے پاؤں رکھ کر اترا چڑھا جا سکتا تھا۔ آخری کٹاؤ اور سیڑھی سے فرش پر چھلانگ لگا کر میں نیچے آ گیا میرے پیروں تلے زمین نرم اور گیلی تھی، یقینی طور پر بارش کا پانی اوپر سے رس رس کر نیچے آیا تھا۔ اترتے ہوئے میں نے ترپال کے کنارے لکڑی کے جنگلے میں اچھی طرح اڑیس دیے تھے، اب پانی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ آگے جا کر دائیں طرف دیوار کے ساتھ لکڑیوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے میرا بستر تھا۔ یہ بستر جھاڑیوں کو کوٹ کوٹ کر اس پر ٹاٹ بچھا کر بنایا گیا تھا، اتنے آرام دہ، نرم اور گرم بستر کا تصور متمدن دنیا کی چمکتی دمکتی کوٹھیوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اندھیرے میں اندازے سے بستر کے قریب پہنچ کر حسبِ عادت ٹارچ کی روشنی میں بستر کا جائزہ لینا چاہا مگر جیسے ہی میں نے ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی سامنے پڑی، اچانک میں بری طرح اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور ٹارچ میرے ہاتھ سے گر پڑی۔ سامنے بڑی بڑی روشن آنکھوں، تیکھے نین نقش، سانولے رنگ اور بھرے بھرے جسم والی عورت کھڑی تھی جسے پہلے دن میں نے برساتی نالے سے پانی بھرتے دیکھا تھا۔

''تت۔تت۔تم---!''

O

میں حواس باختہ ہو گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں اندھیری رات میں، برستی ہوئی بارش میں اس غار کے اندر اس سے ملاقات ہو گی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ بڑی ہی دلکش ہنسی تھی کھنکھناتی ہوئی، گھنگھرو بجاتی ہوئی، انگ انگ میں پھیل کر سنسناہٹ پیدا کرتی ہوئی۔

''ڈر گئے---'' وہ کھلکھلائی۔ ''اتنے اونچے لمبے، چوڑے چکلے مرد ہو کر ڈرتے ہو---؟''

''نن--- نہیں--- نہیں---'' میں نے فوری طور پر خود پر قابو پانے کی کوشش میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''تم جاؤ''۔

''جانے کیلئے میں نہیں آئی۔'' اس نے رک رک کر اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں--- کیوں آئی ہو تم یہاں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''بس، یونہی---'' اس نے بس کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ، کھڑے کیوں ہو؟''

''کیسے بیٹھ جاؤں؟'' میں نے بدستور گھبراتے ہوئے کہا۔

''ایسے---''

اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ مجھے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ میں بے خیالی میں کھڑا تھا، ڈگمگا کر بستر پر اس طرح گرا کہ وہ میرے نیچے دب گئی۔ میں بدک کر ایک طرف ہٹا تو وہ آہستہ سے اٹھ کر میرے قریب بیٹھ گئی، اتنے قریب کہ اس کا جسم میرے جسم سے مس ہونے لگا۔ میں نے پرے ہٹنا چاہا مگر اس نے دونوں بازوؤں سے مجھے پکڑ کر لیا۔

''غوث محمد---!'' چند لمحوں بعد اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ''یہی نام ہے ناں تمہارا؟''

''ہاں یہی ہے''۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

''یہ کوئی راز تو نہیں''۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''سب جانتے ہیں کہ تمہارا نام غوث محمد ہے، تم حالات کے ستائے ہوئے انسان ہو مگر یہ حالات کون سے ہیں یہ کسی کو نہیں پتا۔ یہی میں تم سے پوچھنے آئی ہوں، اتنے دنوں سے موقع ڈھونڈ رہی تھی''۔

جو الفاظ میں نے سردار کے سامنے اپنے منہ سے نکال کر اپنا تعارف کرایا تھا، وہی الفاظ سارے جنگل میں پھیل گئے تھے۔ عجیب لوگ تھے، عورتوں کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ جنگل میں آنے والا نو وارد حالات کا ستایا ہوا ہے؟

''حیران کیوں ہو گئے---؟'' وہ میرا بازو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم زیور بھی اپنے ساتھ لے کر آئے ہو حالانکہ زیور تو عورت کے پاس ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا---؟''

اب اس کی خوشبودار گرم سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ میں بے زاری سے کسمسایا، مجھے وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک عورت کا آتشیں قرب بہت عرصے کے بعد مجھے نصیب ہوا تھا۔ سارے جسم میں بے چینی کی لہریں سی دوڑنے لگی تھیں، لہو میری رگوں میں دہکنے لگا تھا۔ پتہ نہیں یہ عورت کون تھی جو اتنی جی داری سے اس طرح سے میرے پاس آ گئی تھی۔ اس کا مقصد کیا تھا، اتنی ہمت اس نے کس طرح کر لی تھی؟ کئی سوالات تھے جو میرے ذہن میں منڈلا رہے تھے۔

''تت--- تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پھر اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''سکھاں---'' اس نے آہستہ سے کہا، بڑے میٹھے اور مدھر انداز میں اس کے ہونٹوں نے ''سکھاں'' کی ادائیگی کی۔ ''ایک بات اور---'' اس نے پھر ہنس کر گھنٹیاں سی بجا دیں۔ ''ذرا حوصلے کے ساتھ سننا، ٹھیک ہے نا---!'' پھر وہ میرے کان پر اس طرح جھکی کہ اس کا آدھا جسم میرے کاندھے پر جھول گیا۔ ''میں نہال بابا کی سالی ہوں، اس کی دوسری بیوی کی بیوہ بہن''۔

''نن، نہال بابا کی سس، سالی--- دوسری بب بیوی کی بب بیوہ بہن''۔

میں نے ہکلاتے ہوئے دہرایا۔ اس انکشاف نے میرا دوران خون تیز کر دیا تھا، مجھے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر تقدیر کے

پھندے مجھے چاروں طرف سے جکڑ رہے تھے۔ میں شیر کی کچھار میں پھنس گیا تھا اور کسی بھی دن کسی بھی لمحے، کسی بھی سمت سے گرجتے دھاڑتے شیر کا حملہ متوقع تھا۔ پتہ نہیں میرے ساتھ مسلسل ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے زندگی ایک بپھرا ہوا سمندر ہے اور میں اس کی لہروں پر بہتا ہوا ایک بے دست و پا آدمی ہوں۔ سمندری طوفان کی لہروں پر ڈوبتا ابھرتا بے ارادہ، بے بس اور بے سہارا آدمی!۔۔۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ میں ایک طرف سکڑ اور سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بلائے بے درماں سے جان کیسے چھڑاؤں؟

''گھبرا گئے نا۔۔۔؟'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم گھبرا جاؤ گے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کسی کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں کہ میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ بس تم اپنی زبان بند رکھنا، میری طرف سے مطمئن رہو۔ عورت جب گھپ اندھیرے اور تنہائی میں کسی غیر مرد کی طرف جانے کیلئے قدم بڑھائی ہے تو اس کے ماتھے پر عقاب کی آنکھیں ہوتی ہیں اور جسم میں شیرنی کا دل''۔

یہ کہہ کر وہ میرے قریب سرک آئی۔ باہر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں پر بارش کی موٹی بوندیں اور ہوا کے جھکڑ شور مچا رہے تھے، دور کہیں بلندی سے نشیب میں پانی گر رہا تھا۔ ایک بار بجلی زور سے چمکی اور وہ اچھل کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

''تین برس پہلے خاوند ڈکیتی کی ایک واردات کے بعد فرار ہوتے ہوئے گوٹھ صادق علی میں گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا، گولیاں حویلی کی چھت سے چلائی گئی تھیں۔ اس واردات میں اس کے ساتھ نہال بابا اور اس کے بارہ ساتھی بھی تھے۔ ان کا ارادہ گوٹھ کے ہندو صراف کو لوٹنے کا تھا، واردات طے شدہ منصوبے کے مطابق کامیابی سے ہوئی تھی لیکن واپس آتے وقت لوگوں کی چیخ پکار نے بستی کے چوکیداروں کو چوکس کر دیا تھا، وڈیرے نے بھی دو خونخوار کتے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ ان کتوں سے بچتے بچاتے وہ حویلی کی گلی میں آ پھنسے تھے۔ اسی وقت ان پر چھت سے ٹارچ پڑی، دوسرے ہی لمحے ایک بندوق آگ اگلنے لگی۔ میرا خاوند مستان سب سے آگے تھا، وہی نشانہ بنا مگر ساتھیوں نے اس کی لاش گلی میں نہیں چھوڑی، اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ انہی جنگلوں میں اسے دفن کیا گیا۔ تب سے اب تک میں نے بار بار ایک ہی عہد دہرایا ہے کہ ہر حالت میں خاوند کے قاتل کو تلاش کر کے اسے خود موت کے گھاٹ اتاروں گی''۔

میرے ذہن میں بجلی کے کوندے سے لپکنے لگے، سکھاں بول رہی تھی اور میرے ذہن میں جھماکے ہو رہے تھے۔ جس رات یہ واقعہ رونما ہوا۔ میں ڈاگ ہاؤس کے نزدیک ایک چارپائی بچھائے رحیم بخش کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ حویلی کے زنان خانے سے وڈیرا جلال دین کی گرجتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔

''رحیم بخش، منگا، جیون، بخشو، نبی بخش! کتے کھول دو۔ حویلی کی چھت پر جا کر دیکھو، دیکھو، باہر کیا ہو رہا ہے؟''

مَیں نے رحیم بخش کی بندوق اٹھائی اور رحیم بخش ڈاگ ہاؤس کا جالی دار دروازہ کھولنے لپکا۔ میں نے چھت کی سیڑھیوں کی طرف زقند لگائی، جب میں چھت پر پہنچا تو ایک ملازم گلی میں ٹارچ کی روشنی پھینک رہا تھا جیسے ہی ڈاکوؤں پر روشنی پڑی انہوں نے جان بچانے کیلئے فائرنگ شروع کر دی، ایک گولی ملازم کے کندھے پر لگی اور جان بچانے کیلئے چھت پر اوندھے منہ دھڑام سے گرا۔ میں نے نال کا رخ چھت کی منڈیر سے گلی کی سمت گھمایا اور ٹرائیگر پر انگلی رکھ دی، دوسرے ہی لمحے میری بندوق آگ اگل رہی تھی اور نیچے سے ایک بھیانک چیخ سنائی دی تھی۔ چھت کی طرف

مسلسل فائر ہوئے، کئی چیختی ہوئی آوازیں ابھریں۔ پھر بھاگتے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ اگلے دن وڈیرے نے شاباش دینے کی بجائے بڑی نخوت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا تھا۔

''اب تک معلوم نہیں ہوا کہ ڈاکو زخمی ہوا تھا یا مرا تھا، مر جاتا اور اس کی لاش میری حویلی کے آگے سے برآمد ہوتی تو پھانسی کا پھندہ تیرے گلے میں پڑتا۔ کس خنزیر نے تجھے فائرنگ کا آرڈر دیا تھا؟''

''سائیں، وڈیرا—!'' میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ ''انہوں نے فائر کر کے میرے ساتھی کا کندھا توڑ دیا تھا۔ وہ ہماری جان لے سکتے تھے، اسی لیے مجبوراً مجھے فائر کھولنا پڑا''۔

''بڑا آیا فائر کھولنے والا—!'' اس نے نفرت سے بھوئیں سکوڑیں۔ ''چل دفع ہو— باہر بات کرنے کی ضرورت نہیں، تفتیش ہوگئی تو میں خود سنبھال لوں گا''۔

مگر حویلی کے معاملات کی تفتیش کی ہمت کس میں تھی، اس گوٹھ کے کس شخص میں میں دم خم تھا؟ بات کو دبنا ہی تھا، دب گئی اور آج وہ عورت برستی ہوئی بارش اور گھپ اندھیرے میں میرے پہلو سے لگی بیٹھی تھی جس کے خاوند کو میری چلائی ہوئی گولی نے ہلاک کر دیا تھا۔ اس انکشاف نے میرے اعصاب جھنجھوڑ کے رکھ دیے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری گولی کسی کی موت کا سبب بن سکتی تھی۔ اس رات کے واقعات جب بھی میرے ذہن کے پردے پر ابھرے، صرف یہی خیال آتا رہا کہ میں نے حویلی کے مکینوں کا خاندانی نمک خوار ہونے کے ناطے گولی چلا کر ڈاکوؤں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا اور ممکن ہے میری گولی سے کوئی ڈاکو زخمی ہو گیا ہو مگر قتل؟— اس کا دور دور تک میرے ذہن میں کوئی تصور نہیں تھا۔

''کیا سوچنے لگے—؟'' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''آں—'' میں نے چونک کر زور سے سر جھٹکا۔ ''کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں''۔

''جو ہونا تھا، وہ تو چکا—'' وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ ''لیکن میرے اندر انتقام کی جو آگ ہے وہ اب تک بجھی نہیں۔ وقت کی راکھ کے نیچے ابھی انگارے دہک رہے ہیں''۔

''مگر قاتل تمہیں کیسے ملے گا؟'' بے ساختہ میں نے پوچھا۔ ''حویلیوں میں تو کئی ملازمین ہوتے ہیں۔ یہ تمہیں کون بتائے گا کہ کدھر سے گولی چلا کے تمہارے خاوند کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ سردار نے کچھ سن گن لینے کی کوشش کی ہوگی، کچھ تو پتہ چلایا ہوگا؟''

''بہت کوشش کی''۔ وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔ ''کئی آدمی اس کام پر لگائے لیکن تین برس بیت گئے، اب تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ خیر کبھی نہ کبھی تو پتہ چل ہی جائے گا۔ قتل چھپتا تو نہیں ہے۔ نہیں چھپتا نا؟''

مجھے یوں لگا جیسے اندھیرے میں اچانک اس کی آنکھوں میں شعلے سے ناچ اُٹھے ہوں، آگ سی بھڑک اٹھی ہو مگر یہ میرا وہم تھا۔ آگ اس کی آنکھوں میں نہیں، اس کے جسم میں بھڑک رہی تھی۔ برہا کے غم میں سلگتی ہوئی ایک عورت کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے اور ایک قد آور، توانا اور مضبوط مرد اس کے دل میں چھپے ہوئے، دبے ہوئے گھٹے ہوئے جذبوں کو زبان دینے کا باعث بن گیا تھا۔ اب یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ وہ

مرد اس کے خاوند کا قاتل تھا اور وہ اتنے قریب آ کر بھی اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ مَیں اس کے لئے حالات کا ستایا ہُوا غوث محمد تھا بلکہ غوث محمد بھی نہیں تھا۔ میرا کوئی نام، کوئی شناخت نہیں تھی۔ میں ایک تندرست و توانا، لحیم شحیم جوان مرد تھا اور بس! اسے ایک مرد کی رفاقت درکار تھی اور اسی رفاقت کے اشتیاق میں وہ اس گھپ اندھیرے اور تنہائی میں قبر جیسے غار میں مرد کے پاس آئی تھی لیکن اس کے انکشاف نے مجھ سے میری تمام حسیات سلب کر لی تھیں، میرا جسم پتھر کا بے جان مجسمہ بن کر رہ گیا تھا۔ ایک دل تھا جو دھڑک رہا تھا احساسِ ندامت اور دکھ کے ساتھ — میں نے صدری سے زیورات کی پوٹلی نکالی۔

''سکھاں —!'' پہلی بار میں نے اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ ''یہ زیور میری ماں نے میری دلہن کیلئے خریدے تھے۔ اب یہ میرے کسی کام کے نہیں۔ تم رکھ لو''۔

''تمہاری شادی نہیں ہوئی —؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''ابھی تک تو نہیں —'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''مگر کیوں —؟'' وہ بدستور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''وجہ کیا ہے؟ — اچھے بھلے مرد ہو بلکہ اتنے اچھے کہ سکھاں دل ہار بیٹھی اور تمہارے پاس بن بلائے چلی آئی زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار ایک غیر مرد کے پاس''۔

چند لمحوں کیلئے دونوں طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خاموشی میں چھما چھم برستی بارش کی بوندوں کا شور گونجتا رہا، ہوا شائیں شائیں درختوں اور جھاڑیوں سے گزرتی رہی۔ باڑے کے مویشی جنہوں نے درختوں کے نیچے پناہ لے تھی اور اب بارش کی شدت سے پریشان ہو کر شور مچانے لگے تھے۔

''یہ رکھ لو''۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر اس کا ہاتھ پکڑا اور پوٹلی اس پر رکھ دی۔

''مگر —'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ ''ان کا میں کیا کروں گی؟''

''تمہارا جو بھی جی چاہے''۔ میں نے پیار سے کہا۔ ''انہیں میری طرف سے تحفہ سمجھ لو۔ جو مرضی سمجھ لو مگر خدا کیلئے، قبول کر لو''۔

وہ تذبذب کے عالم میں چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی، الجھتی رہی، مسلسل انکار کرتی رہی لیکن میرے اصرار سے مجبور ہو کر چپ ہو گئی۔ پوٹلی اس نے اپنی چولی میں اڑس لی۔ پھر میرے قریب ہو گئی، آہستہ سے اس نے دونوں بازو میرے گلے میں حمائل کر دیئے۔ اس کے جذبات بھڑک رہے تھے مگر میرا وجود پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت تھا میں اس کا مجرم تھا۔ چند ساعتیں اسی طرح بیت گئیں۔ پھر وہ میری طرف سے کوئی پیش قدمی نہ پا کر قدرے مایوس سی ہو گئی، بے دلی سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

''اچھا، میں اب چلتی ہوں''۔

''پھر کب آؤ گی —؟''

بے ساختہ مرے منہ سے نکل گیا تو وہ پلٹ کر دیوار کے کٹاؤ دار زینوں پر پاؤں رکھتے رکھتے رک گئی۔ پھر کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔

''جب تم سچ مچ مرد بن جاؤ گے''۔

یہ کہہ اس نے لکڑیوں والا جنگلہ اٹھایا، ترپال ہٹائی اور پانی میں چھپا چھپ کرتی ہوئی باڑے سے نکل گئی۔ دیر تک کیچڑ اور پانی میں اس کے قدموں کی چھپا چھپ میرے کانوں میں گونجتی رہی، میرے اعضاء جھنجھوڑتی رہی اور پھر بارش کے شور میں گم ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد میں ٹارچ لے کر باہر نکلا۔ مرغیوں کی ترپال درست کی، مویشیوں کو ہانک کر ترپال کی آڑ میں لے آیا۔ اب بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اور موٹی بوندوں نے ہلکی پھوار کا روپ دھار لیا تھا لیکن رہ رہ کے بجلی چمک اٹھتی تھی اور بکریاں گھبرا کر ممیانے لگتی تھیں۔ میں غار کے اندر آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس گھپ اندھیرے میں سکھاں کی خوشبو میں سکھ کی بجائے دکھ اور ندامت کی سوئیاں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں تھیں۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی، میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

O

صبح کو سردار اپنے ساتھیوں کے ساتھ لوٹ آیا۔ وہ کامیاب واردات سے لوٹے تھے لہٰذا رات بھر کے سفر اور جگراتے کے باوجود مضمحل نہیں تھے، چہک رہے تھے۔ میری ان سے ملاقات دوپہر کو کھانے کے بعد بڑے تہہ خانے میں ہوئی۔ سردار مجھے خلافِ معمول بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کھانے کے بعد جب سب اٹھنے لگے تو اس نے ہاتھ کے اشارے مجھے روک لیا۔ حکمداد بھی ہمارے قریب بیٹھا تھا، اس کے تیور کچھ بدلے بدلے سے تھے۔ سردار چند لمحوں تک مجھے تولنے والی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر مضبوط لہجے میں بولا۔

''غوث محمد! کوئی بات کبھی چھپتی نہیں، یاد رکھنا''۔

اس کے ساتھ ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سا شکاری چاقو نکال لیا، کھٹکا دباتے ہی اس کا بڑا سا چمکدار پھل باہر نکل آیا۔ یقیناً سردار کو رات کے واقعے کی تفصیلات مل چکی تھیں۔ اب وہ میرا حساب بے باق کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے فوری حملے سے بچاؤ کیلئے مکھیوں سے قریب پڑی ہوئی ایک بڑی سی لکڑی کو نظر میں رکھ لیا، بڑی آسانی سے میں ان دونوں پر قابو پا سکتا تھا لیکن حملے میں پہل کرنے کی بجائے مجھے انتظار کرنا تھا۔

''شک مجھے پہلے ہی تھا''۔ سردار نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''لیکن ثبوت کا انتظار تھا اور یہ ثبوت رات کو باہر نکلتے ہی مجھے مل گیا''۔

میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ یقینی طور پر اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے غیر محسوس طریقے پر لکڑی کی طرف سرکنا شروع کیا، پانچ چھ فٹ لمبی اور مضبوط لکڑی مجھے جان بچانے میں فوری مدد فراہم کر سکتی تھی۔

''جہاں ہو، وہیں بیٹھے رہو''۔ اس نے چاقو لہرایا۔ ''آرام سے بیٹھ جاؤ، آرام سے --- سمجھے نبی بخش جنگی!''

O

اچانک یوں لگا جیسے بھربھری چٹان پوری کی پوری مجھ پر آ پڑی ہو۔ سردار مسکرایا۔

''ہاں، نبی بخش جنگی! تمہاری حقیقت مجھ پر مکمل کھل چکی ہے۔ رات ہم منشی قاسم کے مہمان تھے''۔

میرا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ مجھے سردار کے اطمینان اور تحمل پر حیرت ہو رہی تھی۔ اب وہ چاقو کی دھار پر ایک انگلی پھیر رہا تھا۔

''سب کچھ معلوم ہونے کے بعد''۔ وہ ایک سانس لے کر بولا۔ ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تُو ایک جیدار آدمی ہے اور مجھے جیدار مرد پسند ہیں۔ وڈیرا سردار محمد بدقسمت آدمی ہے، اس نے تیری قدر نہیں کی۔ اسے تیرے جیسے آدمی نہیں چاہئیں، تیرے جیسے آدمی کی ضرورت یہاں ہے''۔ یہ کہہ اس نے چاقو ایک کھٹکے سے بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر بولا۔ ''یہاں ہے تیری جگہ، نہال بابا نے بہت کم لوگوں کو یہاں رکھا ہے کیوں حکمداد، گواہی دے''۔

حکمداد نے زور سے سر ہلایا اور میری طرف محبت پاش نظروں سے دیکھ کر مسکرانے لگا لیکن میرا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا!

سردار بول رہا تھا مگر میرا ذہن کسی اور طرف الجھا ہوا تھا، میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ جس انداز میں اس نے بات شروع کی تھی اس سے میں فی الفور یہی سمجھا تھا کہ اسے میرے غار میں سکھاں کی آمد کا پتہ چل گیا ہے اور فوراً کوئی قدم اٹھا کر مجھے نقصان پہنچانے کی بجائے دھیرے دھیرے مزے لے لے کر، ہراساں کر کے مجھے ذہنی اور قلبی طور پر مفلوج کر کے مارنا چاہتا ہے لیکن جب اس نے میری توقع کے بالکل برعکس بات کی تو میرا سر چکرا گیا۔ وہ وڈیرے سردار محمد کے منیجر قاسم علی سے مل کر آیا تھا اور بتا رہا تھا کہ اسے میرے بارے سب کچھ معلوم ہو گیا ہو لیکن ساتھ ہی اس نے یہ کہہ کر مجھے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ بہادر لوگوں کی قدر کرتا ہے اور میری جگہ سردار محمد کی حویلی میں نہیں اس کے دل میں ہے۔ مگر قاسم علی سے اس کی کیا باتیں ہوئی ہیں؟— یہی سوال بار بار میرے ذہن میں اُٹھ رہا تھا اور میں اضطرابی انداز میں پہلو بدل رہا تھا لیکن سردار نے تفصیلات نہیں بتائیں، صرف اتنا کہا۔

''صرف ایک کام تم سے لینا ہے۔ وہ مَیں بعد میں بتاؤں گا''۔

یہ ملاقات یہیں ختم ہو گئی، بعد میں حکمداد نے جب مجھے تفصیلات بتائیں تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سردار نہال بابا، وڈیرے سردار محمد کا روپوش مددگار تھا۔ اس قسم کے مددگار کئی وڈیروں نے پال رکھے تھے ان سے ہر کام کروایا جا سکتا تھا۔ چونکہ زیادہ تر کام غیر قانونی ہوتے تھے لہٰذا یہ ''مددگار'' جنگلوں، ویرانوں اور ریگستانوں میں روپوش رہتے تھے اور انہیں اپنے اپنے وڈیروں کی پشت پناہی حاصل رہتی تھی۔ جب ان کا جی چاہتا، بستیوں میں نمودار ہو جاتے اور جب جی چاہتا، غائب ہو جاتے۔ اول تو پولیس میں ان کا ریکارڈ نہیں تھا، کسی طرح گرفت میں آ جاتے تو متعلقہ وڈیرے ایف آئی آر درج ہونے سے پہلے پہلے نکال لیتے۔ پولیس اور انتظامیہ کے بعض افسران زیادہ تر وڈیروں کے زیر اثر ہوتے اس لیے پولیس بھی اپنے علاقے کے وڈیرے کا نام سن کر ڈرتی تھی۔ ایماندار پولیس آفیسرز البتہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور جب ان کی تعیناتی کسی خردماغ اور مغرور وڈیرے کے علاقے میں ہوتی تو وہ نتائج کی پروا کیے بغیر قدم اٹھاتے تھے اور اگر ان کا اپنا بیک گراؤنڈ مضبوط ہوتا تو وقتی طور پر وڈیرا خاموش ہو جاتا ورنہ اپنا اثر و رسوخ کام میں لا کر فی الفور ان کا تبادلہ کروا دیتا— برسوں سے اسی طرح ہو رہا تھا۔ وڈیرا سردار محمد سے پہلے نہال بابا کو وڈیرا مرحوم غلام سرور کی پشت پناہی حاصل تھی۔ غلام سرور، گوٹھ غلام باغ کا وڈیرا تھا بعد میں نہال بابا قاسم علی کے ذریعے وڈیرا سردار محمد کے حلقہ اثر میں آ گیا۔

سردار محمد نے اس سے کئی کام لیے تھے اور معقول دام ادا کیے تھے — اس روز سردار محمد نے نہال بابا کو دعوت میں بلایا تھا اور اسے یہ کام سونپا تھا کہ وہ جلال دین کے انتخابی جلسے کو سبوتاژ کر دے، باقی کام قاسم علی نے الگ سے سمجھایا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے میرا بھی ذکر کیا کہ ایک کڑیل جوان اس کام کیلیے خاص طور پر ہم نے کراچی سے بلوایا تھا لیکن وہ ضرورت سے زیادہ سرکش نکلا اور ساری زنجیریں توڑ کر فرار ہو گیا۔ قاسم علی نے نہال بابا کو میرا پورا حلیہ اور نام بتا کر یہ بھی پوچھا تھا کہ اس حلیے کا آدمی کہیں نظر تو نہیں آیا لیکن حکمداد نے فوری طور پر انکار میں سر ہلا کر نہال بابا کا ہاتھ دبا دیا تھا۔ وہ نہال بابا کا سب سے قریبی اور بااعتماد ساتھی تھا، نہال بابا ہر بات میں اس سے مشورہ لیتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کے اشارے کے بعد وہ میرا نام اپنی زبان پر لاتا۔ قاسم علی نے انہیں میرے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات ضرور بتائی تھیں لیکن خود اسے میرے بارے میں وڈیرا سردار محمد نے غالباً پوری معلومات فراہم نہیں کی تھیں اس لیے اس کی بتائی ہوئی باتیں مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی تھیں، بس صرف غلط نام کا مسئلہ تھا لیکن اس نام کے سلسلے میں نہال بابا نے مجھ سے باز پرس نہیں کی تھی اور نہ اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے برعکس وہ خوش تھا کہ ایک جیدار شخص اس کے گروہ میں شامل ہوا ہے جس میں اتنی ہمت تھی کہ اس نے وڈیرا سردار محمد پر ہاتھ اٹھایا اور سب کو دم بخود چھوڑ کر صحیح سلامت بچ کر نکل آیا۔

''ہو سکتا ہے کہ سردار تمہارا نام اور حلیہ سن کر قاسم علی کو بتا دیتا کہ اس حلیے کا ایک شخص اس کے پاس حال ہی میں آیا ہے لیکن وہ اس لیے خاموش ہو گیا کہ میں نے اس کا ہاتھ دبا دیا تھا اور میں نے اس کا ہاتھ اس لیے دبایا تھا کہ جیدار لوگ کبھی کبھی ملتے ہیں —'' حکمداد نے بعد میں مجھے بتایا۔ ''ہم چور اور ڈاکو ہونے کے باوجود ان وڈیروں اور جاگیرداروں کیلیے نوکروں اور زرخرید غلاموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ ہم سے سلوک بھی ایسا ہی رکھتے ہیں لیکن وہ ہماری مجبوری ہیں''۔ یہ کہہ کر وہ گہرا سانس لینے کیلیے رکا، پھر بولا۔ ''— اور ہم ان کی مجبوری ہیں''۔ یہ کہہ کر اس نے بیزاری کے عالم میں دونوں ہاتھ ہلائے اور کہا۔ ''تمہاری آنکھوں میں سے کبھی کبھی مجھے آگ کی لپٹیں بلند ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ شعلے ہی شعلے — سرخ، نارنجی، نیلے اور پیلے شعلے — ایسی آنکھیں میں نے بہت ہی کم دیکھی ہیں۔ ہمارے پیشے میں ایسی آنکھیں بہت قیمتی سمجھی جاتی ہیں اس لیے تم ایک بہت قیمتی شخص ہو اور تم جانتے ہو کہ ڈاکو سب سے پہلے قیمتی چیز چراتے ہیں''۔

اس کی باتیں دلچسپ مگر معنی خیز تھیں ان کی معنی خیزی رفتہ رفتہ پوری طرح کھل کر مجھ پر واضح ہو گئی — وہ بغور میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا مزید بولا۔

''سردار نہال کی ایک بیوہ سالی ہے، سکھاں! اس بچاری کا خاوند ایک مہم میں مارا گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اس کی شادی ہو جائے کسی ایسے شخص سے جس کے بازوؤں میں دنیا سے ٹکرانے کی ہمت ہو — ایسے تو بہت سے لوگ ہمارے گروہ میں ہیں لیکن ایک شاندار عورت کیلیے شاندار مرد ہونا چاہیے اور تم —'' یہ کہہ کر اس نے ایک لمحے کیلیے توقف کیا پھر بولا۔ ''اور تم ہر لحاظ سے اس معیار پر پورے اترتے ہو — ہمارے گروہ کی عورتوں میں وہ واحد عورت ہے جس کے سر کا سائیں موجود نہیں۔ اگر تم تیار ہو تو سردار نہال بابا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا میں بات کر چکا ہوں —''

''اتنی جلدی بات بھی ہو گئی —؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں''۔

حکمداد کی پیشانی پر اچانک بل پڑ گئے، تلخ لہجے میں بولا۔ ''یہ دیکھنا دکھانا شہروں میں چلتا ہے۔ ان جنگلوں، ویرانوں میں یہ فضول باتیں

نہیں چلتیں۔ فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں جس طرح سیٹ لگا کر ڈرائنگ روموں کے اندر لڑکی دکھانے کی رسم ہوتی ہے وہ ان کو مبارک — ویسے میرا خیال ہے تم اسے دیکھ چکے ہو، ایک سے زیادہ بار تم نے اسے دیکھا ہوگا۔ وہ بہت اچھی ہے، تمہاری طرح دکھی ہے اس لیے تمہارا نباہ اس کے ساتھ بہت اچھا ہوگا—"

قدرت مجھ سے نادانستگی میں سرزد ہونے والی بھاری غلطی کے ازالے کیلئے راستہ ہموار کر رہی تھی۔ سوچنے سمجھنے اور انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی، اس سے زیادہ اچھی بات کا تو ان حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جن سے میں گزر رہا تھا۔ میں نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا اور جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھے حکمداد سائیں! میں بالکل تیار ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنا بھائی بنا کر سردار نہال کو دلی خوشی ہوگی—"

حکمداد نے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں آج یا کل رات اس سے بات کروں گا، سردار میری بات ٹال نہیں سکتا— بستی سے ہم کوئی ملاں پکڑ لائیں گے، وہ نکاح پڑھا دے گا۔ تمہارے پاس جو زیور ہیں وہ تم دلہن کو تحفے میں دینا"۔

یہ کہہ کر وہ میرا کندھا تھپتھپاتا ہوا اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بے چین ہو گیا— زیور تو میں نے خود ہی اصرار کر کے سکھاں کو دے دیا تھا، اب اسے دینے کیلئے دوبارہ زیور کہاں سے لاؤں اور سکھاں سے واپس کیسے مانگتا؟ اسی الجھن میں صبح سے شام تک مبتلا رہا۔ بڑے غار میں کھانا کھا کر جب میں مویشوں کے باڑے میں بنے ہوئے اپنے غار میں پہنچا تو نیچے اترتے ہی خوشبو کے ایک تیز جھونکے نے میرا استقبال کیا— سکھاں میری منتظر تھی۔

"نبی بخش جنگی—!" اس نے دھیرے کہا۔

"آؤ—"

میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا؟— اندھیرے میں اس نے میری خاموشی سے سارا مفہوم بھانپ لیا، قریب آ کر بولی۔

"حیران ہو غوث محمد— ایں؟"

"ہاں—" میں نے اعتراف کیا۔

"حکمداد کی بیوی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے—" اس نے تیزی سے کہا۔ "میرا دل تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم ایک بہادر آدمی ہو۔ وڈیرا سردار محمد کے ساتھ تمہارے جھگڑے والی بات نے مجھے خوش کر دیا— اس روز میں نے جذبات میں آ کر جاتے جاتے تمہیں ایک طعنہ دیا تھا۔ آج میں اس کی معافی مانگنے آئی ہوں— ٹارچ جلاؤ اور میرے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ لو—"

میں نے اندھیرے میں اندازے سے اس کے ہاتھ ٹٹولے، انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"یہ ہاتھ ٹارچ کی روشنی میں نہیں، میرے دل کے اجالے میں بھی نظر آ سکتے ہیں— خدا کیلئے آئندہ کبھی ایسا مت کرنا۔ میں تم سے یوں

بھی بہت شرمندہ ہوں، اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔۔۔''

''کیسا مجرم۔۔۔؟'' اس نے تڑپ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آئندہ کبھی ایسی بات زبان پر نہ لانا۔ یہ شہریوں والے انداز ہیں، ہم جنگلوں اور ویرانوں کے باسی ایسی باریک باتیں سمجھنے کا دماغ نہیں رکھتے۔ تم مجھے پہلے دن ہی اچھے لگے تھے، آج تک اچھے لگتے ہو۔۔۔ حکمداد کی بیوی کی باتیں سن کر سارا دن میں خوشی سے ناچتی رہی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اللہ اتنی جلدی میری سن لے گا اور پتہ نہیں کیسے تڑپ تڑپ کر میں نے سارا دن گزارا۔۔۔ اچھا یہ لو اپنی امانت۔۔۔'' یہ کہہ اس نے اپنے لباس سے پوٹلی نکال کر میرے حوالے کر دی۔ ''ایک ایک زیور گن لو''۔

''یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو۔۔۔؟'' میں نے حیرت سے پوٹلی اسے لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''مرد جب کوئی تحفہ دیتے ہیں تو واپس نہیں لیتے''۔

''واپس تو نہیں دے رہی ہوں۔۔۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔ ''یہ تحفہ تم نے مجھے رات کے اندھیرے میں، تنہائی میں دیا تھا۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ دن کے اجالے میں سب کے سامنے، خدا کی مخلوق کو گواہ بنا کر تم یہ تحفہ مجھے دو۔۔۔ بس اتنی سی بات ہے''۔

گویا حکمداد نے اپنی بیوی سے تمام باتیں کی تھیں اور اس نے من وعن سکھاں کے کان میں انڈیل دی تھیں۔۔۔ پھر بھی میں نے مسلسل انکار کیا، بار بار پوٹلی اسے واپس کی لیکن وہ مسلسل اصرار کرتی رہی۔ آخر جب اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمہیں میری قسم۔۔۔!''

تو جانے کیوں میں بے بس ہو گیا۔ میں نے پوٹلی لے کر واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔۔۔ اس کے تیز سانسوں کی خوشبو مجھے اپنے وجود میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بے ساختہ دونوں بازو پھیلا دیئے لیکن خلاف توقع وہ میری بانہوں کے حلقے میں آنے کی بجائے سمٹ کر دور ہو گئی۔۔۔ بولی۔

''نہیں، اب نہیں۔۔۔ اب میں ان بازوؤں میں اس روز آؤں گی جب یہ ہمیشہ کیلئے میرے ہو جائیں گے''۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے غار کے کٹاؤ دار زینوں کی طرف رینگ گئی۔ لکڑیوں کا جنگلہ اٹھا کر باہر نکلنے سے پہلے اس نے محبت میں بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خدا حافظ، میرے نبی بخش جنگی۔۔۔ میرے غوث محمد۔۔۔ میرے۔۔۔ میرے۔۔۔ میرے!'' پھر کھلکھلا کر ہنسی اور باہر نکل گئی۔

O

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک فرش پر بچھی ہوئی نرم گھاس اور گدے دار بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ میں پُرسکون بھی تھا اور مضطرب بھی، گزرے ہوئے واقعات فلم کے مناظر کی طرح میرے ذہن کے پردے پر چمک رہے تھے۔ کبھی ایک منظر اُبھرتا تو کبھی دوسرا۔۔۔ میرا جلال دین کی حویلی میں اس کے ڈاگ ہاؤس کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانے میں نادیدہ عامر صدیق سے ملنا، پھر اس کی انگوٹھی اور پیغام لے کر کراچی جانا، سیٹھ ادریس کا قیدی مہمان بننا، وہاں سے نکل کر اژدن سانپ کے گروہ میں پھنس جانا، نفیسہ بیگم کے گھر بن بلایا مہمان بن کر جانا، پھر گل بہار کے ساتھ فرار ہونا، شرافت علی کے بنگلے پر مہمان بن کر جانا، پھر گل بہار کا حملہ آوروں کی فائرنگ سے ہلاک ہو جانا، میرا گوٹھ محمد بخش بھیجا جانا، وہاں مجھ پر حملہ ہونا،

پھر وڈیرا سردار محمد سے میری تکرار، فرار اور جنگل میں پناہ اور اب جنگل میں روپوش ڈاکو سردار نہال بابا کا اتنا اعتماد حاصل کر لینا کہ وہ اپنی بیوہ سالی کی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے — ایسا لگتا تھا جیسے یہ داستان کسی اور کی ہے، میری نہیں ہے لیکن یہ داستان حرف بہ حرف میری تھی۔ میں اس کے ہر منظر میں موجود تھا، اس کی ہر سانس میں میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں ایک ایسا پرندہ تھا جسے اپنی مرضی کی پرواز کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کہیں فضائیں محدود تھیں، کہیں ہوائیں مسموم تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری چلائی ہوئی گولی سے — نادانستگی میں ہلاک ہونے والے ڈاکو کی بیوہ ایک دن مجھ سے زندگی کے ایسے موڑ پر ملے گی جہاں اپنے جرم کی تلافی کیلئے میرے پاس اسے ہمیشہ کیلئے اپنا لینے کے سوا اور کوئی حل نہیں ہوگا۔ میں نے اس رات وڈیرا جلال دین کے حکم کی تعمیل میں گولیاں چلائی تھیں۔ میں سکھاں کے شوہر کو جانتا تک نہیں، صرف بھگانا تھا۔ جان سے مارنا تو میرا مقصود ہی نہیں تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری چلائی ہوئی گولیوں میں سے ایک گولی سکھاں کے شوہر کی بدنصیبی پر مہر لگا دے گی اور رات کے اندھیرے میں ایک آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ مجھے تو صرف اتنا اندازہ ہوا تھا کہ ڈاکوؤں میں سے کوئی میری گولی سے زخمی ہوا ہے اور چونکہ اس کی لاش اس کے ساتھی اٹھا کر لے گئے تھے اس لیے میں اس حقیقت سے بھی لاعلم تھا کہ میری ایک گولی نے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا ہے، سکھاں اگر مجھے نہ بتاتی تو زندگی بھر میں اس بھیانک حقیقت سے بے خبر اور لاعلم رہتا۔ اب اس دکھ کا واحد مداوا یہی تھا کہ میں سکھاں کو اپنا لوں۔ ذہن، ضمیر اور دل کا یہی فیصلہ تھا اور جب یہ فیصلہ میں نے حکمداد کے سامنے دہرایا تھا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا — ویسے بھی میں زندگی کے ہنگاموں سے اکتا چکا تھا۔ اب سکون چاہتا تھا، شاید قدرت ان جنگلوں میں مجھے سکون دینے ہی کیلئے لائی تھی اور حالات کے یہ تانے بانے اسی لیے بُنے تھے کہ بالآخر میں ان خاموش جھاڑیوں میں پناہ گزیں ہو کر وڈیروں کی باہمی چپقلش اور شخصی جنگوں سے الگ تھلگ ہو کر اپنی زندگی گزار دوں۔

O

صبح ہی صبح سردار کا بلاوہ آ گیا، سچل اس کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی سردار نہال نے مجھے نہیں بلایا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب اس نے مجھے یاد کیا تھا۔ میں نے مٹی کے بڑے پیالے میں پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارے، چادر سے منہ پونچھا، کلی کی اور سچل کے ساتھ چل پڑا۔ سردار اپنے غار میں چائے کی کیتلی اور بسکٹ سامنے رکھے میرا منتظر تھا۔ حکمدا اس کے قریب بیٹھا تھا۔ ان کے چہرے تروتازہ اور بشاش تھے، یعنی فکر کی کوئی بات نہیں تھی— سردار نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سردار کے اشارے پر حکمدا نے بسکٹوں کی پلیٹ میری طرف بڑھا کر گلاس میں چائے ڈالی۔ باقی افراد باہر نکل گئے تھے۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ ہم تینوں خاموشی سے چائے پیتے اور بسکٹ کھاتے رہے۔ پھر سردار نے الٹے ہاتھ کی پشت سے اپنے ہونٹ پونچھے اور میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''میں لمبی چوڑی بات پسند نہیں کرتا— حکمدا نے رات مجھ سے تمہارے بارے میں بات کی ہے بلکہ بات نہیں کی، سفارش کی ہے۔ حکمدا کی ہر بات میرے لیے حکم ہوتا ہے اس لیے مجھے اس کی بات پر کوئی اعتراض نہیں— تم بتاؤ، تیار ہو—؟''

''جی سائیں—!''

میں نے سر جھکا لیا— ظاہر ہے وہ سکھاں کے سرپرست کی حیثیت سے بات کر رہا تھا اس لیے اس کا ممکنہ احترام مجھ پر فرض تھا— چند لمحوں تک وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''کوئی شکایت نہ ہو مجھے بعد میں—''

''جی سائیں—!'' میں نے بدستور اسی لہجے میں کہا۔ ''آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

''ٹھیک ہے—'' اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''بات پکی ہوگئی لیکن تمہیں ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے پہلے—''

''جی سائیں—!'' میں نے سر اٹھایا۔ ''تیار ہوں—''

''ایک جنگل میں دو شیر خوش نہیں رہ سکتے—'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''ایک علاقے میں ایک جیسی طاقت اور ایک جیسی دولت رکھنے والے دو وڈیرے خوش نہیں رہ سکتے، ایک وڈیرے کو دوسرے کے حق میں ہار ماننی پڑتی ہے تب طاقت کا توازن برابر ہوتا ہے ورنہ جنگ ہوتی ہے—'' میں گہری محویت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ''وڈیرے جلال دین کے اوپر میرا اپنا بھی ایک قرض ہے''۔ سردار نے رک رک کر کہا۔ ''ایک بہت بڑا قرض جسے بہرحال اتارنا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں وہ قرض اتار دوں''۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کیتلی اٹھا کر خود میرے گلاس میں چائے ڈالی اور بولا۔

''اپنا ایک انتخابی جلسہ تو اس نے کامیابی سے کر لیا ہے لیکن دوسرے جلسے کی نوبت نہیں آنی چاہیے—''

''میرے لیے حکم سائیں—؟'' میں نے پوچھا۔

''آج رات میرے آدمی تمہیں گوٹھ صادق علی پہنچائیں گے اور پل کے نیچے تمہاری واپسی کا انتظار کریں گے''۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔ ''تمہیں کیا کرنا ہے، اس کے بارے میں تم خود سوچو اور فیصلہ کرو۔ بس میری طرف سے صرف اتنی سی بات اور ہے کہ اگر تم واپس آ گئے تو

ہمیشہ کیلئے میرے بھائی بن جاؤ گے — سمجھتے ہو نا میری بات —؟"

"جی سائیں —!" میں نے سر جھکا لیا۔

"تو بس، پھر ٹھیک ہے —"

اس نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ حکمداد میرے پیچھے آیا، باہر آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے — میں، سچل اور نبی داد تمہارے ساتھ جائیں گے۔ کلاشنکوف چلا سکتے ہو، نا —؟"

"بالکل —" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"بہت اچھے —" وہ خوش ہو کر بولا۔ "سنا ہے، جلال دین کے کتے بہت خونخوار ہیں اور رات کو حویلی کے اندر کھلے پھرتے ہیں۔ انہیں خاموش کرنے کیلئے گوشت کے زہریلے ٹکڑے تمہارے تھیلے میں ہوں گے — پستول تمہارے پاس ہے، اسے چیک کر لینا۔ کلاشنکوف میں ابھی تمہارے حوالے کرتا ہوں، اسے بھی چیک کر لو —" میں زیرِ لب مسکرایا — ہتھیاروں سے میری آشنائی اژدن سانپ کے گروہ میں ہو چکی تھی، جلال دین کے کتوں سے آشنائی پہلے سے تھی۔ میرے باپ کی موت بھی ابھی تک ایک معمہ تھی، اس معمے کو بھی حل ہونا تھا۔ عامر صدیق کی پہیلی بھی اب تک حل نہیں ہوئی تھی۔ حالات ایک ایسا موقع فراہم کر رہے تھے کہ ہر الجھی ہوئی گتھی حل ہونے کی صورت نکل سکتی تھی — میرے رگ و پے میں لہو جوش کھانے لگا، کنپٹیوں میں رگیں پھڑکنے لگیں — حساب چکانے کا لمحہ آ پہنچا تھا۔

O

شام کو ہم دو اونٹوں پر سوار ہو کر جنگل سے نکلے۔ گوٹھ صادق محمد تک کا راستہ مختلف پیچ دار راستوں سے گزرتے ہوئے کئی گھنٹوں میں طے ہوا۔ ہم ان راستوں سے حتی الامکان بچتے چھپتے گزر رہے تھے جہاں مسافروں کی آمد و رفت کا امکان ہو سکتا تھا۔ نصف شب سے کچھ پہلے ہم گوٹھ صادق محمد کے باغات کی سمت سے گوٹھ میں داخل ہوئے۔ یہ پہلے سے طے پا چکا تھا کہ ہم کسی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کیلئے ایک دوسرے کو اصل ناموں سے نہیں پکاریں گے — دونوں اونٹ ایک باغ کے ویران حصے میں باندھ دیئے گئے یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے اس وقت کسی کا گزر ممکن نہیں تھا۔ ایک فرلانگ آگے جا کر ایک شکستہ پل تھا جس پر سے اب گاڑیاں نہیں گزرتیں تھیں، اس کے نیچے حکمداد اور اس کے دونوں ساتھیوں نے چادریں بچھا کر ڈیرا جما لیا۔ حویلی یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر بالکل شروع میں تھی لیکن اس راستے میں رات گئے تک لوگوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی اور الیکشن کی گہما گہمیوں کی وجہ سے اس رونق میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ جلال دین نے حویلی سے کچھ فاصلے پر اپنا الیکشن آفس بھی بنا لیا تھا لیکن میرے لیے کئی باتیں کارآمد ثابت ہوئیں مثلاً اندھیری رات اور راستوں سے مکمل آشنائی، میں اس راستے کو اچھی طرح جانتا تھا جو جلال دین کی حویلی کے پیچھے سے گزرتا تھا۔ یہ کئی چھوٹے چھوٹے راستے تھے جو مختلف جھاڑیوں، ٹیلوں اور کھنڈرات کے درمیان سے نکلتے تھے۔ حویلی کے عقب میں شکستہ سرونٹ کوارٹر تھے اور ان کے سامنے حویلی کا ٹوٹا ہوا حصہ آمد و رفت کیلئے فصیل میں بنا ہوا تھا جس سے حویلی کے ملازمین اپنے کوارٹروں سے حویلی میں آتے جاتے رہتے تھے، رات گئے بھی یہ حصہ اسی طرح کھلا رہتا تھا اور اس میں کوئی گیٹ یا پھاٹک نہیں تھا لیکن

یہ بہت پہلے کی بات تھی جب میں حویلی کا ملازم تھا۔ اب خدا معلوم وہاں کیا کیا تعمیراتی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، میں تازہ ترین تعمیرات سے لاعلم تھا۔۔۔ میرے لباس کے نیچے ریوالور کی پیٹی تھی کاندھے پر کلاشنکوف اور جسم پر موٹی چادر جس نے مجھے اچھی طرح چھپا لیا تھا۔ میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور واضح طور پر اس تمام واردات کو ڈاکہ زنی کی واردات کا رنگ دینے کیلئے ہم نے سر جوڑ کر حکمت عملی طے کی تھی لیکن بنیادی مقصد جلال دین کو راستے سے ہٹانا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن آسان کام میری طبیعت کو راس نہیں آتے تھے۔ یہ حد درجہ پیچیدہ، مشکل اور دشوار کام تھا، جان ہتھیلی پر رکھ کر اسے سرانجام دینا تھا۔ حکمداد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ خواہ کچھ ہو جائے، میں اس وقت تک حویلی سے باہر نہ آؤں جب تک جلال دین کا کام تمام نہ ہو جائے۔۔۔ سکھاں کا شوہر نادانستگی میں، غیر ارادی طور پر میری گولی سے ہلاک ہوا تھا لیکن یہ قتل ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت میرے سپرد کیا جا رہا تھا۔ مجھے ایک ایسے وڈیرے کو قتل کرنا تھا جو ظلم و جبر کی ایک حقارت انگیز علامت تھا، اس کی زندگی کئی لوگوں کی زندگی کیلئے ایک مسلسل عذاب تھی۔ اس نے میرے فرار کا انتقام میرے بوڑھے بیمار باپ سے لیا تھا اور اسے اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کی موت کو طبعی موت ظاہر کرنے کیلئے اس نے جو ڈرامہ رچایا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت واضح ہوتی چلی گئی تھی۔ ماں اور ماموں نے واضح طور پر اس شک کا اظہار کیا تھا کہ میرے بوڑھے باپ کو جان بوجھ کر ڈرامائی انداز میں ہلاک کیا گیا تھا۔ اس بے گناہ، ضعیف اور مظلوم بوڑھے باپ کا خون مجھ سے انتقام کا مطالبہ کر رہا تھا۔۔۔ میرا وجود مسلح تھا اور چہرے پر صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں، پورا چہرہ سیاہ چادر کے ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ میں بچتا بچاتا، حویلی کے عقبی راستے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ کبھی کتوں نے پیچھا کیا، کبھی کوئی راہ گیر دکھائی دیا۔ اِکا دُکا اونٹ اور ڈاٹسن گاڑیاں بھی نظر آئیں لیکن میں خود کو جھاڑیوں اور ٹیلوں میں چھپا چھپا کر سفر جاری رکھنے میں کامیاب رہا۔ پھر حویلی کی روشنیاں نزدیک آ گئیں تو میں نے ایک شکستہ کھنڈر کی آڑ میں بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لینا شروع کیا۔ حویلی کے دونوں برقی جنریٹر چل رہے تھے اور کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ چھت پر بھی ایک بڑا بلب بانس کے ساتھ بندھا ہوا فصیل کے ساتھ نصب کر دیا گیا تھا، غالباً ایک بندوق بردار بھی چھت پر ٹہل رہا تھا۔ حویلی کے دوسری جانب جو عام راستہ تھا اس پر اِکا دُکا لوگوں کے چلنے پھرنے اور چوکیدار کے نعروں کی آواز بلند ہو رہی تھیں لیکن عقبی حصہ ویران تھا۔ جلال دین کے پاس پہلے جو کتے تھے سبھی میری بو سے مانوس تھے معلوم نہیں کہ اب ان میں کتنا اضافہ اور کتنی کمی ہوئی تھی۔ یہ جاننے کیلئے حویلی میں داخل ہونا ضروری تھا لیکن داخلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ حویلی کا صحن، فصیلیں اور دیواریں سب روشنی میں تھیں اور چھت پر ایک بندوق بردار ٹہل رہا تھا۔۔۔ کچھ دیر میں خاموشی سے اپنی جگہ سن گن لیتا رہا، اندر سے کسی کتے کی غراہٹ یا بھونکنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ وہ ڈاگ ہاؤس میں بند تھے یا دوسرا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ کھلے ہوئے تھے تو حویلی کے بیرونی حصے میں ٹہل رہے تھے، اس طرف موجود نہیں تھے۔ جلال دین کا کمرہ زنان خانے کے مشرقی حصے میں تھا اور ایک بڑے کمرے کے اوپر دوسری منزل پر واقع تھا جہاں آنے جانے کیلئے بیرونی اور عقبی دونوں اطراف سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے آگے لکڑی کی تختیوں والی سبز چوبی پارٹیشن کی دیوار تھی جس پر انگور کی بیلیں اور چنبیلی کی باڑ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک جست لگائی اور حویلی کی عقبی دیوار کے ساتھ آ لگا۔ یہاں سے وہ ٹوٹا ہوا حصہ نظر آ رہا تھا جو کوارٹروں کے مکینوں کو حویلی میں آنے جانے دیتا تھا، اب اس پر سلاخوں والا گیٹ لگا ہوا تھا۔ یہ گیٹ سات فٹ سے اونچا تھا لیکن محض آہنی کنڈی کے ذریعے بند کیا گیا تھا، اس پر تالا

موجود نہیں تھا— بے ساختہ میری نظر اپنے پرانے کوارٹر کی طرف اٹھ گئی۔ اگرچہ حویلی میں برقی جنریٹر موجود تھے مگر کوارٹر کے مکین لالٹین اور چراغ جلاتے تھے۔ اس وقت اس کوارٹر کے در و دیوار پر لالٹین کی پھیکی پھیکی، میلی میلی، زرد زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی اور جانے اب یہاں کون رہتا تھا؟— بیتے دنوں کی یاد آتے ہی میرا دل بھر آیا، آنکھیں نم ہو گئیں اور بے ساختہ جی چاہا کہ لپک کر اس کے بیرونی دروازے سے آنکھ لگا دوں، دیکھوں کہ اندر کے دیوار و در اب کیسے ہیں لیکن یہ ماضی کی یاد میں آنسو بہانے کا نہیں، تیزی سے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا— اچانک میرے قریب سے ایک للکارتی ہوئی آواز گزری۔

''جاگتے رہو— جاگتے رہو''۔

یہ چوکیدار تھا، غالباً حویلی کے پچھواڑے گشت لگانے آیا تھا۔ میں دیوار سے چپک گیا۔ چوکیدار جونہی آگے نکلا، میں بھاگ کر اگلی گیٹ کے پاس پہنچ گیا تاکہ اگر گھوم کر آئے بھی تو دور سے مجھے حویلی کا کوئی ملازم سمجھے۔ سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کنڈی کھولنا نہایت آسان تھا مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ چند لمحوں بعد حویلی کے اندر صحن میں قدموں کی چاپ گونجی اور کوئی بڑبڑاتا ہوا گیٹ کھولنے لگا۔ جیسے ہی وہ گیٹ کھول کر کوارٹروں کی طرف پڑھا اس کی نظر مجھ پر پڑی اور اس سے قبل کہ وہ چیختا یا اونچی آواز میں بولتا، میں نے لپک کر اس کا گلا دبوچ لیا۔

''خبردار، آواز نہ نکلے—'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں اس کے کان کے پاس منہ لے جا کے کہا۔ ''ہم دس ڈاکو ہیں اور سب کے سب مسلح ہیں— نوکروں کو نہیں مالکوں کو لوٹنے آئے ہیں''۔

''ڈ— ڈ— ڈاکو!'' وہ گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سائیں معافی— سائیں معافی—''

''کدھر ہے وڈیرا جلال دین؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا' ساتھ ہی اس کے پیٹ میں ٹھوکا رسید کیا۔

''سائیں، حاکم نیازو کے ڈیرے پر گیا ہوا ہے''۔ وہ کانپ کانپ کر بولا— ''بول گیا تھا کہ میں رات کو آؤں گا، کتے کھول دینا— چابی میں اپنے کوارٹر میں بھول گیا تھا، ابھی یاد آئی تو لینے جا رہا تھا''۔

وہ غالباً نیا ملازم تھا، مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ جان پہچان والا کوئی ملازم ہوتا تو مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''سائیں، ریاض میرا نام ہے—''

''ریاض—!'' میں نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا— ''تیرے ساتھ اور کتنے ملازم ہیں اس وقت حویلی میں—؟''

''سائیں، ہم تین—'' وہ لرزتے ہوئے بولا۔ ''ایک اوپر چھت پر ہے، دوسرا ادرو پی کے برآمدے میں لم لیٹ پڑا ہے اور تیسرا میں ہوں ریاض— باقی ملازم الیکشن آفس میں ہیں—''

''جھوٹ مت بولنا—'' میں نے اس کا بازو مروڑا۔

''نہیں سائیں، جھوٹ نہیں—''

وہ ہاتھ جوڑ کر دہرا ہو گیا۔ میں نے ایک زوردار ہاتھ اس کی کنپٹی پر رسید کیا تو وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے کچی زمین پر گرا۔ اسے چند گھنٹوں کیلئے بے ہوش کرنا ضروری تھا۔۔۔ اب میں اندھیرے میں اونچے نیچے گڑھے پھلانگتا دائیں بائیں دیکھتا تیزی سے حاکم نیاز و کے ڈیرے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔۔۔ حکمداد نے کسی طرح جلال دین کے معمولات کے بارے میں معلوم کر لیا تھا، نصف شب کے بعد وہ اپنی حویلی میں ہوتا تھا لیکن آج اتفاق سے وہ حاکم نیاز و کے ڈیرے پر گیا ہوا تھا۔ یہ ڈیرہ ایک قدیم باغ میں طویل و عریض چبوترے پر بنے ہوئے بارہ دری نما دو بڑے کمروں پر مشتمل تھا۔ باغ میں آم، امرود، کینو، کیلے اور پپیتے کے بے شمار درخت تھے۔ یہ وہی ڈیرا تھا جہاں پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ سیٹھ ادریس کے بیٹے عامر صدیق کو ڈاگ ہاؤس کے نیچے تہہ خانے میں قیدی بنایا گیا ہے۔۔۔ ڈیرے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ قدیم باغ میں سناٹا تھا اور جھینگر بول رہے تھے۔ ڈیرے میں ہونے والی روشنی درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا آہستہ آہستہ ڈیرے کی طرف سرکتا گیا۔ اونچے چبوترے کے قریب آم کے ایک گھنے درخت کے پیچھے رک کر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ چبوترے کے قریب جلال دین کی پجارو کھڑی تھی۔ بارہ دری کے دروازے اندر سے بند تھے اور خلاف توقع چبوترے پر کوئی گن مین نہیں تھا، شاید وہ سب اندر تھے یا پھر انہیں چھٹی دے دی گئی تھی تاہم میں کچھ دیر خاموشی سے پیڑ کی آڑ میں کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے لپک کر چبوترے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور چادر کی بکل سے میں نے کلاشنکوف نکال لی چاروں طرف مسلسل خاموشی طاری تھی۔ اچانک عقبی کمرے سے جلال الدین کی دھاڑ سنائی دی۔ غالباً وہ لوگ عقبی کمرے میں تھے، بیرونی کمرے میں اگرچہ روشنی ہو رہی تھی مگر وہ خالی تھا۔ جلال دین کی دھاڑتی ہوئی آواز اتنی بلند تھی کہ رات کے اندھیرے میں ہر طرف گونج گئی۔ میں ایک کے بعد دوسرے ستون کی آڑ لیتا ہوا عقبی کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ بند تھا اور اندر سے بولنے کی اونچی اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان سب آوازوں پر جلال دین کی آواز حاوی تھی۔

''میں کہتا ہوں، بکواس بند کرو۔۔۔ سیاست اور جنگ میں کوئی رشتہ داری نہیں چلتی۔ وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے؟''

''دھیرج سائیں، دھیرج۔۔۔'' حاکم نیاز ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سیاست اور جنگ میں ہر بات چل جاتی ہے۔ اگر وہ گونٹھ صادق محمد کا چکر لگانے آ سکتا ہے تو آپ بھی گونٹھ محمد بخش جا کر لوگوں سے ووٹ مانگ سکتے ہیں۔۔۔''

''ہرگز نہیں۔۔۔'' جلال دین گرج کر بولا۔ ''قطعاً نہیں، قطعاً نہیں۔۔۔ اگر تم نے اس سے ایسی کوئی بات کی ہے تو منشی نیاز محمد! کان کھول کر سن لو کہ دنیا میں تم سے بھی مضبوط لوگ موجود ہیں، کوئی بھی آدمی تمہاری جگہ لے سکتا ہے''۔

یہ زیادتی ہے سائیں۔۔۔!'' نیاز محمد نے احتجاجاً بلند آواز میں کہا۔ ''میں نے برسوں اس حویلی کا نمک کھایا ہے، آپ کے ہر برے بھلے کا شریک رہا ہوں۔ آپ مجھے بے وفا مت سمجھیں، یہ میری بے عزتی ہے۔۔۔''

جلال دین قدرے دھیما پڑتے ہوئے بولا ''۔۔۔ وہی تو میں پوچھتا ہوں کہ سردار محمد کے پاس بیٹھ کر اس کی روٹی کھانے کی اجازت تمہیں کس نے دی تھی اور تم نے مجھے خود آ کر کیوں نہیں بتایا، یہ خبر مجھے اپنے ذریعے سے کیوں ملی؟''

حاکم نیاز والجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ''سائیں! اتنی دیر سے میں اور کیا سمجھا رہا ہوں آپ کو کہ یہ سیاست ہے — آپ جذباتی آدمی ہیں، جذبات سے سیاست میں کام نہیں چلتا۔ سردار محمد کے اندر جھانکنے کیلئے اسے یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ میں اس کا دوست ہوں اور یہ یقین دلانے کیلئے ظاہری بات ہے کہ دستر خوان پر اس کے ساتھ بیٹھنا ضروری تھا''۔

میں نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگادی، اندر کمرے میں دبیز قالین پر ریشمی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے وڈیرا جلال دین شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے گن مین آلتی پالتی مارے دور بیٹھا تھا، غالباً وہ جلال دین کا نیا ڈرائیور تھا۔ دونوں کے آگے شیشے والی چھوٹی تپائیوں پر گلاس رکھے ہوئے تھے۔ بوتل حاکم نیاز و کی تپائی پر تھی اور غالباً وہی ساقی گری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ ان کے آس پاس کئی رجسٹر اور کاغذات بکھرے پڑے تھے، ظاہر ہوتا تھا کہ وہ الیکشن کے بعض معاملات پر بات چیت کرتے کرتے بحث میں الجھ گئے اور کام ادھورا رہ گیا۔ بحث کے بعد کام دوبارہ شروع ہونے کا امکانات تھے اور اس میں خاصی دیر لگ سکتی تھی — پتہ نہیں کنڈی اندر سے لگی ہوئی تھی یا دروازہ یونہی بند کر دیا گیا تھا، تاہم اب سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں تین چار قدم پیچھے ہٹ کر کاندھے کی ایک بھرپور ٹکر ماری، کمزوری کنڈی ایک ہی جھٹکے میں کھل گئی اور دروازے کے دونوں پٹ ایک دم کھل کر دائیں بائیں کی دیواروں سے زوردار آواز ٹکرائے۔ کمرے میں موجود تینوں افراد اچھل پڑے، گن میں نے فوراً بندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس سے پہلے میں نے اندر داخل ہو کر کلاشنکوف کی نال کا رخ اس کی طرف گھما دیا تھا۔

''خبردار —!'' میں نے لہجہ بدلنے اور آواز تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہم دس آدمی ہیں اور سب کے سب مسلح ہیں —''

جلال دین اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں شدید غصے اور دہشت کے ساتھ ساتھ حیرت کی چمک بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ حاکم نیاز و کی پیٹھ میری طرف تھی، اس نے سر جھکا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی تو میں نے وزنی بوٹ کی ایک ٹھوکر اس کی کمر پر رسید کی۔ وہ الٹ کر جلال دین کی تپائی سے ٹکرایا اور اوندھے منہ قالین پر گر کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کون ہو تم —؟ جلال دین نے غراتے ہوئے پوچھا۔

''ڈاکو —'' میں نے ٹرائیگر پر انگلی کو مضبوطی سے جماتے ہوئے کہا۔

''ڈاکو —''

جلال دین اور حاکم نیاز و کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''پورے دس ڈاکو —'' میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارا ایک ملازم تھا نبی بخش جنگی اس کے باپ کی موت کیسے ہوئی؟ — دو ٹوک جواب چاہیے''۔

جلال دین کی مونچھیں پھڑکنے لگیں، بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنی واسکٹ کی جیب کی طرف بڑھا۔ میں نے ٹرائیگر دبا دیا، بیک وقت کئی گولیاں ایک دھماکے سے اس کی عقبی دیوار پر پڑیں۔ اس سے ایک فٹ نیچے اس کا سر تھا، جلال دین کا ہاتھ واسکٹ میں جاتے جاتے پھسل کر زانو پر

آگرا۔اس نے تیز چبھتی ہوئی نظروں سے زخمی سانپ کی طرح مجھے دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں کے کناروں پر غیض وغضب کی علامت کے طور پر جھاگ نمودار ہوئی۔

''اس سے تیرا کیا تعلق ہے؟''

میں نے الٹے ہاتھ سے اپنے چہرے پر بندھی ہوئی چادر کا ڈھاٹا کھول دیا۔

''یہ تعلق ہے میرا اس کے ساتھ ---''

مارے حیرت کے جلال دین کے آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں، حاکم نیازو کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نبی بخش --- نبی بخش جنگی ---!''

میں نے گرج کر کہا۔''مت لاؤ میرا نام اپنی غلیظ زبان پر، میں تمہیں ڈاگ ہاوس کے کتوں سے بہتر نہیں سمجھتا---''

''دیکھ اوئے---'' جلال دین یکلخت دھاڑا۔''زبان سنبھال کر، ادب تمیز سے بات کر---''

''تمیز تجھے میں سکھانے آیا ہوں---''میں نے دانت پیس کر اپنے لباس کے اندر بایاں ہاتھ ڈالا اور پیٹی میں اڑسا ہوا ریوالور نکال لیا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف تھی، دوسرے میں ریوالور''شروع ہو جا---''میں نے گرج کر کہا۔''میں تین تک گنوں گا، اس کے بعد میں تیری ایک ٹانگ توڑ دوں گا---ایک---''

''دیکھ---دیکھ نبی بخش---!'' جلال دین نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔''کوئی بیوقوفی نہ کرنا۔ میرے آدمی پورے گوٹھ میں پھیلے ہوئے ہیں تم دس تو کیا، سو بھی ہو تو بچ کر نہیں جا سکتے''۔

''دو---''میں نے ریوالور کی نال لہراتے ہوئے کہا۔

''ہوش میں آ، بیوقوف---!'' جلال دین منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے بولا۔

''تین---''میں نے بدستور اسی لہجے میں کہا۔

''دیکھ---دیکھ---میں پھر کہتا ہوں---''

''دھائیں---''

میرے ریوالور کی گولی اس کی دائیں گھٹنے پر پڑی اور وہ تڑپ کر قالین پر ڈھلک گیا، گھٹنے سے پھوٹ نکلنے والے خون نے اس کا لباس رنگین کرنا شروع کر دیا۔ اب اس کے حلق سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ اسی دوران گن مین اچانک اچھل کر اپنی بندوق پر جا پڑا، دوسرے ہی لمحے وہ بندوق سنبھالے کھڑا ہو رہا تھا۔ میں نے اسے فائر کرنے کی مہلت نہیں دی، ریوالور کی گولی اس کے سیدھے ہاتھ کی کلائی پر پڑی، دھماکے سے خون کی چھینٹیں اڑیں اور بندوق ایک طرف جا پڑی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے کلائی تھام کر تڑپنا شروع کر دیا۔ اب میں نے کلاشنکوف کا رخ حاکم نیازو کی

طرف موڑا۔

''میرے باپ کی موت کیسے ہوئی؟'' میں نے کلاشنکوف کی نال لہرائی۔

''مم— میں بتاتا ہوں—'' حاکم نیازو اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ساری بات بتاتا ہوں، اسلحہ مت استعمال کرنا—''

''خبردار، کتے—!'' جلال دین شدید تکلیف سے دہرا ہوتے ہوئے دھاڑا۔ ''ایک لفظ اپنی زبان سے مت نکالنا ورنہ—''

اس سے پہلے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتا میرے ریوالور نے اس کے بائیں گھٹنے کا نشانہ لیا اور میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔

''دھائیں—!''

جلال دین کا بایاں گھٹنا بھی خون سے نہا گیا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ قالین پر تڑپنے اور گالیاں بکنے لگا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ غیض وغضب، کرب اور اذیت کی اس انتہا پر تھا جہاں اس پر پاگل کتے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس نے الٹے پلٹتے کسی طرح اپنی جیب سے پستول نکال لیا، مجھے پہلے ہی سے اس بات کی توقع تھی اور میں اس کیلئے پوری طرح تیار تھا۔ جونہی اس نے پستول کا رخ میری طرف کیا، میں اچھل کر دروازے سے باہر نکل گیا لیکن وہ جنونی ہو چکا تھا، یکے بعد دیگرے ٹرائیگر دباتا گیا اور گولیاں کھلے ہوئے دروازے سے نکلتی گئیں۔ میں دائیں طرف کی دیوار کی اوٹ میں نہ ہوتا تو میرا وجود چھلنی ہو جاتا۔ پستول خالی ہو گیا۔ میں پھر ایک دم کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت جلال دین نے دانت کچکچا کے خالی پستول میرے منہ پر مارا، میں فوراً نیچے نہ جھک جاتا تو جبڑا کھل جاتا— اب نہتا اور زخمی جلال دین ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے گن مین سے چند قدم کے فاصلے پر پڑی ہوئی بندوق اور حاکم نیازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم مجھے کچھ بتا رہے تھے—؟''

''بالکل—'' وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مگر گولی مت چلانا، میری پوری بات سننا—''

''ٹھیک ہے— بولو—'' میں نے ان تینوں کو کلاشنکوف اور ریوالور کی زد پر رکھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ ''بولتے جاؤ، رکنا نہیں— رکو گے تو تین تک بھی نہیں گنوں گا اور گولی چلا دوں گا''۔

''گولی مت چلانا—'' وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''بات وہاں سے شروع کرتا ہوں جب ہمارا وڈیرا جلال دین اور اس کا کزن انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے گئے تھے۔ چونکہ دونوں کے پاس پیسے کے فراوانی تھی اس لیے تعلیم تو پیچھے رہ گئی، دوسری دلچسپیاں سامنے آ گئیں۔ دونوں پہلے تو نائٹ کلبوں میں جاتے رہے پھر مل کر انہوں نے ایک جوا خانے میں شراکت کی بنیاد پر حصہ ڈال دیا—''

''کتے—!'' جلال دین کراہتے ہوئے بولا۔ ''خا— خاموش—''

''سائیں—!'' حاکم نیازو اس کی طرف مڑ کر لجاجت سے بولا۔ ''موت میرے سامنے کھڑی ہے، زندگی مجھے بھی پیاری ہے۔ جو کچھ یہ جاننا چاہتا ہے، وہ اسے بتانے پر مجبور ہوں— مجھے معاف کرنا سائیں—!''

''معافیاں تلافیاں آسمان پر مانگنا۔۔۔'' میں نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''بولتے رہو۔۔۔ اب اگر جلال دین نے مداخلت کی تو میں اس کا قصہ پاک کردوں گا''۔

مگر جلال دین اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ گالیاں بکتا رہا، حاکم نیاز کو دھمکاتا رہا۔ اس کے دونوں گھٹنے ناکارہ نہ ہو جاتے اور وہ غیر مسلح نہ ہو جاتا تو دیوانوں کی طرح اٹھ کر ہم پر ٹوٹ پڑتا۔۔۔ نیاز دنے جو کچھ بتایا اس کا نچوڑ یہ تھا۔

''اس جوا خانے میں رولٹ مشین لگی ہوئی تھی جس کی سرکاری طور ممانعت تھی لیکن انڈر گراؤنڈ بدمعاشوں کی سرپرستی میں یہ دھندا چل رہا تھا۔ پھر اس دھندے میں نوشین کے ذریعے عامر صدیق داخل ہوا۔۔۔ نوشین بظاہر تو ایک ایشیائی ملک کے سرکس کی ڈانسر تھی لیکن در پردہ اس کا کام کچھ اور تھا۔ وہ تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ تھی۔ عامر صدیق سے ایک روز سرکس ہی میں اس کی ملاقات ہوئی تھی پھر اس نے اسے جوا خانے میں شیئر ڈالنے کا مشورہ دیا۔ اس جوا خانے میں مختلف ممالک کے افراد آتے رہتے تھے کیونکہ اس میں ایک نائٹ کلب بھی تھا۔۔۔ پھر عامر صدیق اور جلال دین میں نوشین کے معاملے پر جھگڑا ہو گیا یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ اس نے سردار محمد سے بھی علیحدگی اختیار کر لی اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔ جب اس جوا خانے کو چلانے والے سرپرست غنڈوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو سردار محمد اور عامر صدیق کو بھی اس دھندے سے الگ ہونا پڑا۔ عامر صدیق ڈرگ مافیا کے ہتھے چڑھ گیا، انہوں نے اس کے ذریعے کراچی میں اپنے کارندوں سے کام لینا شروع کیا۔۔۔ سردار محمد بھی تعلیم ادھوری چھوڑ کر وطن واپس چلا آیا۔ جب انٹرپول اور سکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوسوں نے اپنے نیٹ ورک کے ذریعے جرائم پیشہ افراد پر گرفت سخت کی تو عامر صدیق کو بھی انگلینڈ سے بھاگنا پڑا مگر بھاگتے بھاگتے نوشین کو بھی کراچی آنے پر آمادہ کر گیا۔ عامر صدیق تو اپنے باپ سیٹھ ادریس کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح کراچی پہنچ گیا لیکن نوشین کو آنے میں دیر لگی۔ سیٹھ ادریس نے بیٹے کی مدد سے منشیات کا زیرِ زمین کاروبار تو اسٹیبلش کر لیا تھا لیکن نوشین کے ساتھ اس کی شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جب اچانک نوشین کراچی پہنچ گئی تو اسے عامر صدیق نے ایک الگ بنگلے میں ٹھہرایا، اسی دوران ہمیں ان کے بارے میں پتہ چل گیا۔ وڈیرا جلال دین اس سے اپنا پرانا حساب چکانا چاہتا تھا۔ ایک تو نوشین کے معاملے میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا، دوسرے عامر صدیق کے ذمہ اس کی خاصی رقم تھی جو عامر کسی طرح دینے پر تیار نہیں تھا بلکہ اس نے زیرِ زمین دنیا کے بعض بدمعاشوں سے مل کر جلال دین کو اتنا ہراساں کیا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وطن واپس جانے پر مجبور ہو گیا، جب ہمیں عامر صدیق اور نوشین کی کراچی میں موجودگی کا پتہ چلا تو میں جلال دین کی ہدایت پر کراچی والے ڈیرے میں اپنے آدمی کے ساتھ جم کر بیٹھ گیا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ آخر ہمیں موقع مل ہی گیا اور ہم اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے اغوا کر کے گوٹھ صادق علی میں لے آئے۔ یہاں سے ہم نے اس کی رہائی کے عوض سیٹھ ادریس سے بھاری تاوان کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔۔۔''

خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ جلال دین بری طرح نڈھال ہو چکا تھا، اب وہ دونوں پاؤں اپنے سامنے پھیلائے ایک چادر سے خون پونچھتے ہوئے کراہ رہا تھا اور درمیان میں دانت پیس پیس کر مجھے اور حاکم نیاز کو گالیاں دے رہا تھا۔

''جس رات تم ڈاگ ہاؤس کے نیچے تہہ خانے میں عامر صدیق سے ملے اسی رات تھوڑی دیر بعد میں اور وڈیرا جلال دین بھی اس کے

پاس گئے تھے---" حاکم نیازو نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔" باتوں ہی باتوں میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص تہہ خانے میں آیا تھا مگر عامر صدیق نے اس کا نام نہیں بتایا، نام کا پتہ ہمیں دو دن بعد چلا--- چند روز بعد جب پولیس اور انتظامیہ کے بڑے افسروں کے ذریعے حویلی پر چھاپہ مارا گیا تو اس کی اطلاع ملتے ہی ہم نے عامر صدیق کو غائب کر دیا۔ پولیس ناکام ہو کر واپس چلی گئی تو اگلے دن ہم اسے پھر تہہ خانے میں لے آئے۔ جلال دین سخت طیش میں تھا، اس نے پہلے تمہارے باپ کو دھمکیاں دیں پھر عامر صدیق کے ساتھ تہہ خانے میں بند کر کے کتے چھوڑ دیئے۔ خونخوار کتوں نے دونوں کو---"

"بس خاموش ہو جاؤ---"

میں نے اچانک گرج کر کہا۔ دوسرے ہی لمحے ریوالور جیب میں ڈال کر کلاشنکوف کو نال کی طرف سے پکڑ کر میں جلال دین کی طرف لپکا۔ کلاشنکوف کے دستے کے پے در پے وار سے میں نے اس کا سر کھول دیا، بازو توڑ دیئے اور آنِ واحد میں میں نے اسے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے گوشت کے ایک بڑے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ میں اسے کلاشنکوف کا ایک برسٹ مار کر چیتھڑوں میں تبدیل کر سکتا تھا لیکن میں نے مزید گولیاں اس پر ضائع نہیں کیں---باپ کی موت کا انتقام شعلوں کی طرح میرے رگ و پے میں سنسنا رہا تھا، میں آندھی طوفان کی طرف اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اب وہ خون آلود وجود کے ساتھ اکھڑے اکھڑے آخری سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس پر تھوکتے ہوئے، پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان رک رک کر کہا۔

"اگر تُو زندہ رہا تو ہمیشہ یاد رکھے گا کہ خانہ زاد غلاموں کی بھی ایک عزت ہوتی ہے۔ انہیں بھی جینے کا حق حاصل ہے۔ خدا کی اس بڑی زمین پر صرف شہ زور اور شورہ پشت لوگوں ہی کو حکمرانی کا حق حاصل نہیں بلکہ غریب، نادار اور بے نوا بھی اپنے خالق سے جینے کا حق مانگتے ہیں۔ اگر تجھ جیسے فرعون انہیں یہ حق نہیں دیتے تو پھر اس ظلم کے نتیجے میں نبی بخش جنگی پیدا ہوتا ہے---" پھر میں حاکم نیازو کی طرف مڑا۔ اپنے کندھے سے لٹکنے والے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر میں نے زہر آلود گوشت کا ایک ٹکڑا نکال کر اس کے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔" ظلم اپنی جگہ ایک چھت کی طرح ہے جسے تیرے جیسے ستون سہارا دیتے ہیں۔ جب تک کتوں کی طرح دم ہلا کر اپنے جبڑوں سے وفاداری کی جھاگ چھوڑتے رہو گے، اسی طرح ذلیل و خوار ہو گے۔ تم ڈاگ ہاؤس کے کتوں سے مختلف نہیں ہو---اٹھاؤ یہ گوشت کا ٹکڑا اور میرے سامنے چباؤ، تین تک گنوں گا اس کے بعد تمہاری لاش بھی اس نگر مچھ کے ساتھ پڑی ہو گی---اٹھاؤ---" میں نے کلاشنکوف کی نال اس کی طرف لہرائی۔" ایک---"

"سائیں! میری بات سنو، مجھے مہلت دو--- میں ابھی اسی وقت تمہیں دس لاکھ روپے نقد دوں گا"۔ حاکم نیازو گڑگڑانے لگا۔" مجھے معاف کر دو---"

"دو---" میں نے دانت پیس کر اس کا نشانہ لیا۔

"سائیں، سائیں! بیس لاکھ---ابھی---اسی وقت---" وہ ہاتھ جوڑ کر دیوار کی طرف سرکنے لگا۔

"گوشت کا ٹکڑا اٹھا کر چباؤ---" میں نے چیخ کر کہا۔" تین کی آواز نکلنے سے پہلے---"

اس نے حیران کن انداز میں جھپٹ کر زہریلے گوشت کا پارچہ اٹھایا، منہ کی طرف لے گیا۔ میری طرف دیکھا اور پھر ٹکڑا منہ میں رکھ کر

آنکھیں بند کرلیں۔ دھیرے دھیرے اس کے جبڑے حرکت میں آئے۔ ماتھے پر پہلے ناگواری شکنیں ابھریں، ان شکنوں میں درد اور اذیت کی وجہ سے مزید شکنوں کا اضافہ ہونے لگا۔ پھر اس کا منہ کھل گیا، آہستہ آہستہ آنکھیں کھلیں۔ ایک مرتبہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے میری طرف دیکھنے کی کوشش کی پھر دیدے اوپر چڑھ گئے، آنکھیں سفید ہوگئیں، منہ سے جھاگ بہنے لگی، جسم دھیرے دھیرے ہچکولے کھانے لگا— میں نے کلاشنکوف کاندھے پر لٹکائی، جسم پر چادر کی بکل ماری اور اس کمرہ مرگ سے باہر آگیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جب میں پل کے قریب پہنچا تو رات خاصی بیت چکی تھی اور سچل، حکمد اد اور ان کا تیسرا ساتھی بے چینی سے پل کے نیچے ٹہل رہے تھے۔ میری حالت عجیب وغریب تھی۔ سرخ آنکھیں پھولے ہوئے پپوٹے، خشک ہونٹ اور چہرے پر سنگین خاموشی کا جال!

''کام ہوگیا—؟'' حکمد اد نے لپک کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہوگیا—'' میں نے نڈھال لہجے میں کہا۔

''شاباش—!'' سچل نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔

ہم تیزی سے باغ کی طرف روانہ ہوگئے جہاں اونٹ بندھے ہوئے تھے— ادھر صبح کا پہلا ستارہ گوٹھ صادق کے آسمان پر طلوع ہوا، ادھر ہم آبادی سے دور پیچیدہ راستوں کی جھاڑیوں اور درختوں سے گزرتے ہوئے جنگل کی طرف روانہ ہوگئے۔ میرے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ جسم بری طرح دکھ رہا تھا اس لیے اونٹ کے ہچکولوں میں مجھے نیند آگئی۔ منزل پر پہنچے تو میں غنودگی کے عالم میں تھا۔ اسی طرح لڑکھڑاتا، ڈولتا ڈگمگاتا سردار کے غار تک پہنچا اور وہیں اس کی نشست گاہ کے قریب سوگیا— جانے کب تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا اور غار میں چہل پہل تھی۔ سردار آچکا تھا اور میرے سرہانے بیٹھا محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ حکمد اد اور سچل اس کے قریب دوزانو بیٹھے تھے۔

''سوجاؤ، سوجاؤ—'' سردار نے مجھے اٹھتے دیکھ کر اشارے سے لیٹنے کے لیے کہا۔ ''آرام کرو، کھانے پر بات کریں گے''۔

لیکن میں اٹھ بیٹھا تھا۔ سراب تک چکرا رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔

''ملاں صاحب آچکے ہیں—'' سردار نہال نے آہستہ سے کہا۔ ''نہا دھو کر تازہ دم ہوجاؤ۔ نکاح کی کوئی لمبی چوڑی رسم نہیں ہے— یہ تمہارا نیا جوڑا ہے''۔ اس نے پلاسٹک کی ایک بڑی تھیلی میری طرف بڑھائی۔ اس میں بوسکی کا سوٹ تھا، غالباً یہ کسی بستی کے درزی سے سلوایا گیا تھا۔

سہ پہر کو چند عورتوں اور مردوں کی موجودگی میں بڑے غار میں ہم دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ حکمد اد نے چھوہارے تقسیم کیے، میں نے سب کے سامنے دلہن کو تحفے کے طور پر زیورات کی پوٹلی پیش کی۔ عورتیں دف پر گیت گانے لگیں، پھر نم آنکھوں سے سردار نہال اور اس کی بیوی نے ہمیں رخصت کیا۔ میرے غار کو اچھی طرح سجا سنوار کر اگربتیاں جلا دی گئی تھیں اور پھولوں کی ایک تہہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر جما دی گئی تھی۔ چند عورتوں کے ہمراہ ہم غار تک آئے، جنگلہ اٹھا کر سب سے پہلے میں اترا، پھر اس کی طرف بازو پھیلا کر میں نے اسے گود میں لے لیا عورتوں نے جنگلہ برابر کرتے ہوئے پھول نچھاور کیے اور ہم دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر بستر پہ آبیٹھے— سکھاں عروسی جوڑے میں بہت پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس جنگل میں عورتوں کے پاس میک اپ کا سامان نہیں تھا۔ جو کچھ تھا اسے انہوں نے سکھاں کو مزید پُرکشش بنانے میں صرف کر دیا تھا— سکھاں

نے میرا بازو تھام کر اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا کہنے لگی۔

''جو دکھ تم نے اٹھائے ہیں انہیں بھول جاؤ، جو صدمے میں نے برداشت کیے ہیں انہیں میں بھول جاؤں گی۔ اب ہم نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے''۔

میں نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ تنگ کر دیا۔

O

ابھی رات ہونے میں کچھ دیر باقی تھی کہ حکمداد بھاگتا ہوا آیا، جنگلے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر بولا۔

''نبی بخش جنگی! فوری باہر آ کر میری بات سنو—''

مَیں تیزی سے جنگلہ اٹھا کر کٹاؤ دار زینے طے کرتا ہوا اوپر پہنچا۔ شام کی سیاہی ہر طرف پھیل رہی تھی اور حکمداد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ایک ہیلی کاپٹر یہاں چکر لگا کر گیا ہے— سردار نے کہا ہے کہ فوراً سکھاں کے ساتھ نکلنے کی تیاری کرو۔ ہم دریا پار کر کے جنگلوں کے مشرقی حصے میں چھپ جائیں گے''۔

میں نے فوراً نیچے آ کر سکھاں کو ساتھ لیا۔ ریوالور لوڈ کر کے پیٹی میں اُڑسا، کلاشنکوف چیک کر کے میگزین لگایا اور پھر باہر آ گیا۔ کچھ لوگ مویشیوں کو کھول کر انہیں اپنے ساتھ لے جانے کیلئے ہنکار رہے تھے۔ گدھوں پر ضرورت کا سامان لادا گیا تھا۔ اونٹ جتنے بھی موجود تھے ان پر عورتوں اور بچوں کو سوار کیا جا رہا تھا۔ مرد اپنا اپنا اسلحہ چیک کر رہے تھے۔ سردار نہال مضطرب تھا، وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''چلو، چلو— دریا کی طرف—''

وہ ہاتھ ہلا ہلا کر سب کو دریا کی طرف جانے کا حکم دے رہا تھا جہاں دریا پر چند کشتیاں رسوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ ہم جھاڑیاں درخت اور ٹیلے عبور کرتے ہوئے تیزی سے دریا کی طرف بڑھنے لگے— اچانک آسمان روشن ہو گیا، کئی ہیلی کاپٹروں کے پنکھوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے درخت اور جھاڑیاں ہلنے لگیں۔ ہیلی کاپٹروں سے میگا فون پر کھڑکھڑاہٹ کے شور کے ساتھ اعلان ہو رہا تھا۔

''اس جنگل میں جو لوگ چھپے ہوئے ہیں وہ باہر آ کر خود کو پولیس کے حوالے کر دیں اس جنگل کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے— خبردار! کوئی شخص ہتھیار استعمال نہ کرے تمام ہیلی کاپٹروں میں مشین گنیں فٹ ہیں—''

یہ اعلان تھوڑے تھوڑے وقفے سے بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ سردار نہال میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس کے ہاتھوں میں ایک لانگ رینج رائفل تھی جس پر ہدف کے لیے عدسہ لگا ہوا تھا۔ ایک گڑھا پھلانگ کر وہ بولا۔

''بڑے عرصہ بعد ہیلی کاپٹروں نے ادھر کا رخ کیا ہے مگر ہم گرفتاری نہیں دیں گے۔ وہ جنہیں حراست میں لیتے ہیں، انہیں بڑی اذیتیں دیتے ہیں تاکہ باقی ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں''۔

سردار نہال نے سب سے کہہ دیا تھا کہ چونکہ عورتیں اور بچے ساتھ ہیں اس لیے کوئی شخص فائرنگ میں پہل نہ کرے اور سب جلد از جلد دریا تک پہنچنے کی کوشش کریں۔۔۔ ہیلی کاپٹر مسلسل ہمارے سروں پر اُڑ رہے تھے ان کی تیز روشنیاں درختوں اور جھاڑیوں سے چھن چھن کر زمین کے کھلے حصوں پر پڑ رہی تھیں مگر ہم چونکہ درختوں کی آڑ میں چل رہے تھے لہٰذا ان کی تیز روشنی والی ہیڈ لائٹس کی زد میں آنے سے محفوظ تھے۔۔۔ یکا یک ہمارے عقب میں کسی نے آسمان کی طرف بندوق اٹھا کر فائر کر دیا، جواباً مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ چند چیخیں گونجیں۔

''کون تھا یہ اُلو کا پٹھا۔۔۔؟'' سردار نہال پلٹ کر دھاڑا۔

''دادا کریم سے غلطی ہوگئی سردار۔۔۔!'' کسی نے عقب سے جواب دیا۔ ''وہ رائفل چیک کر رہا تھا۔۔۔''

''رائفل کا بچہ۔۔۔!''

سردار نہال اس کی طرف جھپٹا، دوسرے ہی لمحے اس نے دادا کریم کا گلا دبوچ لیا۔۔۔ ہیلی کاپٹروں کی جانب سے چلائی جانے والی گولیوں کا ہدف ہم نہیں تھے، گولیاں محض اغتاہ کے لیے چلائی گئی تھیں۔ ہیلی کاپٹروں سے بار بار اعلان ہو رہا تھا۔

''ہتھیار پھینک دیں۔۔۔ ہتھیار پھینک دیں اور جنگل کے مغربی حصے کی طرف سے کھلے میدان میں آ کر جمع ہو جائیں۔۔۔''

جنگل کا مغربی حصہ وہی تھا جہاں خاردار جھاڑیاں بالآخر بستیوں کی طرف جانے والے راستوں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جاتی تھیں، وہاں کوئی آڑ نہیں تھی، دور تک چٹیل میدان تھا جہاں کنکر، پتھر ریت اور مٹی کے ڈھیر تھے۔ دریا جنگل کے مشرقی حصے میں تھا جہاں پہنچ کر دریا عبور کرنے کے بعد کسی محفوظ جگہ پہنچنے کی واحد امید تھی۔

''ہتھیار پھینک دیں۔۔۔'' میگا فون پر بدستور اعلان ہو رہا تھا۔ ''ہتھیار پھینک کر مغربی حصے کی طرف کھلے میدان میں جمع ہو جائیں۔۔۔''

میں آہستہ آہستہ جھاڑیاں ہٹاتا ہوا اس اونٹ کی طرف بڑھا جس پر دوسری عورتوں کے ساتھ سکھاں سوار تھی۔ اونٹ تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھولنے لگا، اونٹ کے قریب پہنچ کر میں نے دونوں ہاتھ اس طرف پھیلا دیئے۔

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے چھلانگ مار کر میرے بازوؤں کے حلقے میں آ گئی، میں نے اسے آرام سے زمین پر اتار دیا۔

''سکھاں۔۔۔!'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ایک راستہ مغرب کی طرف جاتا ہے اور دوسرا مشرق کی طرف ایک طرف دریا ہے اور دوسری طرف پولیس ہے۔ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''جہاں تم لے جاؤ۔۔۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چلو گی۔۔۔؟'' میں نے اس کی طرف جھک کر پوچھا۔

''کیوں نہیں چلوں گی۔۔۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جو میرے سر کا سائیں ہے، میرے سر کا تاج ہے اس کی بات نہیں مانوں گی تو پھر کس کی بات مانوں گی؟''

''ٹھیک ہے۔۔۔'' میں نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں خود کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ قافلہ گزرنے دو

ہم پلٹ کر مغربی حصے کی طرف بڑھ جائیں گے اور تم اگر نہ جانا چاہو تو کوئی زبردستی نہیں۔۔'' وہ چند لمحوں تک خاموش کھڑی رہی۔ پھر میرے گلے سے لگ کر بولی۔

''تم سے الگ میری کوئی زندگی نہیں۔ جہاں تم جاؤ گے، مَیں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔۔''

پھر ہم پلٹ کر ایک بڑی سی جھاڑی کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ قافلہ گزرتا رہا۔۔جب آخری آدمی جھاڑیاں ہٹاتا ہوا آگے چلا گیا تو ہم مغربی حصے کی طرف بڑھے۔ سکھاں ان راستوں سے آشنا تھی لہٰذا خاردار جھاڑیوں نے مجھے زخمی نہیں کیا تاہم مغربی حصے کے میدان میں پہنچے تو ہمارے ہاتھوں اور چہروں پر خراشیں تھیں اور لباس کئی جگہ سے ادھڑ گئے تھے۔۔۔رات کی تاریکی میں کھلے آسمان تلے ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے خاموش کھڑے تھے اور آسمان پر منڈلانے والے ہیلی کاپٹروں کو دیکھ رہے تھے۔ یکا یک ایک ہیلی کاپٹر نے اپنا رخ تبدیل کیا اور ہماری طرف بڑھنے لگا۔ اس کی تیز روشنیوں سے سارا میدان جگمگانے لگا۔ اس کے پنکھوں کی ہوائیں ہمیں اپنے چہروں پر محسوس ہونے لگیں، ہمارے لباس پھڑ پھڑانے لگے۔ ہیلی کاپٹر نزدیک آ رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔۔۔ڈاکوؤں کے خلاف پولیس اور رینجرز کے گرینڈ آپریشن میں گرفتار ہونے کے بعد میری رہائی ممکن تھی لیکن ایک مفرور قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہونے کے بعد تختہ دار کے علاوہ میری اور کوئی منزل نہیں تھی۔۔۔ ہیلی کاپٹر لینڈنگ کیلئے ایک جگہ معلق ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ زمین پر اتر آیا۔ میں نے کاندھے سے لٹکی ہوئی کلاشنکوف اور ریوالور کی پیٹی اتار کر اپنے قدموں میں پھینک دی اور ایک گہرا سانس لے کر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔

ختم شد